نقوش

مضامین

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

طلوع

اب کے عام شمارہ پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ نقوش کی رسالیت کو برقرار رکھا جا سکے۔

اردو کے دوسرے رسائل افسانے، نظمیں اور مضامین چھاپتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنے لئے اس مشکل راستہ پسند کیا۔ ایک موضوع پر پرچہ پیش کرنا، جتنا مشکل کام ہے اس کا اظہار اتنا آسان نہیں ہے کہ دو لفظوں میں ادا ہو جائے۔

نقوش کا آئندہ شمارہ تمام افسانوی ادب کا انتخاب ہوگا۔ ابتدا سے اب تک، یہ کام نہ صرف بے حد کٹھن ہے بلکہ حد درجہ ذمہ داری کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اہم کام کو ہم نے روا روی میں نہیں کیا ہے۔ بلکہ مسلسل ایک برس سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اب جا کر اس قابل ہوئے ہیں کہ آئندہ نمبر کی صورت میں اسے پیش کر سکیں۔

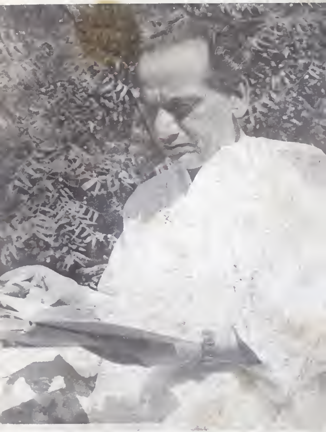
شخصیات نمبر (حصہ دوم) بھی زیر ترتیب ہے۔ ابھی اس کا بہت سا کام باقی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ دوسرے حصہ کے بعد بھی تیسری جلد کی ضرورت سمجھی جائے ——— اہلِ قلم سے درخواست ہے۔ کہ وہ بھی اس کام کی اہمیت کے پیشِ نظر ہماری پوری پوری مدد کریں۔ تاکہ کوئی آپ سب کی موجودگی میں یہ نہ کہہ سکے۔ "اب بھی یہ تذکرہ نامکمل ہے"

بڑے بڑے لکھنے والوں کا انتقال ہوا۔ لیکن چراغ حسن حسرت کے انتقال سے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ایک ادیب کا انتقال ہو گیا ہو۔ لکھنے والے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن حسرت جیسی ہمہ گیر علمیت کے مالک کا روز روز میسر آنا محال ہے۔

حسرت صحافی، مزاح نگار، تاریخ دان اور بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ اور ان اصناف میں ایک طرز خاص کے موجد۔ ان کے انتقال سے بیوی خاوند سے اور بچے باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ لیکن ادب کے جتنے شعبے ان کی ذات سے چل رہے تھے وہ یتیم ہو گئے ہیں۔



فیض







فیض احمد فیض

واسوخت

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ جیسے کبھی آشنا نہ تھے

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی، بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کشتۂ غم اور کیا نہ تھے

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

لب پر ہے تلخیٔ مئے ایام ورنہ فیض
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

کم بیک ایفرقا

آجاؤ، میں نے سُن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہوگئی میرے لہو کی تال،
آجاؤ ایفرقا

آجاؤ، میں نے وھول سے ماتھا اُٹھالیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
آجاؤ ایفرقا

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گُرز
گردن کا طوق توڑ کر ڈھالی ہے میں نے ڈھال
آجاؤ ایفرقا

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
آجاؤ ایفرقا

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفرقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفرقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
آجاؤ ایفرقا

آؤ ببر کی چال
آجاؤ ایفرقا

افریقی حریت پسندوں کا نعرہ COME BACK AFRI

یہ فصل امیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو، بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو،
سب نوچ لو، بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو،

یہ فصل امیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں، شاموں کی
اسکے بھی اکارت جائے گی ؟

کھیتی کے کونوں، کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو،
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو،
پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اُجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق، مرے غمکدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

جگنو اور ستارے

جیلانی بانو

ہجوم شوق سر رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم

"نا جانے کدھر آج مری ناؤ چلی رے" ـــــ خاصی بلند آواز سے گنگناتی وہ سُرخ موّرم کی روش پر دوڑی جا رہی تھی۔ یوں جیسے وہ پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ ہلکی ہو گئی ہو۔ باغ کی خوشبوؤں میں تحلیل ہوتی جا رہی ہو۔

اردی بہشت کا مہینہ آ رہا تھا۔ ہواؤں میں خنکی آ چلی تھی۔ انجیر اور سیتا پھل میں نئی کرنلیں پھوٹ رہی تھیں اور باغ کے سب ہی درخت نیا لباس بدلنے کی فکر میں تھے۔

آج باغ میں پہلے کے ساتھ کام کرنے کی بجائے وہ دیوار پہ چڑھی اپنی پڑوسن اناسویہ کے ساتھ "جھولے لگی" باتیں کرتی رہی۔ یاد ہی نہ رہا کہ آج کالج جانا بھی ہے۔ کلاس فیلو ہونے کے باوجود وہ اناسویہ سے بہت کم ملتی تھی۔ صرف ان کے گھروں کے درمیان ہی یہ دیوار نہیں کھڑی تھی بلکہ ان کے ذہن اور پوزیشن کے درمیان بھی کئی فصیلیں حائل تھیں۔ صرف اس دن وہ دونوں دیوار پہ کھڑی ہو کر باتیں کرتیں جب اشوک کمار کی کوئی نئی فلم دیکھی جاتی۔

ہندوستان میں مساوات قائم کرنے کے لئے فلم ایکٹروں نے کتنا نمایاں کام کیا ہے ـــــ؟

اناسویہ کی ماں پربھنی والے گنتہ وار صاحب کے ہاں نوکر تھی۔ گنتہ وار کی ماں نے کسی جاہل مولوی سے سن لیا تھا کہ عاقبت کا فروں کے ساتھ سلوک کر کے بھی درست کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اناسویہ گنتہ وار صاحب کی کمائی کے برتے پر کالج میں پڑھتی تھی اور ہر مقابلے میں شریف لڑکیوں سے بازی لے جاتی۔ یوں خود گنتہ وار صاحب کونسے خاندانی جاگیر دار تھے ـــــ! مسجد میں پیش امامی کر کے ان کے باپ نے پربھنی میں اتنی خیرات جمع کر لی تھی کہ پہلے تو گنتہ وار نے زمین کھود کر اس دولت سے

چار حرف اپنے پیٹ میں ڈالے پھر چھوٹے موٹے گنبتوں کو بڑھا کے کئی مکان کھڑے کر لئے۔ ان کی سیلو والی بیوی ابھی تک بھربھر پاؤں چاندی کے پوگر پہنتی۔ کانوں میں ٹائپ رائیٹر کے حروف کی طرح سونے کے تنکے جڑے رہتے۔ جس وقت وہ مراٹھی آمیز اُردو میں پھوئی سے لڑتی یا ڈرائیور کو پکارتی ـــــ "اجی او ڈلیور صاحب ـــــ" تو امّی کو ہنسی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔

"اوئی کدھر کے اُجاڑ صورت پیش اماماں آکو بسیں۔ بے فضو لیئیج ان سے دوستی کیسے ماں!"

کھڑے دوپٹے کا پلو سنبھالتے کو وہ رنگی نوگزہ حل کی شاخوں میں سے جھنکتے ہوئے پپا نظر آئے۔ حسب معمول لکڑی کی کھڑاویں پیروں میں ڈالے۔ دھاریوں والا رات کا پائجامہ پہنے۔ سفید تولیہ ان کے کاندھے پر پڑا تھا اور وہ بڑے اطمینان سے دیوان خانے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی دو اور پیر تھے۔ پھٹی چپلوں سے جھانکتے ہوئے سیاہ پیر۔

بالکل کسی بیرا کے پیر جو نوکری کی اُمید میں کسی سفارشی خط کے ساتھ پپا کے پاس آیا ہو گا۔

ہر روز فجر کی نماز کے بعد پپا دو گھنٹے تک باغ کی تراش خراش میں مصروف رہتے تھے۔ اس سے پپا کو روحانی سکون بھی پورا ملتا کہ مالی فائدہ کافی ہوتا۔

کمرے میں پہنچتے ہی اسے بے شمار کام یاد آئے "بھئی ہم تو خوب تفریح کر کے آرہی" اس نے بچوں کی طرح بشاشت سے اپنی قدِ آدم تصویر کو سنایا ڈاگر میں یہ تصویر ہوتا۔ یوں ہی ایک پوز بنائے ہمیشہ کھڑے رہنا پڑتا تو ـــــ چاہے باغ میں کتنے ہی نئے پھول کھلتے۔ کتنے ہی پودے بارش کے بوجھ سے گر کے ٹوٹ جاتے۔ پر میرے چہرے کی مسکراہٹ پر کبھی خزاں نہ آتی) وہ گھبرا گئی ـــ دھوت ـــ اس ہنگیرین آرٹسٹ نے ایسی دائمی مسکراہٹ کیوں بخشی ہے ـــ!

ابھی اسے چھوڑے کر سلیم سے شام کا پروگرام معلوم کرنا تھا۔ ورنہ وہ سخت ناراض ہو جائے گا۔ سلیم کو سوشل ورکر بننے کے بعد ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ چاند کو لئے پھرنے کا خبط تھا۔ چیز نواب کے پاس جا کر چند غزلوں کی دھنیں بنانا تھیں۔ اور سب سے بڑا مرحلہ تو چوٹی باندھنا تھا۔ گھٹنوں سے نیچے لٹکتی ہوئی چوٹی کو اس نے کتنی ہی بار کاٹنے کا ارادہ کیا مگر کبھی وقت پر قینچی ہی نہ ملتی۔

"پاشا جانی ـــــ آپ کو سرکار بلا رہیں" ـــــ قائم علی نے ٹھٹکتے ہوئے آکر اطلاع دی اور حرفوں کی گرد جھاڑنے لگا۔

"کیوں رے قائم کے بچے۔ تیرے کو کیسا بولوں لے۔ میرے کو پاشا جانی نکو بول برے تو ـــــ" جھنجھلا کر اس نے گنگھا پٹک دیا۔

"آج آیا کدھر مرگئی جو تو صفی کرنے کو آیا ـــــ" اسے قائم علی سے ازلی نفرت تھی۔ چیز ماموں ہی کیا کم تھے جو قائم علی کو برداشت کیا جائے۔ سُنتے ہیں نانا حضرت کے زمانے میں قائم علی ڈیوڑھی کی رونق تھا۔ نواب صاحب کو اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے جھینگے اور "چاکنہ" بہت پسند تھا اور اس کے سامنے ڈیوڑھی کی لونڈیاں ان کی نگاہوں سے اُتر گئی تھیں۔

اب اس گھر سے شاہی دور رخصت ہو چکا تھا لیکن پھر بھی ڈیوڑھی سے نکالے ہوئے پرانے نمک خواروں کی لمبی فوج یہاں جمع رہتی۔ امّی کے دماغ میں جو جاگیردارانہ خو تھی وہ اس گھر میں پوری طرح رچی بسی نظر آتی تھی۔

(آج یقیناً وہ پپا کے ساتھ اڈجیسٹمنٹ جا رہی ہے۔)

"قدم بوسی پپا ـــــ" وہ تقریباً جھکی۔

"جیو بیٹا۔ آپ کے ماسٹر صاحب آگئے نا ـــــ" پپا نے سامنے پھیلے ہوئے کاغذوں سے نگاہ ہٹائے بغیر کہا۔ وہ بجلی کی سی تیزی

سے مڑی مگر وہاں بنگالی آرٹسٹ کا پتہ ہی نہ تھا۔ ایک کالا بھجنگ ڈھنگروں کی صورت آدمی وہی سیاہ پاؤں لئے بیٹھا تھا۔ جیسے مدتوں سے پیاسا ہو۔ ایک طویل ریگستانی راستہ طے کر کے یہاں تک آیا ہو۔ دل ڈوب سا گیا (تو وہ اب نہیں آئیگا!)۔

" آداب عرض ــــ" مجبوراً وہ اُس جانب بھی کورنش بجالانے کے انداز میں جھکی۔ جواب میں صرف نگاہوں کے اشارے سے سلام قبول کیا گیا۔

" ایں میں آپ سے کیسا انگلش پڑھونگا پیا ــــ" ؟ اُسے ہنسی آنے لگی۔

ماسٹر بھی مسکرا دیا۔ صرف اس کے مذکر صیغہ استعمال کرنے پر۔ حیدرآباد کی ہر وہ لڑکی جسے اپنے متعلق ذرا سی بھی خوش فہمی ہو، یوں ہی رعب ڈالتی ہے۔

" اجی اُنوں انگلش میں ایم۔ اے کیے سو ہیں۔ کیا سمجھے آپ ــــ" پپّا مسکرائے اور ماسٹر صاحب کی جانب مڑ گئے۔

" ہمارے چاند پاشا نہیں ذرا ہٹو لے ہیں آپ ان کو اٹل میں ڈالنا۔"

" جی اچھا" ماسٹر صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

بہت دیر تک پپا، ماسٹر صاحب پر اپنی خاندانی برتری، کاروبار کی وسعت اور چاند کی غیر معمولی ذہانت کا رعب ڈال کر اندر چلے گئے تو چاند سہمی جا رہی تھی۔ یوں جیسے زندگی میں پہلی بار ماسٹر کو سامنے دیکھ کر سٹی گم ہو جاتی ہے۔

وہ اس کی آپا کتابیں لانے گئی تو حسبِ معمول ڈرائیور سے خوش فعلیوں میں مصروف ہو گئی۔

گہری گہری سانسوں کے درمیان ماسٹر سگریٹ پر سگریٹ سلگانے لگا۔ اس کی نگاہیں کمرے کی آرائش ہی میں گم تھیں۔

بے دلی سے صوفے میں دھنسی چاند اندر کا شور سنتی رہی۔

(ابھی بڑے ماموں حضرت دستار پہنے، معہ خاصدان، پاندان اور قلمدان کے تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ حسبِ معمول وہ چپراسی تھے۔ سرکاری یونیفارم میں ملبوس۔ بگلوس باندھے۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑے ماموں حضرت کو اپنی صوبہ داری کا رعب ڈالنا تھا۔ یہ ان کے ننھیالی خون کی شاہانہ عادت تھی۔ عام طور پر لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ بڑے نواب سوتے وقت بھی دستار نہیں اتارتے ہیں۔

جب کبھی وہ آتے سارا گھر تہہ و بالا ہو جاتا۔ گھر کے سارے نوکر مہذب بن جاتے۔ حتیٰ سر پہ ساری کا پلو ڈالے کسی لونڈی کو مارنا چھوڑ کے استقبال کو دوڑتیں۔ مدراسی مینجر سے روزمرہ کی سیاست پر بحث کرنے والے پپا کو اطلاع ملتی تو ہڑبڑا کے اٹھتے۔ راستے میں جو جو بھی ملتا جھک کر "قدم بوسی" عرض کرتا۔ اشارے سے سلام قبول کرتے۔ بڑے پُر وقار انداز میں قدم رکھتے، ایک شانِ تمکنت کے ساتھ وہ آ کر بیٹھ جاتے۔ چہرے سے وہ جلال برستا کہ صوبہ دار کی بجائے صدر المہام دکھائی دیتے۔ سب سے پہلے گوری ماں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کے وہ پپا سے کہتے۔

" کیوں صادق میاں۔ اب تو گوری ماں کے واسطے بھی اپن سوچنا۔" گوری ماں یہ سن کر دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کے ہنستے ہنستے چاند کی اوٹ میں ہو جاتی۔

" کیوں پاشا، آپ مرغ کی نہاری بنانا سیکھے ــــ" ؟ وہ چاند سے پوچھتے۔

" جی ہاؤ ــــ" خوف اور شرم کے ملے جلے لہجہ میں وہ صاف جھوٹ بول جاتی۔

---

۱ - چھواہا -

برسیں گزریں بڑے ماموں حضرت کو لڑکیوں سے یہ سوال کرتے۔ یوں جیسے اس سارٹیفکیٹ کے بغیر کوئی لڑکی نہ قبول جائیگی۔ اس انٹرویو کے بعد تخلیہ کا حکم ہوتا۔ یعنی "پبلک" نکال دیا جاتا۔

صرف گوری ماں دروازے سے کان لگائے ایک ایک لحہ کی خبر نامہ نگاروں کی طرح عوام تک پہنچایا کرتی۔

"آپا۔ قاسم آپا کی شادی وہ مولوی صاحب سے ہو رہی ہے!"

قاسم آپا کے ساتھ ان دیو ہیکل مولوی صاحب کو دیکھ چاند گھبرا جاتی (یہ لڑکیاں اپنی قسمت بھی کیسی بے تکی لکھوا لاتی ہیں) نہ جانے گوری ماں کی ناک میں بڑے ماموں حضرت کیسے نکیل ڈالیں گے۔!

بند کمرے میں دنیا بھر کے متنازعہ فیہ مسائل نکالے جاتے اور ٹیپ کا بند چاند کے لئے رشتہ ڈھونڈنے پر ختم ہوتا۔

چاند اس خاندان کے لئے ایک بڑا پرابلم تھی۔ اس کے حسن کی مقابل لڑکی خیر حیدرآباد میں تو مل جاتی مگر خاندان میں کوئی نہ تھی۔ اور گھر ہی میں دوسرے لڑکوں کو چھوڑ خود بڑے ماموں حضرت کے سلیم اور نواب جانی موجود تھے۔ مگر بڑے ماموں حضرت کا یہ حال تھا کہ چاند کی ماں سردار کو اپنی بہن کہتے منہ سوکھتا۔ صادق حسین سے بہنوئی کے سارے چونچلے وضعداری سے نبھانے کو تیار۔ مگر ایسے وقت صرف اتنا یاد رہتا کہ سردار ابا حضرت کی اولاد سہی مگر اس کی ماں تو ایک ماما تھی۔

ادھر اکثر خاندانی نوابوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں اور پپا کو ڈاہوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔

پھر بھی بڑے ماموں ہونے کے ناتے وہ اپنی بہنوں کی لڑکیوں کی فکر میں گھل گھل کر یہ بھاری بھرکم جسم بنا پائے تھے، اس وقت بھی ان کی رعب دار آواز گونج رہی تھی۔

"آپ وہاں بے فضول کاہے کو آس رگائیں! ہماری بیٹی میں ایک کمی ہے تو اس کو بَرکاں سے بے عیب ملیں گا ——!

"ہیو ہیو۔ بجا فرمائے آپ!" پپا بے دلی سے تائید کر رہے تھے۔

اس میں ایک کمی ہے۔ اس کمی کا احساس اُسے بار بار دلایا جاتا۔ وہ خاندان کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اپنی تہذیب اور تعلیم کے باوجود کمتر سمجھی جاتی تھی۔ ہزار بار اس نے اپنے متعلق سنا اور ہزار بار سوچا کہ وہ اس کمی کو دور کر دے گی —— وہ سب سے بلند ہے —— وہ کیا کرے —— کیا ——؟

سامنے بیٹھا ہوا ماسٹر سو جانے کے انداز میں ٹیبل کا تھرپڑ فاس کرتے ہوئے مرد اور عورت کو دیکھ رہا تھا۔ خیر یہ تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ چاند کے بنگلے میں آ کر تو بڑے بڑے سیاح بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ گھر کی آرائش کا خبط یوں تو ہر متمول حیدرآبادی کو ہوتا ہے مگر صادق حسین نے تو بڑے بڑے جاگیرداروں سے ٹکر لی تھی۔

"لیجئے۔ یہ میرے کورس کی کتابیں ہیں"! انتظار سے اُکتا کر اس نے کتابیں ماسٹر کی جانب دھکیل دیں۔ ہاتھ سے کتابوں کو دوسری جانب دھکیلتے ہوئے ماسٹر نے نیا سگریٹ سلگایا۔

"ابھی کتابوں کو رہنے دیجئے۔ میں آپ کو کورس سے علیحدہ بھی کچھ پڑھانا چاہتا ہوں۔"

پھر نہ جانے وہ کیا بکواس کرتا رہا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ چاند آج تک جینے کی بجائے جھک مارتی آئی ہے۔ اس نے اس بنگلے سے باہر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ لڑکی نہیں ہے جس کی آج زمانے کو ضرورت ہے۔ اُسے ایک تعلیم یافتہ لڑکی بننے کے لئے ابھی بہت کچھ پڑھنا ہو گا۔" —— خیر۔ تو آپ کا نام کیا ہے" ——!

وہ جھنجلا گئی۔ لیکن ماسٹر بہر حال ماسٹر ہوتا ہے۔ چاہے وہ پیوند لگا گر گرڈین کا پینٹ پہنے ہو۔ اس کی جیب میں ایک آنے

والے چار مینار سگریٹ کی ڈبیہ پڑی ہو۔ اس کی گندی چپلیں کتنی ہی بے دردی سے قالین کا ستیاناس مار دیں۔

" وقارالنساء بیگم ——" اس نے بڑے فخر سے کہا۔

" اور چاند بھی تو —— " ماسٹر کی نگاہیں ابھی کمرے کی زیبائش سے سیر نہ ہو پائی تھیں۔

" وہ تو جب پیار سے پکارتی " ؟

ایک گھنٹے تک وہ یونان، یورپ اور ہندوستان کے ادب کی اہمیت یوں سمجھاتا رہا کہ وہ ادیب خود بھی نہ سمجھ پائے ہوں گے۔ نہ جانے کیسے اس نے ہر چیز کا حاصل چاند کو ٹھہرایا۔ شیکسپیئر، ٹیگور کی اور غالب کے بعد دنیا کی ذمہ داری چاند کے کاندھوں پہ آپڑی ہے۔

شروع میں ماسٹر کی آواز گرجتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور بات کا آخری سرا ایک مبہم سی سرگوشی میں ختم ہو جاتا تھا۔ بات سمجھاتے وقت اس کا چہرا بڑا پر سکون ہوتا۔ آنکھوں کے کونے سمٹ جاتے۔ بڑی بڑی باتیں بھی معمولی سی لگتیں۔ اسکی شخصیت کمرے میں چھانے لگی۔

چند منٹ تک چاند دنیا کے اس بوجھ سے دبی رہی۔ جیسے ذرا بھی ہلی تو اس کے کاندھوں پر سے لڑھکتی ہوئی دنیا کے ریزے ریزے ہو جائیں گے۔ کچھ یقین نہیں آرہا تھا —— لیکن ماسٹر کے چہرے پر سچائی کی تمتماہٹ تھی۔ وہ چاند کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی صحیح قیمت کا اندازہ لگا رہا ہو۔ یا جس چیتے کے انتظار میں اس کا سارا وجود پیاسا تھا وہ اب سامنے آگیا ہے۔

" اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لیجئے گا "

کوئی بات ایسی نہ تھی جو سمجھ میں آئی ہو۔ یہ ادب ودب کی گفتگو تو اس نے بارہا برداشت کی تھی بلکہ بنگالی ماسٹر گریبن نے انگلش پڑھاتے وقت ادب کی ایسی چاٹ لگادی تھی کہ وہ خود بھی رومانی کہانیاں لکھنے لگی تھی جو ماہنامہ "محراب" میں بڑے طمطراق سے شائع ہوا کرتیں۔ کتنی بار وہ تسنیم کے ساتھ کلچرل پروگراموں میں شریک ہوئی۔ لیکن سیاست اس کے بس کا روگ نہ تھی۔

قیمہ جی مفتی ڈالو —— مگر ایم اے کیے سو لوگاں اتنے گندے چپل کیوں پہنتے ہوں گے جو فرش کو بھی گندہ کر دئیں۔ ایسے گندے آدمیوں کا ذکر کچھ خیال سے کرنا۔

اس نے پڑھ کر اٹھتے ہوئے سوچا۔

چنو ماموں سب سے چھوٹے ماموں تھے۔ نفاست اور نزاکت کا پتلا۔ خوبصورتی پر مٹنے والے۔ اگر سامنے سے کوئی بدصورت آدمی گذر جاتا تو طبیعت مکدر ہو جاتی۔ قائم علی کی جنس سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ناچ گانے کے دیوانے۔ بڑے بڑے استادوں سے فن سیکھنے میں عمر اور دولت گنوادی۔ چھ فٹ کے لہرائے ہوئے قد پہ عموماً ساری اور بلاؤز پہنتے۔ بالوں کو گردن تک بڑھا کے سنوارتے۔ کاجل، پاؤڈر، لپ اسٹک سے ہر وقت آراستہ۔ لیکن گھر میں اورنگ آبادی ہمرو کی شیروانی اور شاموکا چست پائجامہ بھی پہن لیتے۔ طبلے سارنگی اور پاندان میں گھرے، ہر وقت مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھے ہیں۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح انھوں نے نہ تو شاہی سازشوں میں حصہ لیا اور نہ بڑے عہدوں کے پیچھے دوڑے۔ اپنی خاندانی آن کو قائم رکھنا بھی تو سب سے اہم فرض تھا۔ اسی لئے سب بہن بھائیوں سے لڑ کر چھوٹی بہن یعنی گودی ماں کی ماں کے ہاں بنجارہ ہل رہتے تھے۔

ذرا سی تکلیف پہ بین کر کے رونا ان کی عادت تھی۔ آواز اتنی باریک کہ چھوٹی لڑکیوں کو بھی مات کریں۔ کھانا کھانے میں بھی ریاض کیا جاتا۔ چاند کے پورے گروپ کے سب سے زیادہ لاڈلے ماموں تھے۔ اور سب کو اپنا شاگرد سمجھتے تھے۔ فلم سے سخت نفرت تھی۔ ہر وقت مدنی نواب کی تھیٹر کمپنی یاد کرتے جس میں ہیروئن کا رول ادا کر چکے تھے۔ لیکن اپنے شاگردوں کا دل رکھنے کو انھیں سینما بھی دکھا لاتے۔ یوں بھی چنو ماموں سے دس پندرہ روپے، ساڑیاں اور دوسری چیزیں ہر وقت اینٹھی جا سکتی تھیں۔ جمعہ کے دن سب مل کر قوالی گاتے۔

"دیوار تلے کھڑکر صنم ہم تو گائیں گے ——— ہاں دیوار تلے کھڑکر ———"

قوال میں ان کی آواز سب سے باریک ہوتی اسی لئے چاند نے "چھچھوندر قوال" کا خطاب دیا جو متفقہ آرا سے فوراً منظور ہو گیا۔ موزوں خطاب بانٹنے میں چاند کا ثانی کوئی نہ تھا۔

کتابیں رکھ کر وہ اندر آئی تو پوری برادری اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گوری ماں اور اس کی چھوٹی بہن فرخ۔ سلیم کا چھوٹا بھائی نواب جانی اور قاسم آپا۔ اس کے علاوہ نواب جانی ایک نیا جانور بھی پکڑ لایا تھا۔

"آپ ہیں حیات علی خاں صاحب۔ آپ کے برادرِ عزیز" اس نے باقاعدہ تعارف کرایا۔ اور سب نے آنکھیں پھاڑ کے اُسے دیکھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی نواب بھائی، میں تو ٹوٹتا تارا ہوں" وہ گھبرا کے یوں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جیسے اُڑنے کو پر تول رہا ہو۔ سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا ——— آدمی شاعرِ کھدرا ہے۔

وہ ٹوٹتا تارا ہی تھا۔ اس کی ماں بڑے ماموں حضرت کی ڈیوڑھی میں چھچھوکری تھی۔ ایک دن حیات کے پیدا ہونے کی خبر ڈیوڑھی میں عام ہوئی تو بڑے ماموں حضرت نے اپنے ابا کے ڈر سے اُسے نکال دیا۔ مالے بدحواسی کے پندرہ روپے مہینے کا اقرار بھی کر بیٹھے تھے۔ یہ سب سُنی سُنائی تھی۔ یوں آنکھوں دیکھی بھی نہ بھولے تھے۔

جب ہر روز صبح ہی ایک کار میں سب سامان کی طرح لد کر مع آیاؤں کے اسکول جایا کرتے تھے تو باہر سڑک پہ ایک لڑکے کو کھڑا دیکھتے۔ ایک سیاہ، فام بدصورت لڑکا۔ اس کی شیروانی کا کالر اور کہنیاں پھٹی ہوتیں۔ کرمچ کے میلے جوتوں میں سے انگلیاں باہر جھانکتیں اور وہ گرمیوں کی دھوپ میں نہانے کے باوجود بڑے صبر سے سڑک کے کنارے بیٹھا گیٹ کے اندر گھورے جاتا۔ ماموں حضرت کا انتظار کئے جاتا۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی اور ماموں حضرت وعدے کے باوجود کئی کئی ماہ اس کی ماں کو خرچ نہیں دیتے تھے۔ جب کار اس کے قریب سے گزرتی تو سب سے پہلے گوری ماں اس کا منہ چڑاتی اور اس کی نقل میں سب ہی اس کا منہ چڑانا فرض سمجھتے تھے۔ مگر وہ لڑکا اپنی آنکھوں میں حیرانیاں جگائے، بڑی حسرت سے چمکتی موٹر میں بیٹھے ہوئے خوبصورت بچوں کو دور تک گھورے جاتا۔

آج اتنے لمبے چوڑے انسان کو سامنے پا کر چاند کا جی چاہا ایک بار پھر اس کا منہ چڑا کے بھاگنے کی ریس ہونا چاہیئے مگر ٹوٹے تارے والی تشبیہ نے روک دیا۔ وہ آج بھی اس شیش محل کے باسیوں کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔

"آج سے حیات میاں ہماری پارٹی میں مل گئیں" نواب جانی نے اعلان کیا جسے سب نے ناک بھوں چڑھا کے سُنا۔

"تیر چل جائیں گا" فرخ نے صبر کیا۔

"جیب جبڑا ہے ———؟" چاند نے گوری ماں کے کان میں مشورہ کیا۔

ہُوَ اللہ ——— "اس نے خوش ہو کر تائید کی۔ نواب جانی نے بھی حیات کا یہ خطاب بہت پسند کیا۔ ان کی اصطلاح میں مربع نما چہرے اور پھیلے ہوئے دہانے والے کے لئے یہ موزوں ترین نام تھا۔ اس طرح انھوں نے اپنی اصطلاح میں بہت سے الفاظ جمع کر لئے تھے جن کی ایجاد کا سہرا ہمیشہ چاند کے سر بندھتا۔

شام کو وہ کالج سے لوٹی تو آپا نے سلیم کا خط دیا۔ اس نے حسرت جنگ کی لڑکی سے کشمیر ہی میں شادی کر لی تھی۔
یہ خط تو موت کی طرح ایک نہ ایک دن آنا ہی تھا۔ مگر ہر موت کتنی کری اور ناقابلِ یقین ہوتی ہے۔ اور ہر بار چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے کا اسٹائل بھی پرانا ہونے کے باوجود کتنا مقبولِ عام ہے۔
لیکن مقدر ہونے کے باوجود اسے نوحہ گر نہ ملا، اور نہانے کے بہانے باتھ روم میں گھس کر وہ خوب روئی۔ اوپر سے شاور باتھ کا پانی اس کے آنسوؤں کے دریا کو ٹب کے سمندر میں ملاتا رہا۔
رازق نے بھی انگلینڈ جانے سے پہلے ایسا ہی خلوص برتا تھا مگر سلیم کی بات ہی اور تھی۔ اس کی شاعرانہ طبیعت بھی بڑی کشش رکھتی تھی۔ وہ رازق کی طرح صرف دولت کا ہی رعب نہ ڈالتا تھا۔ سوشل سروس میں بھی اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے ——— "قوم کے لئے خون کا آخری قطرہ بہانا بھی ہمارا قومی فرض ہے"۔
اور چاند سوچتی تھی سلیم کی بیوی بننا بھی کتنا جان جوکھوں کا کام ہوگا۔ سلیم نے اس پہ ایک نظم بھی لکھی تھی "نقشِ ناتمام"، جب یونیورسٹی کے مشاعرے میں وہ نظم سنائی تھی تو "کلیۂ اناث" اور "نظام کالج" کی لڑکیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سب ایک دوسری کی خبر لینے لگیں اور عشرت آپا نے بگڑ کے کہا تھا۔
"اجی اُنے بھوت فور ٹونٹی ہے۔ ایک بار تو میری رکشا کے سنگات سیکل ملا کو کالج تک آیا تھا"۔
"پھر آپ کی صورت دیکھ لیا ہونگا"۔ یشودا نے سادگی سے پوچھا تھا۔
"تو پھر یہ نظم آپ پہ ہی لکھی گئی ہے"۔ سب نے متفقہ طور پر بڑی فراخ دلی سے آپا کے حق میں دست برداری ظاہر کی۔
یوں بھی آپا اُردو غزل کا وہ پٹا ہوا موضوع تھیں جن پہ میر اور غالب سے لے کر یہ اور یہ اور یہ تک طبع آزمائی کر چکے تھے۔ ہر سائنس کے اور ہر روپ کے ادیب کو دیکھتے ہی ان کا دل بے قابو کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگتا۔ خالی گھنٹوں ہی وہ ادب سے دلچسپی رکھنے والی لڑکیوں کو مشہور ادیبوں، شاعروں کا کچا چٹھا سنایا کرتیں۔
ان سے الگ وہ گیلری میں بیٹھی مسکراتی رہی۔ ان میں سے کسی کے خد و خال گرفت میں نہیں آتے۔ کون ہے جسے تلنے والا مصور رنگ بھرتے بھرتے ذرا سگریٹ سلگانے کو رکا اور وہ انتظار سے بیزار ہو کے یوں ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔
"نقشِ ناتمام" کی تشبیہ کون تھی ——— ! فرداً فرداً اس نے مرغیوں کی طرح لڑتی ہوئی لڑکیوں پہ نگاہ ڈالی اور اپنے گرے ہاتھوں کو گھٹنوں میں دبا کے ہنس پڑی تھی)
اس وقت وہ زمانہ یاد کر کے دل میں گھٹائیں سی اُمڈ رہی تھیں۔ بہت دیر تک وہ آئینہ میں اپنا روتا ہوا روپ دیکھتی رہی۔ آنسوؤں سے حسن نکھر جاتا ہے۔ جبھی تو اُردو شاعر سرمہ گوں آنسو دیکھنے کی خاطر سرِ مقتل آنا پسند کرتے تھے۔
سنگار پٹار سے فارغ ہو کے وہ صوفے پر جا پڑی۔
اپنے آنسوؤں کے دھندلکے میں ایک اور پرچھائیں نظر آئی۔ ایک سیاہ سوکھا مارا ہاتھ جو شدتِ اضطراب میں صوفے

کی پُشت پر سر پٹک رہا تھا اور صوفے کے مخمل پہ کھلے ہوئے گلابوں میں بے شمار شبنم کے قطرے جھلملا رہے تھے ——

پہلے دن حیات کی اس حرکت پر چاند گھبرا گئی تھی۔ چاند کی حیرانی سے شرمندہ ہو کے وہ ڈولتے قدموں سے چلا گیا تو چاند نے پہلے گوری ماں کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی سوتیلی ماں کے تھپڑ سے گال سُرخ کئے، میز پہ جھکی رو رہی تھی۔ پھر اُس نے نواب جانی کو دیکھا جو اس فضا سے متاثر ہو کر اندر آیا اور لاپروائی سے بولا۔

"مجنوں کے چچا ہیں یہ حضرت۔ پُھٹا گھڑا سمجھو۔ ٹھیس لگی تو پانی چھلکنے لگتا ہے"

پھر چاند اور گوری ماں ہمہ تن گوش بنی اس کی کہانی سُننے بیٹھ گئی تھیں۔ پھوٹے گھڑے کی کہانی، جسے کسی نواب کی بیٹی نے اُٹھا کر پٹک دیا تھا، مگر حیات اس سے نہ روٹھا۔ اسے عورت کی بے بسی پر ترس آتا تھا۔ اس دن سے وہ کسی عورت کی آنکھ میں آنسو نہ دیکھ سکا —— مرد بھی اتنے فراخ دل ہوتے —— ؟ چاند کو یقین نہ آیا۔

آج کا دن کیسا اُجاڑ تھا۔ صبح سلیم کی شادی کی خبر آگ کی طرح کالج میں پھیل جائے گی۔ نہ جانے کیسے اس کا ہر رومان کالج میں خوشبو کی طرح پھیل جاتا تھا اور سب اُجاڑ صورتیں ہنس ہنس کر مذاق بنایا کرتیں۔ سب سے بڑھ کر نیشو دا جو لڑکیوں کے اس کاروبارِ عشق پر دل کھول کر ہنسا کرتی۔ حالانکہ خود نہ جانے کن غنڈوں کے ساتھ گاؤں گاؤں کی خاک چھانتی۔ کالج میں یہ خبر عام تھی کہ خدام کے نام سے جو لڑکیاں ایک کمیٹی بنائے ہوئے ہیں وہ دراصل کمیونسٹوں کی جماعت ہے اور اس کی اصل کرتا دھرتا نیشو دا ہے۔ آج تک اس نے نیشو دا سے بات نہیں کی تھی۔ چاند کا پورا گروپ ان لڑکیوں سے بھی بات نہ کرتا جو نیشو دا جیسی لڑکیوں سے ملتی جلتی تھیں۔ ان دھیر چماروں کو کچھ تو اپنی اوقات کا احساس ہونا چاہیئے۔

گھر آتے ہی چاند کو اپنی اوقات کا بھی احساس ہوتا۔ جب امّی سلیم کے لئے بڑے ماموں حضرت پہ ہر طرح ڈورے ڈال کے تھک جاتیں۔ ادھر پپا امّی کی کچھ چلنے ہی نہ دیتے۔

یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ صادق میاں اپنے سُسرالی جاگیرداروں سے سخت متنفر تھے۔ خصوصاً جب سے ان کی مالی پوزیشن بلند ہوئی تھی وہ کھلے بندوں جاگیرداروں پر لعن طعن کرتے رہتے تھے۔ ہزار بار انھوں نے سُنایا کہ جاگیرداروں کو بیٹی دینے سے بہتر ہے کہ لڑکی کو باوڑی میں پھینک دیتا۔ زیادہ اصرار پہ وہ سلیم کے ہاں کی لونڈیاں چھوکریاں گنانے لگتے۔

یہ تو صرف جاگیرداروں سے جلن تھی ورنہ چاند کا بچپن ابھی کونسا دُور چلا گیا تھا۔

جب وہ ہمرو کا پائجامہ پہنتی تھی۔ کلی دار کُرتے پر مشجّر کی واسکٹ اور کارچوبی ٹوپی اوڑھ کر ہر جگہ پپا کے ساتھ جاتی تھی۔ ہوٹل کے سلسلے میں پپا شولاپور، بمبئی اور پونے جاتے تب بھی وہ پیچھا نہ چھوڑتی۔ پپا خود بھی اسے ذرا دیر کو جُدا کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ البتہ باہر جا کر وہ چاند سے زیادہ اس کی آیا پہ مہربان ہو جاتے۔

اسے پپا کا وہ مثالی حسن بھی یاد تھا جو عورتوں کو چھوڑ بڑے بڑے نوابوں کو رجھا دیتا تھا۔ کیا معلوم وہ کہانی سچ ہی ہو کہ پہلے پپا نانا حضرت کو رپنا۔ آئے تھے اور ان کی کسی بات سے خوش ہو کر نانا حضرت نے انہیں سب سے زیادہ منظورِ نظر لونڈی کی سب سے خوبصورت لڑکی سردار سے ان کی شادی کر دی۔ بالکل خاندانی لڑکیوں والی دھوم دھام کی شادی۔ چاند کو راشد علی بیگ کی بیوی بھی یاد تھی، جس نے ہزاروں روپیہ لگا کے "عثمانیہ" کو پڑھایا اور وہ کرنل حمید کی لڑکی، جس کے پیچھے کرنل کی بے شمار دولت تھی

وہ ہر جگہ پپا کے ساتھ ہوتی۔ اُن مغلئی دعوتوں میں، جہاں فرش پر دستر خوان بچھتا۔ مدرسے کے دسترخوان پہ کچی بریانی

اور گھبارے جنگین کی قابیں دکھ کر کھلایا جاتا اور اُن دعوتوں میں بھی جہاں چھری کانٹے میں مچھلی کی طرح پھنسنا پڑتا —— پیا گزرے دن بھول کر چاہے کچھ کہتے رہتے مگر سلیم خود ہی بہشت نواز جنگ کے اصل خاندان پر پھیل گیا۔ محبت کے سارے مشہور ایسے کمرے میں تیرتے پھر رہے تھے اور پھر بھی کمرہ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ ہر چیز میں ایک کمی نظر آ رہی تھی —— وہ خود بھی تو ایک واہمہ سی تھی۔ جیسے اس کے اندر حرارت، قوت، حرکت کچھ نہیں رہی۔ اپنی مرضی سے وہ ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی —— اس میں ایک کمی ہے، جو کائنات کی کسی ذی روح میں نہیں۔

" اللہ میاں سلیم کی معزز بیوی کو خوم پرستی سے توبہ نفرت ہوتا۔ اس کو سال میں دو بچے ہونے دو۔ یہ غم میں گھل گھل کے سلیم کی شکل بدھوا ایڈوانی کے جیسی ہو جاتا کہتے "!!

گو سنے دینے کے بعد ذرا جی ٹھکانے آیا تو اُسے اپنا ماسٹر یاد آگیا۔

خدا کو جتنی آزمائشوں میں ڈالنا تھا وہ اب ختم ہونے کو تھیں۔ بشیرا کے علاوہ نیا ماسٹر دوسرا شخص تھا جسے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ملٹن اور گورکی کو پڑھنا چھوڑ انھیں اپنا نام بھی لکھنا آتا ہوگا!

آج تک اتنا خشک مزاج اور بدہیئت ماسٹر اسے نہیں ملا تھا۔ بھلا ایسے وقت کون انسان پڑھ سکتا ہے جب سامنے ایک ازلی پیاسا انسان بیٹھا ہو۔ گندے پیروں سے فرش فاؤنٹ کر رہا ہو۔ سگریٹ کی راکھ نئے کارڈ را کے ٹیبل کلاتھ پہ گرائے جائے (راتنے میں جیب جبڑے کا بھائی دکھتا)۔

(سلیم تو اب بیوی کو لے کر بیدہ چلا جائیگا) گیارہ تو بج رہے ہوں گے —— ابھی نورات کے سناٹے کی گنگناہٹ ابھر رہی ہے۔ "عثمانیہ" کا شور کم ہو رہا ہے۔ صرف دو چار پیئے ہوئے ادیب ابھی تک بیٹھے ان نقادوں کو گالیاں دے رہے ہیں جنھوں نے ان کی گراں قدر تخلیقات کی قدر نہ کی۔ بین الاقوامی حالات پر بحث کرنے والے نائٹ ایڈیٹروں اور روزناموں میں کام کرنے والے کاتبوں کا شور جاگ پڑا ہے۔ زمرد محل کے تماشائی، اقبال اور مخدوم کے اشعار گنگنانے والے نظامیہ ہوٹل کے ادیب، سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ یہ عابد روڈ بھی کتنی عجیب ہے۔ جب دنیا سوتی ہے تو یہ بیدار ہو جاتی ہے ——

رضائی اوڑھ کے وہ بھٹکی ہوئی چڑیا کی طرح فضا میں کچھ ڈھونڈنے لگی ——
دور کہیں سہگل گا رہا ہے —— تم ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو —— کاش تم میرے لئے ہوتے۔
کاش تم میرے لئے ہوتے —— کاش —— میرے لئے —— ؟

حیات کی داستان سن کر گوری ماں کو اس پہ بڑا ترس آیا۔ سب ہی کو اس سے ہمدردی ہو گئی۔ قمر اور نواب جانی نے اسے بھی شطرنج کا پلیئر بنا لیا۔ پھر ایک دن شطرنج کھیلتے میں گوری ماں حسبِ عادت بھڑک اٹھی اور ذرا سی بے ایمانی کرنے پہ حیات کی کلائی میں دانت گڑو دیئے۔ گوری ماں کی اس بدتمیزی پہ سب شرمندہ ہو گئے۔ حیات اپنی کلائی سے ٹپکتا ہوا خون دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

" گوری ماں کو دیکھا تو میرے کو شہزادو یاد آتی —" یہ سن کر سب کو اتنے زور کی ہنسی آئی کہ چائے کی پیالیاں ہاتھوں سے چھوٹ گئیں —— "اِیّو، گوری ماں کی قسمت —— باپ بچاری ——"

کچھ دیر گوری ماں کھسیانی سی بنی جھینپتی رہی پھر اس کا سفید چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اپنے بکھرے بالوں کی لٹیں پیچھے جھٹک کر اس نے اعلان کیا کہ وہ اس جیب جبرے سے انتقام ضرور لے گی۔

گوری ماں کو بار بار روٹھنے منانے کی پرانی عادت تھی۔ چاند کی ہم عمر سہی مگر اسے ابھی تک گڑیاں کھیلنے سے فرصت نہ ملی تھی۔ بڑی پابندی سے اپنی سوتیلی ماؤں کی مار کھاتی، درختوں پہ چڑھ کے املیاں توڑتی اور اپنے جھنڈولے بالوں کو پیچھے جھٹک کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے ہنسے جاتی۔ اپنی چھوٹی بہن فرخ کی طرح اسے نئی نئی وضع کے کپڑے پہننے اور طرح طرح کے فیشن کرنے کا بالکل شوق نہ تھا۔ چاند کی طرح ذرا ذرا سی بات کو شدت سے محسوس کرنا اور اپنے آپ کو ہر وقت لیئے دیئے رکھنا بھی اسے کبھی نہ آیا۔ جب وہ تینوں ایک جگہ بیٹھی ہوں تو دیکھنے والا صرف چاند میں کھو جاتا۔ اس کے نازک نازک خدوخال ننھے منے سے نکلے تھے جن میں کوئی آرٹسٹ ترمیم نہیں کر سکتا تھا لیکن بھرپور نگاہ ڈالنے سے چاند میں کسی کمی کا شدت سے احساس ہوتا۔ اس کی خوبصورتی بغیر نمک پڑے سالن کی طرح بدمزہ لگتی۔ اس کے برخلاف، گوری ماں کی دائمی مسکراہٹ اس کا سفید رنگ اور ہر بات سے بے فکری خاصی پرکشش تھی۔ صرف فرخ بچاری رہ جاتی۔

جسے اپنی بڑی بہن کی معصومیت ملی تھی نہ رنگ۔ البتہ اس کے سانولے چہرے پہ خاندانی عظمت کی چھاپ تھی اور اسے گوری ماں کی طرح اچھے بھلے کپڑے پھاڑنے کا، پھول توڑنے کا اور لوگوں کو خواہ مخواہ ستانے کا خبط بالکل نہ تھا۔

اس دن بھی گوری ماں اور چاند، حیات کی ٹریجڈی سن کر بہت اداس ہو گئے تھے۔ دوسرے کمرے میں نواب جانی، فرکو سنا رہا تھا۔ "ایک بار کیا ہوا کہتے، جگنو آں ستاروں کو بولے۔ میں تمہارا تھوڑے دنوں میں تمہاری روشنی ختم ہو جانی۔ ستارے کوئی جواب نہیں دیے اور مسکراتے رہے"

ادھر گوری ماں سب کو ترسانے کے لئے جو کچھ املیاں کھڑے دوپٹے میں چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ اس نے کھڑکی سے باہر پھینک دیں اور ہاتھ پونچھ کر بولی۔

"پروا نہ کرو حیات بھئی۔ مرد اپنی محبت کو زیادہ دنوں یاد نہیں رکھتے کہتے"

حیات نے پلٹ کر گوری ماں کو بھیگی آنکھوں سے دیکھا اور چلا گیا۔ وہ ہمیشہ یوں ہی چلا جاتا تھا۔ بغیر اجازت لئے اور اس کے جانے کے بعد احساس ہوتا کہ وہ روشنی اچانک بجھ گئی ہے جو کسی چور گوشے سے نکل کر کمرے کو منور کر رہی تھی۔

"دھوت، یہ آدمی جیب ہیرو بننے کی کوشش کرتا" فرچڑ گئی۔

مگر شام کو وہ پھر آیا تو سب کی سازش کے مطابق گوری ماں استقبال کو لپکی۔

"اللہ، آپ اتنی دیر سے کیوں آئے حیات بھئی۔ میں آپ کو جب سے یاد کر رہیوں نا"

سب "پبلک اوپینین" کھیل رہے تھے۔ سب نے حیات کو چور بنایا اور چاند نے اسٹول پر کھڑے ہو کر اس کے متعلق کھیلنے والوں کی چار رائیں سنائیں۔

"جیب جبرا ——— دل نزع کی حالت میں خود بچنہ دچالاک ——— ٹوٹا ہوا تارا ——— معنت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے ———"

آخری رائے پر اس نے یوں چھت کی طرف دیکھا جیسے خدا سے انصاف کا طالب ہو۔ پھر گوری ماں کی طرف دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا "معنت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے ——— "

ایک منٹ کے لئے سب کی سانس رُک گئی۔ گوری ماں تک اس کا چہرہ دیکھ کر شرمندہ سی ہو گئی۔ ممکن تھا وہ چکرا کے گر پڑتا مگر نواب جانی نے بڑھ کر معاملہ سنبھال لیا۔ جب گوری ماں چوربن کر کمرے سے باہر چلی گئی تو شیروانی کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر باہر جاتے ہوئے اس نے کہا ——— "میری رائے بھی نوٹ کر لیجئے چاند پاشا!"

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی"

اس کے بعد وہ دنوں نہ آیا۔

زندگی یوں بھی بہت مصروف تھی۔ اس دن جو ماموں حضرت نے ایک گھنٹے تک بند کمرے میں میٹنگ بلائی تھی تو مذاق نہیں فرمایا تھا۔ سُنا ہے تعمیرات کے کسی انجنیئر صاحب نے باغ میں گوری ماں کو کسی سے لڑتے دیکھ لیا تھا (لڑتے وقت وہ ہمیشہ پیاری سی لگتیں) انھوں نے بنجارہ ہلز پہ اتنا بڑا بنگلہ بنوایا تھا جس میں ایک بیوی پہلے سے موجود تھی اور ابھی تین بیویاں مع اپنے بچوں کے آسانی سے رہ سکتی تھیں۔

یہ خوشخبری سُن کر سب کو ایکا ایکی اپنے کپڑوں کی مار پڑ گئی تھی۔ ایک تو یوں ہی یہ گھر میں لڑکی کی پہلی شادی تھی اور معاملہ بنجارہ ہلز کی لڑکیوں سے ٹکر کا آن پڑے تو ظاہر ہے ہر شخص کو اس مسئلہ پہ سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

گوری ماں ہر ایک سے کہتی پھرتی کہ لوگ اب اُسے گوری ماں کی بجائے اس کے پورے نام رحیم النسا بیگم سے پکاریں۔

"کچھ بھی ہو میں تو اب یہ ماسٹر سے نہیں پڑھوں گی آں ———" ایک صبح چاند ناشتے کی میز پر خوب ٹھنکی۔

"اجی سمجھاؤ نا اپنی لاڈلی بیٹی کو۔" ——— امی فکر مند ہو کے پاپا سے مدد کی طلب گار ہوئیں۔

"وہ باپ بچارا غریب جھوکرا ہے تو ٹکو کتے!"

"ہشو ہوں ——— " پاپا اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر تائید کر رہے تھے۔ ایسے وقت ان کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی اپنی بیٹی کی وہ کسی بات کو رد نہیں کر سکتے تھے لیکن بیوی کی یہ مصلحت اندیشی بھی ٹھیک ہی تھی کہ لڑکیوں کا ماسٹر ہمیشہ غریب ہونا چاہیئے۔ انھیں اپنی بیٹی پہ اعتماد تھا۔ لیکن ابھی پچھلے دنوں انھوں نے اتفاقاً چاند کے ہوم ورک کی کاپی اُٹھائی تو اس میں ماسٹر نے جگہ جگہ ایک خوبصورت لڑکی کے اسکیچ بنا ڈالے تھے۔ مجبوراً اخباروں میں دوسرے ماسٹر کے لئے اشتہار دینا پڑا۔

"میرے کو وہ بنگالی ماسٹر ہونا۔ تبئیں تو حاجی واداکی دکان سے ایک بنارسی ساری ولاؤ!" بچّوں کی طرح وہ مچل رہی تھی۔ پاپا نے بڑے اچنبے سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ تو اس ماسٹر کا بدل ایک بنارسی ساری بھی ہو سکتی ہے ——— شکر ہے ان کی بیٹی اپنے باپ پر گئی۔

"میں جا کو فون کر دیتا ہوں"! پاپا کو نیم رضا مند پا کر وہ کمرے میں بھاگی۔

"آپ کی دولت کو زنگ لگی بول کے تبر ڈالا کیا اخبار میں ——— ۱۹ تی کو بے حد غصہ آیا۔ بیٹی کی فرمائش پر کیسے انجان ہو جاتے ہیں۔ یوں گھر کے حساب میں ایک پیسے کی بھول ہو جائے تو دُنیا تہہ و بالا ہو جائے۔

"آنے تاجر کی بیٹی ہے۔ دمڑی دمڑی جوڑنے والے جاگیردار کی چھوکری نئیں ہے" صادق حسین فخر سے بولے۔ آج انھیں اپنی بیٹی پہ بڑا پیار آ رہا تھا۔

"بس چپ بیٹھئے جی۔ بھوت دیکھے ایسے تاجراں" ——— امّی سوچنے لگیں۔ آج کیا جاگیرداروں پہ بنسنے چی، جب ان کی حالت مقطع داروں کی بھی نہیں رہی۔ وہ دن یاد کرو جب میرے جیسی بالکڑیاں چالیس ہزار کا جہیز لائے۔ ارے جاگیرداراں تو تم جیسوں کو چھوڑ دیے تو سونا ہو گئے نا۔ اگر میں اماں کی بجائے بڑی اماں کے پیٹ سے پیدا ہوتی تو یہ صادق میاں کی خدمت سات بار جنم لے کر بھی ابا حضرت کی اولاد تک کیسا پہنچتی تھی!

"کیا مطلب ہے تمہارا ——— ایک بیٹی کو دیکھ کر بھی دل ٹھنڈا نگر کہ دن ——!" اخبار پھینک کر صادق حسین لڑنے کو تیار ہو بیٹھے۔ اب سروار کے چپ ہونے کی باری تھی۔ چالیس ہزار کا جہیز لائیں تو کیا۔ صادق حسین کی ماں نے بھی تو اپنی خاندانی ہڈی بیچی تھی۔ صرف اس لئے کہ نواب صاحب نے صادق کو اپنا سب سے چہیتا داماد سمجھا۔ بڑے ماموں حضرت نے سگی بہنوں کا سا برتاؤ کیا۔ چنو نواب نے گوری ماں کی ماں اور چاند کی ماں کو آپا ہی کہہ کر پکارا۔ پھر شادی کے چھ سال بعد بھی اولاد ہی نہ ہوئی۔ دنیا بھر کے مندروں پہ چڑھاوے چڑھائے۔ بی کے علم پہ ڈھٹیاں باندھ باندھ کر تھک گئے تب کہیں جا کر چاند پیٹ میں آئی۔ کتنی بار سروار نے سُنا کہ صادق حسین لڑکے کے لئے ایک اور شادی کر رہے ہیں۔ گھبرا کے انھوں نے گھر میں نئی نئی ملاؤں چھوکریوں کا اضافہ کر دیا۔ چاند پیدا ہوئی تو وہ صرف خاص میں منتظم تھے۔ پھر وہ راشد علی بیگ کی بیوی کو پسند آ گئے اور یہاں کی سوسائٹی کی خواتین میں اپنی مانگ بڑھتے دیکھ کر انھوں نے بیوی کا جہیز بیچ ڈالا۔ عابد روڈ کے پچھواڑے ایک شاندار ہوٹل کھول لیا۔ پھر کرنل حمید کی لڑکی ان پر ہیبل "عثمانیہ" کا ساز و سامان بڑھتا گیا۔ اب یہ حیدر آباد کا ایک خاص ہوٹل تھا۔ جہاں بڑے بڑے عہدہ دار آتے۔ بریس کانفرنسیں ہوتیں۔ عابد روڈ سے گزرنے والے کاروں کے مالک "عثمانیہ" میں آئس کریم نہ کھانا بھی یوں ہی سمجھتے جیسے انسان بمبئی جائے اور زندہ ایکٹروں کو نہ دیکھے۔

ہوٹل کی پچھلی عمارت میں وہ خود رہتے تھے اور دوسری جانب پڑی ہوئی جھونپڑیاں ہٹا کے ایک وسیع باغ لگا لیا تھا۔ صادق حسین کے پرانے ملاقاتی جانتے تھے کہ صرفِ خاص کا یہ سابق منتظم چاہے کتنا ہی قسمت کا سہارا لے مگر اسے تقدیر نے تہاں بلے الیانیوں نے بنایا ہے۔ دروغ برگردنِ راوی۔ کہنے والے تو یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ حسرت جنگ کی جاگیر کے چالیس سرکش کسانوں کو صادق حسین نے زندہ چنوا دیا تھا جس کے صلہ میں سرکار چالیس ہزار کا جہیز لائی۔ یوں بڑے بڑے کام اتنی خاموشی سے کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، جس کی وجہ سے بڑے لوگوں میں ہر وقت ان کی مانگ رہتی۔ مگر صورت سے تو وہ بگلے کی طرح معصوم اور خاموش لگتے۔ سرخ و سفید رنگ، گھنگھریالے سیاہ بال، جن پہ اب کہیں کہیں سفید دھاریاں پڑ رہی تھیں اور بڑھاپے کی آمد سے بھاری بھاری سا جسم۔ ان کے چہرے پہ محبوباؤں والی دلربائی ابھی تک جھلکتی تھی جو کسی زمانے میں حسیناؤں کے ہوش اڑا دیتی ہو۔ لیکن آج بھی ان کے ملنے والوں کو قریب بیٹھنے پہ مجبور کرتی تھی ———

خیر عیب ڈھونڈنا دُنیا کا دستور ہے۔ مگر بڑے آدمی بننے کے باوجود ان کی انکساری میں فرق نہ آیا تھا۔ گرے سے گرے داؤں کو انھوں نے کبھی زہر نہ دیا۔ گھر کے سارے نوکر راجو یا میاں کے نام سے یاد کئے جاتے۔ اُن سے ہنس ہنس کر ملکو میں مذاق بھی کر لیا جاتا۔ مگر کام کے وقت کوئی سانس نہ لے سکتا تھا۔ کتنی بار ذرا سی غلطی پہ انھوں نے ہوٹل کے بیروں کو جوتے سے پیٹا۔ ہڑتال کرنے والے ملازموں کو جیلوں میں سڑوا دیا۔ ذرا سی نافرمانی کرنے پہ گھر کی چھوکریوں کو بھی وہ مار دیتے کہ دیکھنے والے توبہ کریں۔ ان سے ہر شخص بنائے رکھنا پسند کرتا۔

یوں کام آپڑے تو پیسہ خرچ کرنا بُرا نہ سمجھتے تھے۔ کوئی اہم مہمان آجائیں تو آئس کریم بھی بھیجئے اور کیک پیسٹری بھی۔ دعوتیں ہوں تو ایسی کہ لوگ بھول نہ سکیں۔ لیکن گھر میں روز آدھ پاؤ ہڈیوں کے چار سالن پکا کرتے۔ بالکل جاگیردارانہ چلن تھا۔ اپنے سابق منتظم کو دیکھ کر آج بھی وہ خبلہ خبلہ کہتے ہوئے کرسی سے اُٹھ جاتے۔ بارسوخ لوگوں کی مجلس میں ہمیشہ "جی فدا و ندا" اور "بہو تحسبیر" کے ساتھ ہاتھ جوڑ کے جواب دیا۔ ہمیشہ خالص خاندانی لوگوں والا اخلاق رہا۔

دیوالی میں بھینسوں کی لڑائی دیکھنے اور مندر پہ چڑھاوا چڑھانے وہ بھی بڑے نواب صاحب کے ساتھ سکندر آباد ضرور جاتے۔ ہر سال گیارھویں شریف کی نیاز بھی دھوم سے ہوتی۔ پھر جمعرات کی رات کو درگاہ یوسفین میں رات بھر جاگ کر قوالی سُنتے اور فاتحہ کے بعد اُلٹے پیروں ہاتھ جوڑے لوٹتے ہوئے تو انھیں ہر حیدر آبادی نے دیکھا ہوگا!

ہر خدا پر اُن کا ایمان تھا۔ خواہ وہ آسمان کی بلندیوں پر ہو یا زمین کے محلوں میں۔ کیا معلوم کس وقت کس کی ضرورت آپڑے۔

صبح آفس روم میں اکثر مدراسی منیجر سے ہندوستانیوں پر بحث ہُوا کرتی۔

"ہندوستانیاں اور بلیاں ایک ذات۔ دونوں بیچ سوچتیں۔ کب گھر والوں کی انکھیاں مُندنا کب ہنڈی لیکو بھاگنا۔"

"بجا ارشاد کیئیں"۔ منیجر حسب ہدایت گردن ہلا کے تائید کرتا۔

"آپ سنیں سرکار۔ پرسوں اپنا "صحیفہ" والا قیر ڈالا گئے۔ ہندوستان میں تو بے جھگڑے ٹنٹے چل رئیں۔ اب ہندوستان الگ بنتا کتے، پاکستان الگ بنتا!"

"میں اُبی عرض کیا نہ حضرت"۔۔۔ صادق حسین فرماتے "یہ ہندوستانی اپنے بیٹے کو بھی دیکھا تو جلتا۔ اپنے بھئے کا جو ہیرو محمد علی بیرسٹر تھیں! اُنے پاکستان بنانا کہتے"۔۔۔ دستخط کی ہوئی فائلوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی پالیٹکس بھی اُن کے قلم کے نیچے سے سرکتی جاتی۔

"اُں ۔۔۔ پھر گاندھی کیا بولا ۔۔۔" منیجر اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر ٹائپ کرنا بند کر دیتا۔

"اُنے کیا بولنا جی۔ سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اپن چُپ چُپ بیٹھکو دیکھنا کیا گت آتی سو ۔۔۔ ارے ۔۔۔ آپ ایسا چُپ چُپ بیٹھے تو کیسا ۔۔۔! ذرا ہمارے اُپہ مہربانی فرماؤ مولانا"۔ اور منیجر کھسیا کے ٹائپ رائٹر پہ جھک جاتا۔

رات کے کھانے کے بعد سب منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ بنجارہ ہلز کا انجنیئر چالیس ہزار سے کم پہ راضی نہ تھا اور اس بات نے سب کی کمر توڑ دی تھی۔

اس یخ بستہ فضا کو پگھلانے کے لئے نواب جانی سب کو "QUO VDIS" کی کہانی سُنا رہا تھا، جسے سب سے پہلے دیکھنے کا اس نے شرف حاصل کیا تھا۔ لیکن کمرے میں کوئی نیرو کے ظلم سُننے کو تیار نہ تھا۔

یہاں اپنے سامنے ہزاروں روم جل رہے تھے۔ ہزاروں خواہشوں کو صلیب پہ چڑھایا جا رہا تھا۔

چاندنے ریڈیو پہ کوئی اچھا پروگرام ڈھونڈنے کے بعد حیدر آباد لگا دیا جہاں سے کوئی میر کی غزل گا رہا تھا۔

یہاں سب آج سے صدیوں قبل کے انسان بیٹھے تھے۔ آج بھی روم کے خدا اپنا حکم منوانے کے لئے کونسا ظلم نہیں کرتے۔ آج بھی زندگی اتنی ہی غیر یقینی تھی۔ آج بھی انسانیت کے خداؤں کو موت کے راگ سے عشق ہے۔ اور انسانوں کو خوفناک درندوں

ملہ ایک گھٹیا سا اخبار

کے سامنے ڈال کر اس تماشے سے لطف اُٹھایا جاتا ہے۔

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

سب نے بڑے تعجب سے دیکھا۔ دروازے میں جیبؔ جبڑا پشیمان سا کھڑا تھا۔ چاندؔ اور نوابؔ جانی استقبال کر چکے۔ اس کے ہاتھ میں پانچ رنگین بیلون تھے، جو اس نے بڑے خلوص سے بڑے چاؤ سے گوری ماں کو پیش کئے اور سب کو اپنی ہنسی روکنا پڑی۔ آج گوری ماں کا موڈ بہت بگڑا ہوا تھا۔ پھر اس غیر رومانی سے تحفے سے تو وہ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ اُس نے بڑے تکلف سے شکریہ ادا کیا اور کھڑکی کے پاس جا کر ایک بیلون ہوا میں چھوڑ دیا۔ جو آہستہ آہستہ اندھیرے میں اُڑنے اُٹھنے لگا۔

جیبؔ جبڑے کے چہرے پہ خوف چھانے لگا۔ جیسے گوریؔ ماں کسی انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال رہی ہو۔ ہاتھ سینے پہ باندھے، سانس روکے، وہ بڑے صبر سے اندھیرے میں غائب ہوتے ہوئے بیلون دیکھتا رہا۔ جب گوری ماں پانچوں بیلون اُڑا کے مڑی تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر جیبؔ جبڑے نے آہستہ سے کہا۔

”یہ پانچ آنے کے تھے۔“

یہ سُن کر نوابؔ جانی کو بڑا افسوس ہُوا۔ کیونکہ حیاتؔ تیس روپے پانے والا لپٹن کمپنی کا ایجنٹ تھا اور پانچ آنے اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ یوں گوری ماں کو اسے شٹ اپ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

”تو دھیڑنی ہے اُجاڑ صورت“ چاندؔ کا جی چاہا خواہ مخواہ گوری ماں کو گالیاں دے۔ پھر تو گوری ماں کو بھی احساس ہُوا کہ اس نے زیادتی کی ہے ”سُنو ایتو میں تمھیں حیاتؔ بھئی جیب میرے کو اُڑانے کے واسطے دیئے؟“

ہاتھ کے اشارے سے حیاتؔ نے چاندؔ کو روک دیا۔

”میں دیکھنا چاہتا تھا چاندؔ پاشا، گوری ماں اِن کا کیا کرتیں۔ میری طبیعت تو بہت دنوں سے خراب ہے۔“

اُف کتنا عجیب آدمی تھا اللہ ——— چاندؔ نے سوچا۔

اسے کبھی غصہ نہیں آتا۔ کبھی ہنستا نہیں۔ اُس نے کبھی سینما نہیں دیکھا۔ کبھی آئس کریم نہیں کھایا۔ پھر بھی اُف زندہ ہے۔ اس کو کسی سے شکایت نہیں ہے۔ بڑے ماموں حضرت سے بھی نہیں۔ جنھوں نے سلیمؔ اور نوابؔ جانی کو یورپ تعلیم کے واسطے بھیجا، اس کو میٹرک تک پڑھانے میں بھی ساتھ نہیں دیے۔ حیاتؔ کو اپنے بہن بھائیوں پہ بھی غصہ نہیں آتا تھا۔ جنھوں نے اُس کا حق غصب کر لیا۔ جو اس کو دن بھر سائیکل پہ گھومتے دیکھ کر بھی کوئی ہمدردی نہیں کرتے تھے۔ اس کو شہزادے سے شکایت تھی نہ گوری ماں سے۔ یہ بھی کتنی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اب اُس نے سڑک پہ بیٹھ کر دھوپ میں سوکھنے کی بجائے اس خوابوں کے محل میں آسکتا ہے۔ صرف نوابؔ جانی کی عنایت ہے۔ اب بڑی ممانی اس کو گالیاں دینا بھی چھوڑ دیے اور بڑے ماموں حضرت اور چھوٹو ماموں اور امتی اور خالاں، کسی کو اس کی جانب سے خطرہ نہیں تھا۔ صرف پپّا اس کو دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالتے ہیں۔

”اجی یہ چھوکروں کو گھر میں نکّو آنے دو۔ ایک نہ ایک دن نقصان اُٹھائیں گے آپ لوگاں۔“

مگر وہ الماری میں رکھے ہوئے گڈے کی طرح بے ضرر اور دلچسپ تھا۔ معصوم تتلی سا لگتا۔ چاہے جتنی دیر مٹھی کے جیل خانے میں بند کر کے تڑپنے کا تماشا دیکھیئے اور جب پھڑک پھڑک کر مرجائے تو ہاتھوں میں لگے ہوئے اس کے پروں کے رنگ دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے! اور گوری ماں کو اپنی مٹھی میں تتلیوں کو قید کرنے کا بڑا شوق تھا۔

پھر دو بیویوں کو جنت نصیب کرنے کے بعد امیر علی خاں جاگیر دار نے صرف پندرہ ہزار میں گوری ماں کو غنیمت سمجھ لیا اور چھوٹی خالماں کے ہاں ایک دم رنگوں، قہقہوں اور شہنائیوں کا ہنگامہ اُبل پڑا۔

مانجھے کا زرد جوڑا پہنے، خوشبو میں بسی گوری ماں، ایک دم ساری دنیا سے آنکھیں بند کر کے مسہری پر جا بیٹھی۔ جو کوئی اس سے مذاق کرنے اندر جاتا تو زرد رنگ کا یہ عکس اس کے چہرے پر بھی پھیل جاتا۔ جبھی تو یہ رنگ حیات کے منہ پر بھی جم کر رہ گیا تھا۔ سنبھال سنبھال کر رکھی ہوئی خشک مسکراہٹ کو وہ بڑی کنجوسی سے استعمال کرتا تھا۔

پھر نیچے قالین پہ بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے چھچہ خوال کے ساتھ ڈھول سنبھال لیا۔

سہیلی میری بھولی بھولا میرا دل وا ہی لیا ماں   نارنگی پہ ہوگئی دیوانی میرا دل واہی لیا ماں۔

یہ گیت سب کو بہت پسند آیا۔ چاند اور قمر نے بالکل میراثنوں کے انداز سے لڑ لڑ کر سلیم، بڑے ماموں حضت اور پیا سے انعام لیا۔ پھر گوری ماں کی برات دروازے پر آ گئی۔ حیات نواب جانی سے کہتا پھر رہا تھا۔

" گوری ماں کے دولہے کا استقبال شاہانِ شان ہونا چاہیئے " اور بھائی ہونے کے ناتے اس نے سب سے پہلے دولہا کو چوکھٹ پر یوں روک لیا جیسے قیامت تک اندر نہیں جانے دیگا۔ جب مذاق برداشت سے باہر ہونے لگا تو امیر علی خاں نے سہرے کی لڑیوں میں سے اپنی سفید مونچھیں دکھا کر نیگ کے اکاون روپے دیئے۔ مگر حیات روپے لئے بغیر اندر بھاگ گیا۔ فضا میں شہنائیاں پورے جوش سے بھڑک اٹھیں۔ دل یوں دھڑکنے لگے جیسے اُچھل کر باہر آ جائیں گے۔ قاسم آپا بچوں کو گھیرے ریکارڈوں پہ ریکارڈ لگائے جا رہی تھیں اور ٹولیاں بنائے عورتیں زیادہ سے زیادہ چیخنے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔

سمدھنوں کے قہقہے، بچوں کی پکار، بینڈ کے نغمے، گوری ماں کی سسکیاں اور حیات کی آواز مل کر ایک ایسا گیت بن گیا جس کے سُر علیحدہ علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ اس وقت گوری ماں کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اگر حیات دیکھتا تو ضرور ایک اچھی نظم کا اضافہ ہو جاتا۔

اب لڑکیوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ خواہ مخواہ کوئی بوجھ سا دل پہ آن پڑا۔

اپنی ہی لے چلے، اب لے چلے سردار ہو
دُلہن کی اماں یوں بولے اب ہو گئے لاچار ہو

میراثنوں کے اس گیت پہ عورتوں کے علاوہ نواب جانی اور حیات بھی دروازے سے لگے سسکیاں بھر رہے تھے۔

پھر ایک بجے رات کو یہ ہنگامہ اس آدمی کی طرح خاموش ہو گیا جس کا چیخنے چیختے ہارٹ فیل ہو جائے۔ چنو ماموں بَین کر کے روئے جا رہے تھے ——" آگے میری اماں —— میری سونے کی بیٹی کو چوراں لیکو بھاگ ریئں رے اللہ!"

گھر میں بڑا پُر اسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف چھوٹی خالماں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ نواب جانی، سلیم اور پیا نیچے سامان کی اٹھا دھری کر رہے تھے۔

چاند نے بالکل نہ سوچا کہ گوری ماں کسی کے آفتابوں کی روشنی سمیٹے لئے جا رہی ہے۔ وہ ساقی محفل سے رخصت ہو رہا ہے جس کے پیمانے میں ماہِ تمام طلوع ہونے والا تھا۔ اپنے آنسو پونچھ کر بہت دیر تک وہ حمایت نگر کی طرف جاتی ہوئی بارات دیکھتی رہی اسے حیات جیسا قطعی یاد نہ آیا۔ اس کی اتنی پیاری بہن اتنی اچھی دوست رخصت ہو رہی تھی، ایک ایسے شخص کے ساتھ جو چاند کو قطعی پسند نہ آیا —" ائیو اللہ اب میں کس سے لڑ لڑ کر اطلیاں چھینا کرونگا جی — !"

پھر صوفے پر گر کے وہ خوب روئی۔ رات بھر خواب میں کھوٹے سکّوں کا بیوپار ہوتا رہا۔ انھیں لئے وہ بازاروں بازاروں گھومتی رہی۔ ہر دکان دار انھیں واپس کر دیتا۔ کسی بینک میں وہ قبول نہ کئے گئے ـــــ کھوٹے سکّے ـــ جن میں ملاوٹ تھی۔ جو کسی بازار میں نہ چلیں گے۔ ہر کسوٹی انھیں جھوٹا ثابت کر دے گی۔

پہلی جمعگی کے دن وہ سب امیر علی خاں کی مرمت کے لئے وزنی وزنی ترکاریوں اور پھلوں کا انتخاب کر رہے تھے کہ نیچے بڑے ماموں حضرت کی گھن گرج سُنائی دی۔

"آپ تو شادی کے دن ایسا بھاگے جیسا مُردے کو قبر میں ڈال کے بھاگے ہوں۔ آپ کو معلوم تھا گھر میں کتنا کام ہے ـــ؟"
یوں حیات پہ بے بھاؤ پڑتی دیکھ کر بڑی ممانی بھی اپنا بھاری بھر کم جسم سمیٹ کر اُٹھیں۔

"چپ ڈنڈے با اُسنے تو۔ ماموں کا کھانا دوسروں کی بکریاں چرانا، وہی مثل ہے تمھاری!" انھوں نے ذہنی تنبیہوں استعارں والی زبان شروع کی "ہمارے وخت پر کام نہیں آئے تو میاں وخت پڑا جب تمارا گھُلا کون تل کے دینگا ـــ؟"

پھر وہ کمرے میں آیا۔ یوں جیسے واقعی تیسرے دن نئی قبر پہ فاتحہ پڑھنے آیا ہو۔

"آپ لوگاں میرے سے خفا ہو گئے ـــ" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ زمین پہ بیٹھے بیٹھے چاند نے سر اُٹھا کے دیکھا، وہ کتنا لمبا ہے۔ اس کے آخری سرے کو چھُونا کتنا مشکل ہے۔ چکنے فرش پہ اس کی پرچھائیں یوں پڑ رہی تھی جیسے وہ آدھا زمین کے اندر دفن ہے۔ تین دن کا بھولا ہُوا غم جاگ پڑا اور چاند اس سے لپٹ کر خوب روئی۔

"جانے دو چاند پاشا!" اس نے چاند کے آنسو پونچھے "وہ اوپر اُڑ جانے والا ہیلیم تھی۔ آنے ہمارے واسطے نئیں تھی۔"

"زندگی کے وہ کتنے اچھوتے لمحے ہوتے ہیں جب تخیّل کی وادیوں میں شعروں کے ہیولے ڈولتے پھریں۔ جب فن کے اسرار و رموز شاعر کے چاروں طرف سرگوشیاں کرنے لگیں۔ لیکن ایسے وقت میں بھی شعر کہنے کی بجائے اس کمرے کی قیمت کا اندازہ کرنے لگوں تو آپ کیا سمجھیں گی ـــ" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بس ایسی ہی ٹریجڈی ہوتی ہے میرے ساتھ۔ آپ لوگ بجا فرماتے ہیں کہ حیدر آباد میں ادیب پیدا نہیں ہوتے۔ صرف ورکر ڈھلتے ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ موجیں گننے گئے۔ جب میں نے طوفان پہ نظر ڈالی تو شاعرانہ موڈ غائب ہو گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے آج تک کوئی شعر نہیں کہا۔ صرف آنکھیں بند کر کے خوابوں کے جزیروں میں گھومتا رہا ہوں۔"

ہر پانچ منٹ کے بعد نیا سگریٹ سلگانے والا جنوبی ہند کا وہ شاعر کہتا رہا۔ اپنے منہ کے اوپر پھڑکتے ہوئے سگریٹ کے شعلے میں وہ خود بھی جلتا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ اُکتائے ہوئے انداز میں کامریڈ سنگیتا نے چڑھا پا و صبا نے اپنے پیروں کے قریب پھیلتی ہوئی دھوپ دیکھی۔ شام کی ہوائیں زرد دستی سورج کو اندھیرے میں دھکیلنے پر تُلی ہوئی تھیں۔

پُرانے پُل کے اس چائے خانے میں حسبِ معمول اس وقت کافی چہل پہل تھی۔ یہ شہر کا مرکزی مقام تھا۔ چار مینار کے گرداگرد پھیلا ہُوا حیدر آباد، سمٹتے سمٹتے ان چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں ختم ہو گیا ہے۔ پُرانے گاگ مرشداں[1]، جھٹکے تانگے والوں، مزدوروں اور چھوٹا موٹا کاروبار کرنے والے تاجروں کے یہ اڈے تھے۔ دن میں کئی بار پالیسی بدلنے والے اُردو اخباروں کے ایڈیٹر، کلرک، اونچی ڈیوڑھیوں سے نکالے ہوئے حرامی صاحبزادے، پھیپھڑ ادیب اور اُن میں کام کرنے والے مخلص ورکر اور خفیہ کے جاسوس، سب یہیں جمع ہوتے ہیں۔

---

[1] سنہ ۔ اٹیچی

ممکن ہے سیزائے۔ گرانڈ ہوٹل عزیز کیبن اور نظامیہ میں بڑے بڑے اُٹلکوئیل بیٹھے، بڑھیا شراب میں اعلیٰ درجے کی سیاست گھول کر پی جاتے ہوں۔ لیکن کنگ کوٹھی، شاہ منزل اور دار السلام کی ہر سیاسی چال کے مہرے یہیں سے چلے جاتے ہیں۔ فضا میں سبندھی، پسینے اور بیڑی کی بو پھیلی رہتی ہے۔

چار مینار کے آس پاس پھیلی ہوئی ہندوستانی کبابوں، دہی بڑوں کی دوکانیں، حلوائیوں، لوہاروں اور سناروں کی دوکانیں مل گئی ہیں۔ تجارت دوکانوں سے نکل کر فٹ پاتھ پر بھی آگئی ہے۔

آج سنگیتا کو بھی اس چائے خانے میں آنا پڑا تھا۔

ان کے قریب ہی ایک مدراسی اپنے دوست سے نیم اُردو نیم انگلش میں باتیں کر رہا تھا۔

"حیدرآباد کی مسجدوں میں نمازاں بڑی زلدی بگین کرتئیں۔ میں مسجد میں انٹر ہوکر ابی وضو بنا رہوں کہ امام صاحب کھٹ بول کے سلوٹ ہی مار دیتیں۔ اوہ چھوکرا، ایک چائی لاؤ" ان کے ساتھی نے تائید میں گردن ہلائی۔

"مکہ مسجد میں تو بارہ بجتے ہی امام صاحب ایڈرس اینڈ کرد تئیں"

"آج باغ عامہ کی مسجد میں حضور کا بھوت چڑھاوا تھا کتے" ایک ترکی ٹوپی نے تشویش ظاہر کی۔

"اچھا ——؟ تقریباً ایک درجن لوگ اچھل کر ترکی ٹوپی کے قریب آگئے" —— "آں پھر کیا ہوا ——؟"

ایک دُبلے پتلے مولانا، ایک من وزنی پگڑی باندھے، قومی جھنڈے کی طرح لہرا لہرا کے اپنے دوست کو شعر سنا رہے تھے۔

صنم کے رُخِ منور پر جو ایک تل سا چمکتا ہے
گویا خدا رت کے منشی نے قلم جھٹکا سو نقطہ ہے

کھڑے ہوئے بڑی تہذیب کے ساتھ جھک جھک کے داد سمیٹنے کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کے عاجزی سے بولے۔

"دوسرا شعر بھی بولاؤں تقصیر، پن ابھی مطلب ڈالنا باقی ہے"

سنگیتا کی محویت کو محسوس کیے بغیر شاعر کہتا رہا۔

"معاف کرنا کامریڈ سنگیتا تمرن چٹوپادھیا، شاید آپ نے یہی نام بتایا تھا! آپ جیسی آرٹسٹ بھی اگر حیدرآباد کو خالی پاکر حت کا رُخ کرے تو مجھے بڑا افسوس ہوگا۔ آپ کے سامنے کافی اہم ماڈل پڑے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ حیدرآباد بہت مشکل ہے۔ بہت ضخیم۔ اُسے سمجھنے کے لئے آپ کو کئی ڈکشنریاں چاہئیں۔ تو کیوں نہ آپ اس کا خلاصہ دیکھ لیں۔ اُس کا دل۔ آپ تلنگانے چلی جائیے۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے میں آپ کو ایک اور جگہ لے جاؤنگا۔ پہلے تلنگانے کے پس منظر کو سمجھنا ہوگا"

حالانکہ وہ کامریڈ نہیں محض ایک آرٹسٹ تھی۔ لیکن بڑی خوش اخلاقی سے، بڑے تحمل سے سنگیتا نے جنوبی ہند کے اس بچارے شاعر کو دیکھا، جس کے متعلق اس نے سُنا تھا کہ بڑے کام کا آدمی ہے۔ اس لئے بنگلوں اور ڈیوڑھیوں والے حیدرآباد میں اس کے لئے کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔ وہ کئی کئی دن پُل پہ سو کر گزار دیتا ہے۔ کبھی برسوں اسے حیدرآباد کے نیچے جانا پڑتا ہے۔ جہاں صرف اس کے کام نظر آتے ہیں وہ خود دکھائی نہیں دیتا۔ پھر اُبھرا تو نظامیہ ہوٹل کے ادیبوں میں جا بیٹھا۔ "عثمانیہ" میں ٹیوشن پڑھا آیا۔ کئی کئی برس کی جیل کاٹ آیا۔ کسی اخبار کے دفتر میں جا بیٹھا۔ کسی دُکان کے تختے پہ سوتے سوتے اُٹھ کر دیوار پہ اپنی نئی نظم لکھ دیتا ہے۔ پھر اس کے دوست اس نظم کو معیاری رسالوں میں بھیجدیتے ہیں۔

آج کئی دن سے وہ یہیں تھا۔ سنگیتا نے جھک کر دیوار پہ کوئی نئی نظم ڈھونڈی —— "ہرا علاج مرض کے لئے اس

کو آزمایئے " اور اس کے نیچے لکھا ہوا " زندہ طلسمات " مٹا کر کسی نے بے ڈھنگی تحریر میں لکھ دیا تھا۔

ہجومِ شوق سرِ راہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

- یہ آپ کا شعر ہے —— ؟

" نہیں —— "، شاعر نے یوں انکار کیا جیسے اقرار کرنے کو بے قرار ہو۔

" میں اتنا بڑا شاعر کہاں ہوں جو ہر لاعلاج مرض کا علاج کر سکوں۔ آپ شاید نہیں جانتیں کام ڈے، کہ یہ شعر یہاں کتنی مصیبتیں جھیل کر آیا ہوگا۔ کتنی حراستوں سے نکل بھاگا ہے۔ اس شعر کے گرد پچیس ہزار کا پہرہ ہے۔ لوگوں نے اس شعر کو اپنی رائفلوں سے گرانا چاہا مگر اس کی پرواز کوئی نہ روک سکا۔

تعجب مت کرو کامریڈ سنگیتا۔ یہ حیدرآباد ہے۔ یہ جنوبی ہند کا دل ہے۔ یہاں سورج غروب ہو جاتا ہے مگر انتظار کی روشنی نہیں بجھتی۔ یہاں کے شاعروں کو اپنے شعروں کے مطلب نہیں ملتے۔ شعروں کے مطلب پانے کے لئے انھیں آگ میں کودنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو اس فولاد میں ڈھالنا پڑتا ہے جس پہ فولاد کی گولی اثر نہیں کرتی۔

یہاں کے معزز شہری باغ عامہ کی مسجد میں جمع ہونے والے عہدہ داروں کی سازشوں اور شاہی محلوں کی پالیسی پہ بحث کرتے ہیں اور وہاں کے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور بین الاقوامی حالات پہ ایک دوسرے سے جھگڑ پڑتے ہیں۔

یہاں کی جاہل عورت بیچ چوراہے پہ شوہر کی گردن پکڑ کے اس کی دن بھر کی کمائی چھین لیتی ہے اور جب بی اے پاس کر لیتی ہے تو اپنے شوہر کی خواہشوں میں گھری، روتے روتے اپنے آنسوؤں میں ڈوب مرتی ہے۔ وہ نہیں جانتی چرچل ہالی ووڈ کے کسی مسخرے کا نام ہے یا میکس فیکٹر کے نئے غازے کا —— ؟

اس لئے میں اس گندے ہوٹل میں بیٹھا سوچے نہ جاؤں تو کیا کروں۔ ایسی جگہ بھی مجھے انتظار ہے۔ مجھے انتظار ہے —— "

اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کے اس نے کرسی کی پشت پہ گردن ڈال دی۔

ساری کا ڈھلکا ہوا پلو دوبارہ سر پہ ڈال کے سنگیتا نے دیکھا۔ اپریل کی خنک ہوائیں سورج کے سنہرے گولے کو زنا دیکی میں دھکیل چکی ہیں۔ ہائی کورٹ اور عثمانیہ ہاسپٹل کی سب سے اونچی منزلوں پہ روشنی کا ہلکا سا گمان تھا اور بے شمار چمگادڑیں رودِ موسیٰ کے کھیتوں میں جا رہی تھیں۔

نیچے اتر کے اس نے سروجنی نائیڈو کے ہاں جانے کے لئے جھٹکا منگوایا۔

صبح چاند نے بڑی کاہلی سے آنکھ کھولی۔

صحن میں امی، بسم اللہ بی کو مار رہی تھیں اور وہ رو رو کے توبہ تلا کر رہی تھی۔ اس کے کمرے سے ملا ہوٹل کا لان تھا۔ مگر آج ادھر خاموشی چھائی ہوئی تھی —— آج ہڑتال ہے۔

پپا نے جنگ کے زمانے میں بڑھائی ہوئی تنخواہیں پھر گھٹا دی تھیں اور اس بات پہ تین مہینے سے ملازم جھگڑ رہے تھے بہت سے نکل گئے۔ پھر معافی مانگنے آ گئے۔ بہت سوں نے دوسری جگہ کام کرنے کی دھمکی دی۔ مگر پپا جانتے تھے کہ آج کل کام کہیں نہیں ہے، اور پھر ان حقیر کیڑوں کی کیا ہستی ہے جو پپا سے سرکشی کر جائیں۔!

کئی دن سے ہوسٹل بند تھا اور پپا کا غصہ انتہائی حد کو پہنچا ہوا ہے۔
اب کیا کرنا ——— ؟ اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔
چاندنی راتوں میں باغ پہ نکھار آتا تو چاند پہ ایک نامعلوم سا خمار چھانے لگتا۔ وہ برانڈے کی سیڑھیوں پہ گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ ہر وقت اسے کسی اچانک ہونے والی بات کا انتظار سا رہتا۔
گڑھل اور چنبیلی کی کیاریوں کے درمیان ایک سنگِ مرمر کا مجسمہ تھا۔ ایک اُداس پجارن دیا بجا رہی تھی۔
چاندنی راتوں میں یوں لگتا جیسے وہ سچ مچ کی میرا ہو اور مندر کی سیڑھیوں پہ بیٹھی گا رہی ہے۔
میں برہمن بیٹھی جاگوں جگت سب سوئے ری آلی۔
اس باغ میں چاند نے بہت سے پودے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے۔ یہ پھول آج سے پہلے کبھی نہ کھلتے اگر بارش میں گھنٹوں بھیگ کر وہ قلم نہ لگاتی۔ یہ چھوئی موئی کے درخت ابھی تک ایک دوسرے کو نہ چھو پاتے اگر چاند ان کی دوری پر ترس کھا کے قریب قریب نہ لگاتی۔ دن کا راجہ تسلیم کی طرح دُور بھاگ رہا ہے اور گل چاندنی کی بیل چاند کی طرح اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی ——— جاگیردار کہیں کا۔
آج کئی دن سے وہ نہ باغ میں گئی تھی نہ بنجارہ ہلز۔ اب وہاں کیا رکھا تھا۔ فر کالج میں ہی مل جاتی۔ نواب جانی کو اپنے رومانس سے فرصت نہ ملتی۔ حبیب جبڑا کبھی کبھی آ جاتا۔ تسلیم بیک وقت قوم کی اور بیوی کی ناز برداری میں مصروف تھا۔ گوری بڑے ٹھاٹ سے سسرال میں جا بسی تھی۔ آئی بھی تو اتنی فرصت نہ ملتی جو خاکسار لوگوں سے غپ شپ ہو۔ کبھی سب اکٹھے ہوتے تو نواب جانی سے شطرنج کی بازیاں لگ گئیں مگر بیچ میں آ کر کوئی خلل نہ ڈالتا۔
گوری ماں کو دیکھو تو بالکل روایتی بیویوں کی طرح لپائیں جھپائیں سسرال میں کام کرتی پھر رہی ہے۔ ہاتھ جلا جلا کر ساس سے لڑ رہی ہے۔ مشتاق ماؤں کے انداز میں بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ بال بکھیرے جھٹک جھٹک کر باورچی خانے میں مصروف ہے۔ شوہر کی جھڑکیاں سن کر زار و قطار روئے چلی جا رہی ہے مگر کوئی نہیں جو اس کے ساتھ روئے۔
عید کو اب بھی شیر خورما پکتا اور سب جھوٹے ہاتھوں سمیت ایک دوسرے کے گلے میں لٹک جاتے۔ فر روزانہ کالج میں پیچھے گری ہوئی املیاں لاتی تھی۔ ریڈیو پہ تیمر کی غزلیں گائی جاتیں اور "بیابک اپنیں" کھیلتے وقت خوب ایک دوسرے پہ کیچڑ اچھالی جاتی۔ مگر وہ جوش و خروش نہ تھا۔
حبیب جبڑے کا سیاہ رنگ اب اور بھی اُکتا گیا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ محرومی کے آٹوگراف صاف پڑھے جاتے۔ سائیکل پہ گھما کے رہی سہی شگفتگی بیٹن کمپنی والوں نے چھین لی تھی۔
"بڑا انگور کہ وحیات بھئی۔ مرد اپنی محبت کو زیادہ دنوں یاد نہیں رکھتے" گوری ماں آج بھی اُسے تسلی دیتی۔
معلوم نہیں ستاروں کی آب و ہوا میں کتنی کمی ہو گئی ہے ——— ! (گوبر کے ڈھیر پہ منڈلانے والا کوئی جگنو سوچتا۔)
جس دن فر بھی اس کے ساتھ کالج سے آ جاتی تو وہ دونوں گھنٹوں بیٹھی سوچا کرتیں۔
ابھی رازق بھائی کے آنے میں تھوڑے دن باقی ہیں۔ تسلیم اب کچھ دنوں میں پکا لیڈر بننے والا ہے۔ چچا خواں نے سیاہ جو حبیب کی نئی ساری خریدی ہے جو انھیں اٹھنا چاہیے۔
"چاند جانی، آج میں ایک غزل باگیسری میں بٹھائی نا" وہ جاتے ہی خوشخبری سناتے۔

وہ دونوں غزل سُنتے میں جھوٹی تعریف کے ساتھ خوب الائچیاں اور چکنی ڈلی صاف کرتی جاتیں۔

"اللہ ماموں شاہ۔ ہم کو وہ کالی چمکیوں والی ساری دو نا۔" چنبیل بولی کالج ڈے میں تم دونوں ویچ ساری پہن کے آؤ۔" اور ساری لے کے بھاگتے وقت وہ دونوں مڑ کے آہستہ سے کہتیں "چھچھوال!"

ابھی وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے ماموں شاہ سے ساری مانگنے کی ترکیب سوچ رہی تھی کہ فرکا فون آیا۔ آج دو بجے کے جہاز سے رازق آرہا ہے۔ ریسیور رکھ کر وہ دوڑتی ہوئی پپا کے کمرے میں گئی اور حسبِ عادت سیاہ پردہ منہ پر ڈال کے پپا کو یہ خوشخبری سُنائی مگر پپا نے اس مسرت خیز خبر کا نوٹس نہ لیا۔ اتحاد المسلمین کے چند کارکن ان سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کر کے ہے تھے ظاہر ہے ایسے وقت پپا کا موڈ بے حد خراب ہونا چاہیئے۔

مجبوراً اکیلی ہی گیراج کی طرف بھاگی۔ راستے میں کار سے اترتے ہوئے چھچھوال ملے۔

"چاند جانی تیرے کو میری خسم ذرا سن کر جا۔ آج میرے کو بھیروئیں گانے کا موڈ آرا۔" جلدی کے مارے وہ پیروں میں گھنگرو باندھے ہی چلے آئے تھے۔

"رازق بھائی آرئیں نا" چاند نے بھی خوشخبری سُنائی۔

ہر روز کی طرح اس رات بھی وہ سوتے وقت بہت خوش تھی۔ رازق ذرا بھی نہیں بدلا۔

"تم ساری پر بہت اچھے دکھتے ہو وقار۔" ایروڈروم پر ہی اس نے تعریف شروع کر دی۔ چاند کو بڑی تسلی ہوئی۔ یوں جیسے ڈاکٹر نے صحت مند ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہو۔

"تم سے دُور رہ کر تو میں بھی ذرا ذرا شاعر ہو گیا ہوں۔"

کس کو معلوم وہ دن کیسے گزرے۔ اُسے یاد ہی نہ آتا کہ امّی کا کونسا چڑھاوا کام آیا۔ کس طرح چھوٹی خالمّاں راضی ہوئیں۔ پپا نے کونسا مانع دیکھ کر داؤ لگایا۔

چاند کو ہوش آیا تو رازق اسے منگنی کی انگوٹھی پہنا چکا تھا۔ ورانڈے میں کچے کھوپرے، صندل اور پھولوں کے تھال رکھے جا رہے تھے۔ آیائیں ماماٗئیں صحن میں منتیں گا رہی تھیں۔ چولہے کنے سے کچی بریانی کی خوشبو اُڑ اُڑ کر سارے گھر میں پھیل رہی تھی۔ بینڈ والے چیخ رہے تھے اور گھر میں اتنے لوگ بھر گئے تھے کہ در و دیوار چھُپ گئے۔ کھڑکی سے باہر دُور تک رنگ رنگی لہراتی جھنڈیوں کے نیچے موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ چھچھوال کی پارٹی ناچ گانے کے کئی پروگرام پیش کر چکی تھی۔ سُرخ بنارسی ساری کا پلّو بار بار چھنو نواب کے سر سے ڈھلک جاتا اور بڑی نزاکت سے وہ ہارمونیم پہ انگلیاں چلا رہے تھے۔

پھلوا ہیں گندہ میکا بسنت۔ ہروا مول لے دے رے۔

آج گوری ماں اپنے وزن سے زیادہ وزنی زیوروں میں چھپی ہوئی تھی۔ اور سب خواہ مخواہ ہنس ہنس کر لوٹے جا رہے تھے۔ پھر اچانک سناٹا چھا گیا۔ صرف ناگا کی آواز گونجتی رہی جو کسی ساز کے بغیر ایک پرانا تلگو گیت گا رہی تھی۔

تحصیلدار ہماری گائیں کھول کر لے گیا ہے۔

جاگیردار نے ہماری فصلیں لوٹ لی ہیں۔

آنے والے راہی کو ہم کیا دے سکیں گے!

ہمارے پاس سیوتی کی ایک کلی رہ گئی ہے۔
اسے سنبھال کر رکھنا خریدنے والے سوداگر۔

یہ بہت پرانا گیت تھا۔ چاند نے اسے بارہا شادیوں میں ڈھیر ڈومنیوں سے سنا تھا۔ سیوتی کی ایک کلی کی کہانی، جو لوٹ اور ظلم کے طوفان میں بچ گئی تھی۔ بچاری اکیلی کلی کس کام آئے گی! کتنا مبہم گیت تھا۔ لیکن آج منگنی کے دن بھی سب کے پُر مسرت چہرے اس گیت نے اداس کر دیئے تھے۔ سب خاموش تھے۔ گوری ماں تک۔ جیسے اپنی اکلوتی کلی کو پردیسی ہاتھوں میں سونپ رہے ہوں۔ اسے سنبھال کر رکھنا خریدنے والے سوداگر۔ امی کی دبی دبی سسکیاں بلند ہونے لگیں اور وہ میز سے لگی اپنی انگوٹھی دیکھے جا رہی ہے۔

پھر قائم علی نے ماسٹر صاحب کے آنے کی خبر دی اور یہ اطلاع بھی کہ ان کے ساتھ ایک عورت بھی آئی ہے۔

عورت کے نام پر وہ چونک پڑی۔ کل عشرت آپا نے بتایا تھا کہ چاند کو پڑھانے والا ماسٹر تو بہت مشہور شاعر ہے۔ وہ اپنے اصولوں کا بڑا پکا ہے اور حسین سے حسین لڑکی کو بھی لفٹ نہیں دیتا۔ یہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہوا کہ وہ چاند کو بھی نہیں گنتا۔ اسے یقین تھا ماسٹر کے ساتھ نیشو دا ہو گی۔ ایک بار چاند کسی جلسے میں تسلیم کے ساتھ گئی تھی تو وہاں ماسٹر صاحب نے نیشو دا سے بھی تعارف کرایا تھا۔

”آپ ان سے ملتی رہا کیجئے بی بی۔ یہ خود آرٹسٹ نہیں لیکن آرٹسٹ کا دل ضرور رکھتی ہیں۔“

دونوں نے بڑی طنزیہ نگاہوں سے ایک دوسری کو دیکھا تھا۔

سیاہ پردے کو منہ پہ ڈال کے اس نے اندر دیکھا۔ ایک سانولی سی لڑکی بیٹھی تھی۔ بالکل گرین والا اسٹائل۔ اس کے چہرے پہ بھی دائمی پیاس کے آثار تھے اور وہ آنکھیں پھاڑے کمرے کی آرائش کو نگل رہی تھی اور چاند ذرا دیر پہلے کی ساری اداسی بھول گئی۔

”اللہ آپ کچھ دن اور ٹھہر و نا۔ ابن نظام ساگر جائیں گے۔ میں رازخ کو بول کے آپ کو ایک پارٹی دونگا۔ نواب جانی کی جاگیر میں آجکل کمیونسٹاں حرام کے خوب لڑائیاں ڈال رئیں نئیں تو واں پکنک کو جاتے تھے۔“

مگر سنگیتا جواب دینے کی بجائے منہ کھولے بڑے تعجب سے اسے گھورتی رہی۔

”یہ تصویر میں بمبئی میں ایک ہنگیرین آرٹسٹ سے بنوایا تھا۔ آنے کیا بولا آپ کو معلوم ماسٹر صاحب۔ کہتے اللہ میاں میری صورت میں آفریں بچ نئیں دیے ـــــ“ وہ تینوں بڑی زور سے ہنسے۔ نہ جانے ہنگیرین آرٹسٹ کی بے وقوفی پہ یا ہوشیاری پہ۔ سنگیتا کو دیکھ کر اسے شک ہونے لگا کہ گرین کی محبوبہ یہی ہو گی جس کی باتیں کرتے وقت وہ پڑھانا بھول جاتا تھا۔ کاپی پر اس کے سینکڑوں اسکیچ بنا ڈالتا ـــــ مگر سنگیتا نے اپنے ماتھے کی بندیا کہاں گرا دی۔ پھولوں کی مینی کہاں ہے۔ منی پوری ناچ کے لئے لوچ بھرا جسم تو ہے مگر وہ اپنے ناز و ادا کہاں بھول آئی ـــــ!

رازق اور چاند نے مل کر ان کی خاطر میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اور سنگیتا نے ان کے لباس، معاشرت اور مصروفیت سے لے کر ”عثمانیہ“ میں ہونے والی ہڑتال کی وجہ تک پوچھ ڈالی تو چاند کا جی چاہا ماسٹر صاحب اور ان کی دوست کو جی بھر کے پانی بھی پلا دے۔ کوئی ایسا کام کرنے کے لئے چاند بے چین تھی جو سنگیتا کی نظر میں اس کی وقعت بڑھا دے۔ وہ سمجھ جائے کہ چاند محض ایک دولت مند لڑکی ہی نہیں ہے۔ اس کے پاس بھی ایک آرٹسٹ کا دل اور شاعر کا دماغ ہے۔

رات کو بلنگ پر لیٹ کر اپنی بے مصرف زندگی کو اس نے غور سے دیکھا۔

دور کسی بنگلے میں سُنائی جانے والی برہ کتھا کے بول بھٹکی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

گانے والا مردنگ کی تال پہ چیخ رہا تھا —— "اگر تیرے آدرش اور عمل میں فرق ہے تو جھوٹ کی طرح تو فنا ہو جائیگا"۔

پنچ تنتر کی یہ کہاوت یوں آئی جیسے آسمان کی وسعتوں میں نمودار ہونے والے سفید لباس میں ملبوس فرشتے چاند سے مخاطب ہوں۔

"میں تو سیوتی کی ایک کلی ہوں جی" اس نے ڈرتے ہوئے صفائی پیش کی۔ جانے والے راہیوں سے کہو وہ اس کلی کو اٹھا لیں —— لاکھ چاہا کہ اس حصار کو توڑ کے نکل جائے۔ مگر زندگی بیر کا درخت تو تھی نہیں کہ ذرا ہلایا اور پکی پکی مرادیں گر پڑیں۔ اور چاند کے نصیبوں والے سارے پکے بیر تو گوری ماں، بشودا اور تسلیم چن کر لے گئے تھے۔

ادھر زندگی تھی کہ پرانی موٹر کی طرح ہر چار قدم پہ جا کے رک جاتی۔ کبھی تسلیم دھکا دے جاتا جب وہ سوشل ورکر بن رہی تھی۔ وہ افسانہ نگار بن جاتی کہ رازق یورپ چلا گیا۔ گرین کو اپنی محبوبہ کے اسکیچ بنانے سے فرصت نہ ملی کہ اسے آرٹسٹ بناتا۔

آج دن بھر بڑے ہنگامے رہے۔ ہوٹل کے سب بیروں کا نمائندہ بن کر رامنا ایک بڑی فوج کے ساتھ آیا تھا۔ خوب نعرے لگائے۔ مگر پپا کی صورت دیکھ کر سب بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اکیلا رامنا چاند کے کمرے میں آیا اور اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

"میرے کو نئیں مالوم تیرے جھگڑے ٹنٹے۔ پپا کو جا کے بول" وہ ماسٹر صاحب کی دی ہوئی کتابیں پڑھنے لگی۔

"آپ بولے تو صاحب کا گسہ ٹھنڈا ہو جاتا دراسانی" رامنا بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

چاند کو بڑا غصہ آیا۔ انھیں اکڑ دکھانا بھی تو نہیں آتا۔ ارے اجاڑ صورتو، کبھی تو مہینے دو مہینے جم کر اڑو۔ پھر دیکھنا پپا کیسے اپنی ضد پر قائم رہتے ——"

"ہڑتال کرنا تو مشکل نئیں ہے چتنا دراسانی (چھوٹی بیگم صاحبہ) پن بھوکے سونا مشکل ہے" رامنا عاجزی سے کہہ رہا تھا۔

مجبوراً وہ رامنا کی خطائیں بخشوانے پپا کے پاس گئی۔

مگر ناشتے کی میز پر امّی گلبرگہ کا قصّہ لے کر بیٹھ گئیں۔

ہر سال گلبرگہ کے عرس میں جانے کی تیاریاں مہینوں پہلے سے ہوتیں۔ چاند کو ریل کا یہ طویل سفر کبھی نہ بھایا۔ اور بھی تو درگاہیں ہیں۔ وہ پپا کے ساتھ پہاڑی شریف کی ایک ہزار سیڑھیاں چڑھ کے تھک جاتی تھی۔ لیکن اُوپر پہنچ کر کتنی خوشی ہوتی تھی۔ یہاں سونے والے بزرگ ٹال بھی جائیں تو خدا سے راست بات چیت کر لو۔

بزرگوں کی سفارشوں پر پپا کو بہت اعتقاد تھا۔ وہ سفارشوں کا اثر جانتے تھے اور بڑی طاقتوں سے بگاڑ ان کی فطرت نہ تھا۔

گلبرگہ سے غوث میاں کا خط آیا تھا کہ فضا بہت مکدّر ہو رہی ہے۔ آپ زنانے کو ساتھ نہ لائیں تو اچھا ہے۔

"لوگاں ایک دوسرے کو مار کے کیا خوشی پاتے ہیں —— ؟" رات کو اس نے ماسٹر صاحب سے پوچھا۔

" یہ تو دوسرے مذہب کی آڑ ہے بی بی ۔ آپ بھوکے انسان کو ایک روٹی کا لالچ دے کر اس کے بھائی کو بھی قتل کروا سکتی ہیں "
یہ ماسٹر صاحب بھی کب کے بھوکے پیاسے ہیں کہ ہر بات میں روٹی کا ذکر لے آتے ہیں ۔ کہیں جنگ ہو رہی ہو ۔ کہیں فساد ہو ۔
اس دن ماسٹر صاحب بہت اُداس رہتے ہیں ۔ پڑھاتے وقت بار بار اس کا ذکر لاتے ۔ چار چار بار اخبار پڑھتے ۔
" ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دُنیا کے حالات پہ غور کرے ۔ اگر آپ آرٹسٹ بننا چاہتی ہیں تو پہلے دُنیا کو اچھی طرح دیکھئے تاکہ اس کی صحیح تصویر اُتار سکیں "

ادھر اپنے کو کیا ۔ انگھا رکھنے والی دُنیا کو ۔ میں تو ایک کلی کی تصویر بناؤں گا ۔ ایک خوبصورت سی کلی کی ۔ اُس نے طے کیا تھا ۔
آج کل خالی گھنٹوں میں کالج میں صرف صفیہ کی باتیں ہوتیں ۔ لڑکیوں کو اس کی قسمت پہ رشک آتا ۔ ایسی دُبلی پتلی، سانولی صورت اور لوگ ہیں کہ اس پہ دھڑا دھڑ مر رہے ہیں ۔ ایک انگلش ادبیات کے پروفیسر، ایک اُردو لیکچرار، ایک ایم اے کا طالبعلم، ایک ریڈیو اسٹیشن کا انچارج ۔ وہ جدھر سے نکلتی لڑکیاں اس کی قسمت پر رشک کرتیں ۔ کسی نے تو یہ ہوائی بھی چھوڑی تھی کہ انگلش ادب کے پروفیسر اس بار اپنی ناول میں یورپ کا کوئی رومان بیان کرنے کی بجائے اپنا اور صفیہ کا رومان لکھیں گے ۔
قرنے جستجو کر کے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ناول کا نام " آدرش " ہوگا ۔
صفیہ کو دیکھ کر چاند کو رشک آتا ۔ میں اُجاڑ صورت یہ بھی نہیں کہا ——— !
شام کو بڑے انتظار کے بعد ماسٹر صاحب آئے تو وہ پردہ تھامے دروازے میں ہی کھڑی رہی ۔
" ماسٹر صاحب، آپ شعراں لکھتے کتے نا ۔ پھر ہم کو بھی سُنائیے نا اللہ " منہ پہ سیاہ پرٹے کی نقاب ڈال کر بڑے ناز سے بولی ۔
" اچھا تو چاند یوں کہئیے آج آپ پڑھنا نہیں چاہتیں ۔ "!
ماسٹر صاحب جانتے تھے ۔ جس دن صوفے پہ بیٹھنے کی بجائے وہ پردہ تھامے کھڑی رہے، بے معنی سوال کئے جائے تو یقیناً اس وقت وہ باغ میں آنکھ مچولی کھیلنا چاہتی ہے ۔ یا کوئی رشتے کا بھائی عثمان ساگر لئے جا رہا ہے ۔ وہ چچہ خوالی یا حبیب جبر کے نئے لطیفے سُنانا چاہتی ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آج پھر وہ شاعر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی گود میں اپنی لمبی چوٹی ڈال کے پوچھے ۔
" ماسٹر صاحب میرے اُوپر کھڑا وہ پیڑ کیسا اُجاڑ دکھتا نہیں ۔ اللہ آپ امی کو بولو نا کہ چاند کے واسطے نئی ساریاں خریدو " ۔
لیکن پردہ چھوڑ کے اس نے بڑے تعجب سے پوچھا ——— " آج آپ میرے کو چاند کیوں بولے ——— ؟ "
" آپ کو پیار سے چاند ہی تو کہا جاتا ہے ——— " وہ اطمینان سے نیم دراز ہو کے سگریٹ سلگانے لگا ۔
" آج آپ میری نظم سُننا چاہتی ہیں تو آئیے ——— "
چاند نے چونک کر دیکھا ۔ اس ایک لمحہ میں ۔ اس تیزی سے گزرنے والے لمحہ میں جانے اس نے کیا کیا دیکھا ۔ اس نے ماسٹر کی بھنی چپلیں دیکھیں ۔ اس کی ازلی پیاسی آنکھیں ۔ اس کے پیچھے چھپے ہوئے اسکینڈلز ——— آج وہ پیار سے چاند پکار رہا ہے ۔ اسے نظم سنانا چاہتا ہے ۔ یہ دو کانوں کے تختے پر سونے والا دو دمڑی کا شاعر ۔
ماسٹر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ آج وہ بڑا مضطرب سا تھا ۔
" بیٹھ جاؤ ——— " یہ تحکمانہ لہجہ ماسٹر نے پہلی بار سُنا ——— وہ بیٹھ گیا ۔
" آپ کون ہوتا جی میرے کو پیار سے پکارنے دے ——— ؟ " پردہ چھوڑ کر وہ قریب آ گئی ۔

"نہیں ہوتا میرے کو آپ کی یہ نظماں —" دھواں دھواں حسن شعاع مستقبل بن رہا تھا۔ ایک بھوں اُٹھا کے ماسٹر نے بڑے غور سے دیکھا۔ یہ روزہ والی کم گو جاآند نہیں تھی۔ آج اس کی آنکھوں میں اپنی اہمیت کا غرور تھا۔

"چلیے جلدی پڑھائیے —" کتاب آگے پھینک کر وہ بیزار سی آبیٹھی۔

"اب آپ آگے کچھ نہیں پڑھ سکیں گی وقار النسا بیگم —" اس نے سگریٹ اور ماچس اُٹھا کر جیب میں ڈالے اور چلا گیا۔ بہت دیر تک اس کی آواز کا آخری سُر سرگوشی بنا گونجتا رہا۔ بہت دیر تک وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ٹیبل کلاتھ پر ڈانس کرتے ہوئے عورت اور مرد تھم گئے۔ وہ میز پر نیا "کراس ورڈس" چھوڑ گیا تھا اور اس کے سامنے موٹی سطروں میں لکھا تھا:

جب منزل آجائے تو وہ منزل نہیں ہوتی۔ منزل کے متعلق سوچنے کا وقفہ ہوتا ہے۔

آج منزل آگئی تھی لیکن وہ سوچے بغیر آگے بڑھ گئی۔

ایسا کیوں ہوا —؟ پاپا ہر وخت نہیں بولتے چھوٹے آدمیوں کو مُنہ نکو لگاؤ۔ (اب اُنے اپنی پیاس بجھانے کدھر جائینگا!) ابھی ذرا دیر پہلے وہ اس صوفے سے اُٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سکون تھا۔ شاید وہ دیکھنے اُٹھا ہو کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں! ممکن ہے آج پھر رات بھر کام کرنے سے اس کے سر میں درد ہو رہا ہو اور وہ ٹہلنا چاہتا ہو۔ دُنیا میں کوئی بھیانک سا واقعہ ہو گیا ہو اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔ (اچھا ہوا۔ اُنے لڑکیوں کو لفٹ نہیں دیتا کہتے نا)

پاپا نے سُنا تو بہت خوش ہوئے۔

"اچھا کیے — میں سُنا تھا اُنے بھی غنڈہ پارٹی کا ہے۔ یہ کمیونشاں اور بلیاں ایک ذات سمجھو۔ دونوں ایچ دیکھتیں کب گھر والوں کی انکھیاں مُندنا، کب ہنڈی لیکو بھاگنا ؟"

رات کو وہ ریڈیو اسٹیشن سے اقبال کی غزلیں گاکر لوٹی تو سبت آباد کے چوراہے پر مُڑ گئی اور گھر آنے کی بجائے وہ بھی بنجارہ ہلز چل دی۔

آج وہاں بڑی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ گوری ماں کے آنسو اور امیر علی خان کا غصہ تو کوئی نئی بات نہ تھی۔ حبانؔ کی بیماری کا سلسلہ بھی بہت پُرانا تھا۔ کھڑکی سے لگے پلنگ پر لیٹا وہ باہر کا اندھیرا دیکھ رہا تھا۔ بار بار اسے کھانسی کے پھندے سے لگتے اور وہ کھڑکی سے باہر تھوک کر وہ کسی گہرے تفکر میں کھو جاتا۔ یوں جیسے کسی شاہکار نظم کی تلاش میں ہو۔

اس کے آس پاس سگریٹ کے دھوئیں نے ایک حصار سا کھینچ دیا تھا۔ (ایسے ہی ایک حلقہ میں ماسٹر نے بھی اپنے آپ کو بند کر لیا تھا) لیکن اس وقت اتنی اچھی بات وہ نواب جانی کو نہ سُنا سکی۔ وہ سب سر جھکائے امیر علی خان کی ڈانٹیں سُن رہے تھے۔ گوری ماں آج بھی میز پر جھکی سیاہ سمندر کی طرح ٹیبل کلاتھ پر آنسوؤں کے جزیرے بنا رہی تھی اور حبیبؔ، جبڑے کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ یوں جیسے وہ اپنی زندگی کے پُرشور استوائی خطے سے گزر کر اب کسی صحرائے اعظم میں پہنچ گیا تھا۔

اس صحرا میں کوئی نخلستان نہ تھا۔ آنسوؤں کے جھرنے اور اُمیدوں کے بادل اب بہت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔

تین بیویوں کو قبر میں اُتارنے کے بعد اب امیر علی خاں بیویوں کو موت کا راستہ دکھانے میں تجربہ کار ہو چکا تھا۔

"آپ لوگاں اس کو سمجھائیے۔ ورنہ کیا فائدہ میں زندگی تمام اس کو ایسا ہی رلاتا رہیؤں۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں۔ میرے کو غصہ آیا تو پھر تم خاں بھی گوری ماں کو نہیں بچا سکیں گے — ہاں —"

سب خاموش تھے — وہ اتنا بیہودہ قسم کا آدمی تھا جس سے بحث کرنا فضول تھی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ تھوڑی دیر کو کمرہ اُلٹ گیا۔ ہوش و حواس خوفزدہ چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کے سنبھلے تو امیر علی کے تڑپتے ہوئے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ مسہری کی نکالی ہوئی لکڑی قریب ہی پڑی تھی اور لوگ حیات کو پکڑنے بھاگ رہے تھے۔ منہ پہ آئی ہوئی لٹوں کو پیچھے جھٹکے بغیر گوری ماں اپنے باپ کے قدموں سے لپٹتی کبھی امیر علی خاں کے چھلنی ہوئے جسم سے ——" اس کو پکڑ لو۔ وہ حرامزادے کو جان سے مار ڈالو —— اس کی صورت کو انگارے لگنے دو۔

چیخ چیخ کر وہ بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

باغ کی کھڑکی کھولے چاند گنگناتی رہی۔ م

سانس کی طرح آپ آتے رہے جاتے رہے

پائپ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے پاپا ٹماٹر کی کیاریوں کو پانی دے رہے تھے۔ پاپا نے بڑی دُور دُور سے منگوا کر نئے پودے لگائے تھے تاکہ زمین کا ایک کونہ بھی بیکار نہ پڑا رہے۔ ہر سال باغِ عامہ کی نمائش میں پھولوں اور پھلوں پہ انھیں پہلا انعام ملتا۔ کاشتِ انگور پہ لکھی ہوئی پاپا کی کتاب محکمہ زراعت سے بھی انعام پا چکی ہے

" انگور کا جھاڑ لگانا اور اولیاء پالنا برابر ہے " وہ دوستوں سے کہتے تھے " جتنی محنت کیجیے ویسا پھل ملتا۔

ہر صبح چاند اُٹھ کر پاپا کے ساتھ باغ میں کام کرتی تھی۔ دونوں مل کر ایک ایک پودے کی دیکھ بھال کرتے۔ یہاں کے ہر ہر درخت کے متعلق وہ جانتی تھی کہ کب لگایا گیا۔ کن دنوں ٹھٹھر کر رہ گیا۔ کب تیزی سے بڑھا۔

پھر وہ بھی باغ میں آ کر پاپا کے ساتھ انگور کی بیلوں کو سنوارنے لگی۔

" پاپا، حیات بھائی کا ابھی تک پتہ کیوں نہیں چلا! اگر مل گئے تو کیا ان کو بھی پھانسی ہو جائے گی پاپا —— ؟"

" آپ کو کاہے کو ایسی باتاں! میں پہلے ہی بولا تھا یہ آستین کا سانپ ہے ——" وہ سہم گئی۔

" اب پندرہ اگست آ رہا۔ اپن بھی ہوٹل میں روشنی کریں گے۔ ذرا اخراجات کا بجٹ بنا کے لائیے!"

ایسے اہم کاموں سے وہ بہت خوش ہو جاتی تھی۔

چودہ اگست کی شام کو لیڈروں کی تقریریں سب نے بڑے اشتیاق سے سُنیں۔

سیاسی جھگڑوں سے یوں تو کسی حیدرآبادی کو دلچسپی نہیں ہوتی لیکن یہ جھگڑے تو چاند کے پُر امن گھر سے بہت دُور تھے۔ وہ سب ساتھ ساتھ روشنی دیکھنے گئے۔ چنو نواب تک کسی نے یہ خوشخبری پہنچائی، تو اس خوشی میں انھوں نے ایک شاندار پارٹی کر ڈالی۔

" اب ہندوستان آزاد ہو گیا کہتے " پاپا کہہ رہے تھے۔ اب ہندوستانیاں حیدرآباد کو سونے کی کان سمجھ کر آنا چھوڑ دیں گے اب ان کے پاس خود سونا برسیں گا۔"

پھر تو کالج میں شمالی ہند کی جتنی لڑکیاں پڑھتی تھیں بڑی اداس ہو گئیں۔ دہلی اور یو۔ پی کے شہروں میں کسی کا منگیتر مارا گیا، کسی کا بھائی۔ کسی کا چچا۔ لوگ گھبرائے گھبرائے پھرتے۔ نام پلی اسٹیشن پہ گرانڈ ٹرنک ایکسپریس آتی تو پلیٹ فارم لاشوں سے پٹ جاتا۔ اخباروں میں آگ اور خون کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔

" بکئیں عادرخ میاں آپ ——" بڑے ماموں حضرت زندگی میں پہلی بار سراسیمہ لہجہ میں کہہ رہے تھے۔

"یہ غنڈے حرام کے اب چین نہیں لینے دیتے۔"

"چپ ہندوؤں کو لوٹتے بول کے امیروں کو لوٹنے کی باتاں ہیں۔" راؤتی کے ابا بھی گھبرائے ہوئے تھے۔

"آپ کیوں ڈرتیں بھائی جان۔ یہ کمیونسٹاں کیا کر سکتے۔ اور یہ جھگڑے اپنے ملک میں ہوتے تھوڑی۔" پپا نے حسب عادت بے فکری سے جواب دیا۔

"اجی حضرت اب حیدر آباد ہندوستان ایچ سمجھو ——" ماموں حضرت نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "انگریز چلا گیا اب کون سنتا اپنی۔ میں تو سب کو بولتاؤں جلدی جلدی اپنا روپیہ پاکستان میں کھسکاؤ نئیں تو اپنا کھٹا نکلا۔"

"کیسی باتاں کرتیں بھائی جان آپ ——؟" پپا جھنجلا گئے "اجی ہبلک کو کچھ بولنے دو پن امیر ہندواں تو اپنے ساتھ ہیں نا۔"

"پن یہ سب مل کر اب ریاست پر قبضہ نئیں کیے تو میرے کو بولنا۔"

"کون رے وہ اجاڑ صورت ——! ہماری ریاست پہ قبضہ کرنے والا ——" چچی خوال مسی کی ڈبیہ اور آئینہ لئے کھڑکی سے باہر جھانکے۔

"اس کی صورت کو نکھار لگنے دو۔ ماٹی ملے کو جلتی لکڑی سے نئیں مارا تو میرا نام بہادر علی خاں نکو رکھو۔"

انھوں نے سب کو ہمت بندھائی۔

"کچھ ہو میں پاکستان تو نہیں جاؤنگا۔" پپا نے سب کو اپنا فیصلہ سنایا۔

چاند نے پہلی بار اپنے گھر میں اتنی پریشانی دیکھی اور یہ خبر سنانے وہ امّی کے کمرے میں دوڑی۔ فرش پہ بیٹھی وہ سسکیاں لے رہی تھیں اور ان کے سامنے بیٹھی پھوپھو ماں انھیں سمجھانے میں مصروف تھیں۔

"اجی سلطنتِ آصفیہ کے لالے پڑے نا۔ پھر جاگیرداروں کا کیا ہے دلہن بیگم۔"

سلطنتِ آصفیہ کے ان نوحہ گروں پر چاند کو بڑا غصّہ آیا۔

امّی کو اپنے میکے کی شان شوکت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہ تو کبھی پپا کے ساتھ پارٹیوں میں گھومیں اور نہ ہر ایرے غیرے کو منہ لگایا۔ انھیں نوکروں پر حکومت کرنے سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی۔ پھر باری باری سب نمک خوار ماماؤں اور ان کی اولاد کو سزا دینا۔ آنکھوں میں مرچیں بھرنا کئی کئی دن تک رسیوں سے باندھ کے مارنا یہ سب کام انھیں تھکا ڈالتے تھے۔ گھر میں کوئی کام ایسی نہ تھی جس کے جسم پر جلنے کے داغ نہ ہوں اور یہ داغ امّی ہر آنے جانے والے کو اپنی برتری اور قابلیت کی سند بنا کر دکھایا کرتی تھیں۔

اس دن کالج میں صفیہ کی بجائے شاہو موضوع گفتگو رہا۔

"آج کل شیو دا بھی اُن لوگوں کے ساتھ مل کر امن کمیٹیاں بنا رئے تھے، کیسے بھی یہ جھگڑے رُکنا بول کے۔"

رات کافی گزر چکی تھی۔

عابد روڈ سے سیکنڈ شو کے تماشائی بھی گزر چکے تھے۔ باغ میں چمگادڑوں نے درختوں پر گرنا شروع کر دیا تھا۔

لیکن پپا ابھی تک دالانڈے میں کرسی ڈالے امّی کو سمجھا رہے تھے۔

"اب یہ معاشی ناکہ بندی ہوئی تو اپنی چاندی ہے۔ یہ مہینے میں دو ہزار چھتر روپے سوا پانچ آنے کی زیادہ آمدنی ہوئی۔"

اب یہ لڑائیوں کے بعد ایسا ہی ایک اور بنگلہ نہیں بنایا تو صادق حسین نام نکو دکھو۔ اپن کیسا بھی کر کے یہ لڑائیاں قوب بڑھانا ——۔ "آج چاند کی سمجھ میں آیا کہ پپا کو یہ جھگڑے کیوں پسند ہیں۔

جدھر دیکھو سناٹا چھایا ہوا۔ ریڈیو سے ڈرامے اور موسیقی کے سارے پروگرام ملتوی ہو گئے۔ کھڑکی کھول کر دیکھو تو مسکراتی لڑکیوں اور نظر باز لڑکوں کی بجائے فوجی لاریاں غراتی پھرتیں۔

سلیم کے کہنے سے رازق اور چاند نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نواب جانی پاکستان کی فضا دیکھنے چلا گیا۔

"خوم کے لئے تو ان کا آخری خطرہ بہا دینا چاہیئے" سلیم پرجوش لہجہ میں کہتا اور اس کی نظیر سن کر ہر ملک کی غیرت جاگ اٹھتی۔ جمعرات کی رات وہ اپنا لکھا ہوا فیچر "نیا حیدر آباد" براڈ کاسٹ کر کے لوٹ رہی تھی کہ خیریت آباد کے چوراہے پر کسی نے کار رکوائی۔ وہ کانپ گئی۔ آج کل پُر اسرار قتل کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"آج میں نے ریڈیو سے آپ کا پروگرام سنا ——" سڑک کی دھندلی روشنی میں شاعو بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"آپ کو پسند آیا —— ؟" اس نے خوش ہو کے پوچھا۔

"مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ لیکن آپ تو آرٹسٹ کا ذوق رکھتی تھیں۔ پھر ایک انسان کی مجنونانہ خواہش پر ہزاروں معصوم جانیں کیوں قربان کی جا رہی ہیں۔ کبھی آپ اس مسئلہ پہ بھی سوچتی ہیں —— ؟"

اونہہ۔ روتی صورت کمیونسٹ —— اس نے کار آگے بڑھائی۔

گھر آئی تو ڈاکٹر واپس جا رہا تھا۔ کئی دن سے پپا کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے تھے۔ آج کل "عثمانیہ" کی ساری چہل پہل ختم ہو گئی تھی۔ کچن میں خاموشی چھائی رہتی۔ کونٹر سونا پڑا تھا اور مدراسی منیجر دن بھر آرام کرسی پہ بیٹھا اپنے گھر کا بجٹ بنا بنا کے پھاڑے جاتا۔

رازق کو چند مہینوں بعد ہی حکومت نے سروس میں لے لیا اور اس کے اورنگ آباد جانے سے تو دل کی اداسی اور بھی بڑھ گئی۔ کالج چند دنوں کے لئے بند ہو گئے۔ لڑکیاں فرسٹ ایڈ سیکھنے لگیں۔

اب صبح اٹھ کر چاند اکیلی درختوں کو پانی دیتی۔ دیوان خانہ صاف کرتی۔ ذرا پپا اچھے ہوتے تو مالی کی شامت آتی۔

موگرے کی کیاریاں سوکھی جا رہی ہیں اور خادم علی نے پپا کی سنگِ مرمر والی میز پہ خراشیں ڈال دی ہیں۔

گلاب کے جھاڑوں میں نئی کلیاں آ رہی ہیں۔ رات چمگادڑوں نے سارے کچے بوٹے کتر ڈالے۔

قمر —— نواب اور ہاشم آپا۔ سب لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں پڑی جانے کیا کرتی ہوں گی۔ سنا ہے گوری ماں میز پہ جھکی روئے جاتی ہے۔ نہ جانے کس کے لئے —— ؟

لڑکیوں کو آرگنائز کرنے کے لئے ایک دن سلیم سے مشورہ لینے گئی تو ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ بڑی خاموشی سے خاندان، دولت اور خوم پہ بہانے والے آخری قطرے سمیت سلیم پاکستان چلا گیا تھا۔ بڑے ماموں حضرت اپنی جاگیر اور وضع داری کی خاطر اکیلے بیٹھے ڈیوڑھی کی نگہبانی کر رہے تھے۔ آج کل امی کا غصہ بہت بڑھ گیا تھا اور سہتے ہی نوکروں کی سزاؤں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ بیزار ہو کر چاند پیانو پہ گائے جاتی ——

نہ جانے کدھر آج مری ناؤ چلی رے

اگر چند دنوں اور یہی حالت رہی تو اشوک کمار کے نئے فلم آنا بھی بند ہو جائیں گے۔ یہ معاشی مقاطعہ حیدر آبادیوں کے لئے زیادہ خاصا تکلیف دہ ہے۔ پھر پپا کیوں اتنا پسند کرتے ہیں!

رات کو جنگ شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ امّی کھانے کی میز سے اٹھ گئیں۔ پپا کو بڑے زور کا پھندا لگا۔ صرف چاند امباڑے کی بھاجی میں کچھ گھنگولتی رہی۔

رات جیب جبڑے کی لاش حسین ساگر میں ملی کہتے ——— فرح ٹیلیفون پہ سنا رہی تھی۔

اب ماموں حضرت کس کو پھانسی پہ چڑھائیں گے۔ گوری ماں کس کا منہ چڑائے گی!

رنج کے مارے چاند کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ حیات کی موت کا اعلان سننے کو تیار نہ تھی ——— آج اس نے سب کا منہ چڑا دیا ہے۔

وہ رنگین بیلوں کی طرح اوپر اٹھ رہا ہے۔ آسمان پہ ستاروں کی طرح مسکرا رہا ہے۔ زمانے آگے بڑھنا بھی ہے یا نہیں ———! فرہاد کے مرنے کو تو آج بھی تیشہ چاہیئے۔

آج، راتوں کو آوارہ گردی کرنے والے، شعر پڑھنے والے اور چاند کو کھڑکی میں دیکھ کر فقرے کسنے والے نوجوان، اس کی کھڑکی کے نیچے سے بہت دُور کٹ رہے تھے۔ اس سلطنت کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو دبابوں کے نیچے دھکیل رہے تھے جہاں انھیں کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں ملا۔

"یہ سب کیوں ہو رہا ہے ———" اشوک کمار نے فوٹو کے فریم سے باہر نکل کر اس سے پوچھا۔

"آج تین دن سے راشخ کا خط نہیں آیا" مسہری پہ گر کے وہ سسکیاں لینے لگی۔

آج تک وہ اتنی اُداس کبھی نہیں ہوئی تھی، آج تک بڑے ماموں حضرت یوں بغیر دستار اور چپراسیوں کے، آدھی رات کو دوڑتے ہوئے نہیں آئے تھے۔

"صادق میاں، میں آخری بار بولتا ہوں۔ بے فضول ضد نکو کرو۔ بچی کو لیکر پاکستان چلے جاؤ۔"

"یہ زمانہ تو کمانے کا ہے بھائی جان۔ ابھی پاکستان جانے کا وخت نئیں آیا" جب بڑے ماموں حضرت چلے گئے تو پپا نے بڑے عزم سے کہا۔

"میرے اوپر کون ہاتھ اُٹھا سکتا ہے۔ کوئی بھی آنے دو۔ اپن سب کو خوش رکھیں گے۔ اجی یہ دھیڑاں جماراں کیا ادھر دیکھنے کی ہمت کرے ——— ؟"

ہوٹل میں ہر طرف خاموشی چیختی پھرتی۔ دوکانوں اور سینما ہاؤسوں کے گیٹ بند پڑے تھے۔ عابد روڈ لاکھ مُدا اُدوں کی میت بنی اندھیارے کے قبرستان میں پڑی تھی۔

پھر فون کی گھنٹی زور زور سے بجی۔ نجادہ ہلز سے فرح بڑی پریشانی میں کہہ رہی تھی۔

"راشخ بھائی کی کوئی خیریت معلوم نئیں ہوئی۔ چاند تو خالو حضرت کو بول کے دارالسلام جاؤ۔ شاید واں عہدہ داروں کی خیریت آگئی ہونگی ———" فون چاند کے ہاتھ میں کانپنے لگا اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

"اجی اب وضو بنا کو توبہ تو بھی کرو نا جی" امّی خوفزدہ سی کھڑی تھیں۔ اپنے گناہوں پر شرمسار۔

"بے فضول ہے ——— پپا تھکے ہوئے سے کمرے میں آئے اور ٹوپی اُتار کے صوفے پر گر گئے۔

"اب توبہ کا وخت نکل گیا سردار ——— اپنی جان بچنے کی دعا مانگو۔ مگر نکو۔ میں حماخت کیا ———" وہ ہاتھ ملنے لگے۔

فون کی میز سے لگی چاند ساکت کھڑی تھی۔ آج سارے چھوٹے بڑے خداؤں سے پپا کیسا مایوس ہوگئے — ؟

پپا —— وہ دل پھاڑ کے رو پڑی — "میں پہاڑی شریف جاؤنگا" پپا نے کوئی جواب نہ دیا۔

جن سیاں منانے میں ناہیں منوں گی —— سبز ہرد کی شیروانی پہنے، گنگناتے ہوئے چنو نواب اندر آئے۔

"اجی بی بی۔ جی چگلی والا دکان کیوں بند کر دیا اُجاڑ صورت۔ میں سارنگی ٹھیک کرنے کو دیا تھا نا —؟"

کمر پہ ہاتھ رکھ کر، انھوں نے بڑے ناز سے شکایت کی اور پپا کو دیکھ کر جلدی سے کورنش بجالائے۔

"قدم بوسی دولہا بھائی۔ نصیبِ دشمناں کیا مجاز برابر نئیں اللہ آپ کا —! اللہ میری قسم بتائیے نا —؟"

"چنو میاں جلدی گھر جاؤ۔ یونین کی فوجاں آرئیں۔ باہر نکو نکلو" امّی نے انھیں باہر دھکیلنا چاہا۔

"اجی فوجاں اُئے تو اپنا کیا بگاڑتے باپ بچارے، پن میری سارنگی کے سُراں لٹپ ہوگئے نا —؟"

وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد قمر پھر چیخ رہی تھی۔ اُس نے ڈائل ہٹا کر الگ رکھ دیا۔

چپ بیٹھ قمر —— اب میں کوئی چیخ نئیں سُن سکتا۔ دادرخ بھی وئیں چلا گیا جہاں سلطنتِ آصفیہ کو بچانے کے واسطے سلیم سب کو بھیج کر چلا گیا۔ دارالسلام میں اب قبریت کی کوئی قبر نئیں رہی۔ اب ہر ڈیوڑھی میں ہر بنگلے میں صرف موت کے فرمان ہیں۔ ان سب نوجوانوں کے نام، جن کے ہاتھوں سے زندگی پہ لکھی ہوئی نظمیں چھین لی گئیں۔ وہ تپتی ہوئی دھوپ میں بیٹھے اپنے نصیبوں کی سواری کا انتظار کرتے رہے۔ وہ محبت اور ایثار بیچنے والے بنجارے تھے، جنھیں جگہ جگہ لوٹا گیا۔ وہ حق پہ بولنے والے سقراط تھے جنھیں زہر کے پیالے پلائے گئے۔ وہ سچ بات کہنے والے مسیح تھے جنھیں صلیب پہ چڑھا دیا گیا۔

قمر —— اب تو گھڑی گھڑی گھنٹی بجا کے پپا کو پریشان نکو کر۔ دیکھ نا آج ان کو دل کے دورے پڑ رئیں۔ آج اُنوں زندگی میں پہلی بار پچھتا رئیں۔

وہ کرسی کے ہتھے پہ بیٹھی زور زور سے پیر ہلا رہی تھی۔

ون کا راجہ جھک جھک کر ببتا پیل کے جھاڑوں کو آج کی خبریں سُنا رہا تھا۔ سارے درخت گردن اُٹھائے ہمہ تن گوش تھے دکن زبڑ یوسے سہگل چیخ رہا تھا —— یہ کیسا انیائے ہے داتا۔

نہ جانے کب تک سہگل بھگوان سے انصاف طلب کرتا رہا اور امّی اس کا خوف دور کرنے کے لئے کیا کیا سمجھاتی رہیں۔

قمر —— گوری ماں —— بڑے ماموں جنت —— ہر جگہ فون کر کے وہ ہار گئی مگر کسی نے رسیو نہ کیا۔

پھر اس کی پکی دشمن لیشو آ نے جھنجلا کر فون ملایا تو چاند اپنی سسکیاں نہ روک سکی۔

"لیشو آ جان —— تمہارے کو کوئی بھی ملا تو بولنا کہ ہم لوگاں پاکستان جارئیں۔ ہمارے گھر کو ہمارے نوکراں لوٹ لے رئیں۔"

مگر کیسے —— ؟

پپا ایک لاکھ روپے دے کر ہوائی جہاز کا انتظام کیے۔ بیدر تک کار میں جائیں گے۔

"ٹھہرو جلدی نکو کرو چاند۔ ہم لوگاں اَبی تمھاری مدد کو آتے۔"

آج اس نے ہمیشہ کے لئے فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس گھر سے، اس میز سے بہت دور ہوگئی۔

باہر ہو رہا تھا اور اس کے ساتھیوں کو آج لوٹ کا زرّیں موقع ہاتھ آیا تھا۔

آج اسے بیشو دا نے تسلی دی تھی۔ اس لڑکی نے جس سے وہ زندگی میں آج پہلی اور آخری بار بولی۔

سینڈل پہنتے ہوئے اس نے سوچا کہ پاکٹ بھی اُٹھالے۔ لیکن اس میں کیا کیا رکھا جا سکتا ہے ——!

ہینگری آرٹسٹ نے اُسے کیسی دائمی مسکراہٹ بخشی جو آج بھی غائب نہ ہوئی۔ ایک کونے میں کھڑی وہ چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"باشا جانی، نسوب نمک حراماں، ماما چھوکریاں مبیل کو باہر کا سامان لوٹ لے رئیں ہے" قائم علی گھبرایا ہوا کہہ رہا تھا۔

اس نے کچھ نہ سنا۔ قائم علی کی آواز نہ باہر کی چیخیں اور توڑ پھوڑ کی آوازیں۔ وہ مبہوت سی کھڑی ہوئی تھی۔

"آگ —— آگ ——" قائم علی تھرا کے چیخا۔

"ایک ایک کو مار ڈالوں گی۔ سب کو مزہ چکھاؤں گی۔ کیا سمجھیں میرے کو —— ؟ اتنی پوری قوت سے چیخ رہی تھیں۔

شاہی دور کے سارے بھوئی اور بیرے آج امّی کی ڈانٹ سے لاپروا ہنے، اپنی بجھی بجھی تمنائیں پوری کر رہے تھے۔ یوں جیسے آج ان کے جسموں پر لگے ہوئے چیڑ کے پھر سے لودے اُٹھے ہوں۔

وہ دوڑی ہوئی پپا کے کمرے میں گئی اور بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر سیاہ پردہ منہ پر ڈال لیا۔

پپا —— پپا —— ؟ پردہ پھینک کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

مسہری پہ پھیلے ہوئے بینکوں کے چیک بک اور فائلوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ان کے بیچ میں ایک لکڑی کا قلمدان سینے سے لگائے ہوئے، پپا بڑے تاسف سے کچھ سوچتے رہ گئے تھے۔

"ہتو اپن سات لاکھ کا گھر چھوڑ کو کیسا چلے جائینگے! آپ اتنے شوق سے گھر سجائے نا! میں آپ سے چھپائی جی آپکے انگور میں پھول لاں آگے نا۔ آپ کی اٹلی والی سنگ مرمر کی میز پر خانم علی خراشاں ڈال دیا —— اجی پپا، اب افسوس نکو کرو۔ کیا ایجاں دیوالیے نئیں ہوتے —— ؟"

وہ گیراج کی جانب بڑھی لیکن کار مع نور محمد کے غائب تھی۔

جلدی جلدی بہت سی کلیاں توڑنے کے بعد اس کی اکھڑی ہوئی سانس ٹھیک ہوگئی۔

وہ تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ راستے میں کتنے ہی سپاہیوں نے اس کی گرفتاری کی کوشش کی۔

"یہ حیدرآباد میں کرفیو کی پہلی رات ہے۔ لوگاں گھبرا کے بھاگ جارئیں ہے" پہرہ دار آپس میں کہہ رہے تھے۔

راستے میں ایک موٹر اُسے دھکا دے کر چلی گئی۔ دو گھنٹے بعد اُسے ہوش آئے اور اس نے سر سے بہتا ہوا خون پونچھے بغیر اٹھ کر پھر بھاگنا شروع کیا۔

"ٹھہرو —— ذرا ہی دور پر کسی نے زبردستی اُسے پکڑ لیا۔

"کیوں پکڑ لئے جی میرے کو سنگینا چھوڑ پا دھیا —— !

"جب ایسی بھیانک راتیں آتی ہیں تو میں چاند کو ڈھونڈنے نکلتی ہوں۔ ہم لوگ تمہارے پاس آ رہے تھے"

"اب کاں کا چاند۔ آج تو اماوس کی رات ہے جی۔ اب تو فقط تارے آسمان پہ چمکتیں"

"ارے، رخسار تو بُری طرح زخمی ہوگئی ہے۔ تم اتنی تیزی سے کیسا بھاگ جا رئے تھے —— ! بیشو دا نے تعجب سے پوچھا۔

"میرے کو چھوڑ دو۔ اب میرے پاس کچھ بھی نئیں ہے۔ یہ کلیاں زندہ ہیں، باقی سب مر گئے۔ اب میں بھی سلیم کے پاس چلا جاؤنگا۔

یہ سارے ننگ حراموں کو مزہ چکھا دونگا۔ کیا سمجھ رکھا ہے میرے کو ——؟

"گھبرائیے مت۔ آپ جلدی اچھی ہو جائیں گی"

آنکھیں پھاڑ کے اس نے ازلی پیاسی آنکھیں دیکھیں۔ وہی کھرج دار آواز جس کا آخری سُر مبہم سی سرگوشی میں گم ہو جاتا تھا

جائیے میرے ساتھی آپ کو محفوظ کیمپ میں لے جائینگے"

"شاعر —— تم بھی آؤ نا ——" زبردستی موٹر میں دھکیل جانے پر وہ قطعی تیار نہ تھی۔

"چلی جاؤ بی بی۔ اب میں امن کا سپاہی ہوں۔ شاعر نہیں۔ میں صبح کا انتظار کر رہا ہوں"

کیا یہ رات کی بھی صبح ہوتی —— ! اس نے غیر یقینی انداز میں سوچا۔

یہ موٹر میں کون کون بیٹھا ہے جن کے چہرے نظر نہیں آتے لیکن ان کی ہمدردی، ان کی رفاقت تھامے بیٹھی ہے۔

یہ نہ جانے کونسا چوراہا تھا —— ! یہاں ایک راستے سے صبح آئیگی، جس کا شاعر انتظار کر رہا ہے اور ایک راستے میں رات ملے گی، جہاں میں بھاگا جا رہا ہوں —— وہ حرام کا مصور میرے کو ادھورا کیوں چھوڑ دیا ——؟

ابھی میری سارنگی کے سُراں ٹھپ ہوگئے نا آج ——

آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو گئی۔

گیہوں اور گلاب

خواجہ احمد عباس

اوشا

دھوپ، گرمی، بدن کو جھلسنے والی لو، دوپہر کا عمیق سناٹا جو میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر چھایا ہوا تھا۔ دور ایک کھیت میں ٹریکٹر چل رہا تھا جس کی دھیمی گڑگڑاہٹ فارم پر مسلط خاموشی کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

اوشا نے ایک فلمی رسالے کے رنگین ورقوں کو پلٹتے ہوئے سوچا، میری بھی کیا زندگی ہے، شہر سے پچاس میل دور ویرانے میں یہ دو کمروں کا مکان پھیلے ہوئے کھیتوں کے سمندر میں جیسے ایک ننھا سا جزیرہ ہو، اور پھر کوئی آرام بھی تو میسر نہیں۔ نہ بجلی نہ پنکھے، ریفریجیٹر کا تو ذکر ہی کیا برف تک میسر نہیں، نہ کلب نہ سینما، ایک بیٹری والا ریڈیو جس پر صبح دوپہر شام وہ ریڈیو سیلون سے فلمی گانے سن کر تھوڑی دیر دل بہلا لیتی تھی۔ مگر اس کم بخت بیٹری کو بھی خراب ہونا تھا۔ اگر رمیش آج شہر سے اسے بنوا کر نہ لایا تو دیکھنا کتنا لڑوں گی۔

رمیش! اس کا شوہر، تین برس ان کی شادی کو ہو گئے تھے۔ مگر اس عرصے میں کتنی تبدیلی ہو گئی تھی اس میں، کبھی کبھی تو اوشا کو ایسا لگتا کہ جس رمیش سے اس کی ملاقات نینی تال میں ہوئی تھی اور جس سے اس نے پہلے محبت اور پھر شادی کی تھی وہ کوئی اور رمیش تھا اور یہ گورنمنٹ فارم کا ڈائریکٹر رمیش کوئی اور ہی رمیش ہے۔

تین برس پہلے وہ امریکہ سے اگریکلچر کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ لمبا قد، گھنے چمکیلے بال، چمکیلی آنکھیں، ٹوئیڈ کا کوٹ اور کورڈرائے کی پتلون پہنے بالکل گریگری پیک لگتا تھا۔ نینی تال میں جتنی کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں اس سیزن میں آئی ہوئی تھیں سب ہی تو اس پر لٹو تھیں۔ مگر رمیش کی نظرِ انتخاب اوشا پر پڑی جس نے اسی سال آئی۔ ٹی کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ اوشا کے پتا جی الہ آباد کے مشہور وکیل تھے۔ انہوں نے بھی رمیش کو پسند کیا تھا۔ گو لڑکا غریب خاندان سے تھا مگر ذہین اور ہونہار تھا، گورنمنٹ سکالرشپ پر امریکہ ہو کر آیا تھا اور کسی اچھی نوکری کا امیدوار تھا۔

شادی کے بعد کا ایک سال انہوں نے کتنی ہنسی خوشی سے گزارا تھا، رمیش کو اتر سرکار کی اگریکلچر ڈپارٹمنٹ میں اچھی نوکری مل گئی پانچ سو روپے مہینہ، رہنے کو بنگلہ، لکھنؤ کی رنگین زندگی، حضرت گنج کی رونق اور گہما گہمی، راج بھون کی گارڈن پارٹیاں، اونچے سرکاری حلقوں میں میل جول۔

کالج کے زمانے سے ہی اوشا کی لکھنؤ میں کافی جان پہچان تھی۔ اب تو مسز رمیش چند کی حیثیت سے وہ لکھنؤ سوسائٹی کی سب سے مقبول اور ممتاز ہستیوں میں شمار کی جانے لگی۔

لکھنؤ میں اوشا کو زندگی کی سب دلچسپیاں میسر تھیں۔ بنگلے کو اس نے بڑے سلیقے اور اہتمام سے سجایا تھا۔ اپنی نگرانی میں باغ لگوایا تھا۔ کتنا خوب صورت تھا، ان کے لکھنؤ والے خصوصاً گلاب کے پودے جو اوشا نے خود بوئے تھے اور جن کو اس نے مہینوں اپنے ہاتھ سے پانی دیا تھا۔ کتنی محنت اور محبت سے اس نے ان پودوں کو پروان چڑھایا تھا اور جس دن گلاب کا پہلا پھول کھلا تھا اس دن اوشا کو کتنی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ بڑی احتیاط سے پھول توڑ کر دن بھر پانی میں رکھا۔ شام کو رمیش کے آنے سے پہلے بڑے اہتمام سے سنگار کیا، گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی باندھی، بال بنا کر جوڑے میں وہی گلاب کا پھول سجایا۔ مگر اوشا کی دن بھر کی خوشی خاک میں مل گئی، جب رمیش دفتر سے لوٹا اور اس نے جوڑے میں سجے ہوئے پھول کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ مایوسی کا وہ لمحہ آج دو برس بعد بھی ایک خلش کی طرح اوشا کی یاد میں چبھ رہا تھا۔

"کیوں جی.... " اور اوشا کو امید تھی کہ اتنا کہنا ہی کافی ہے۔ رمیش کی نظر ضرور بالوں میں لگے ہوئے پھول کی طرف جائے گی۔

"کہو کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کیوں کچھ کہنا تو چاہتی تھیں؟"

"تو بتاؤ میں آج کیسی لگ رہی ہوں؟"

"جیسی ہمیشہ لگتی ہو...... بہت خوبصورت۔"

"بس رہنے دو۔ تمہاری تو نظر ہی بدل گئی ہے۔"

"مطلب؟"

اس کے جواب میں اوشا نے رونا شروع کر دیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "مطلب یہ کہ تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔"

رمیش ایک لمحے کے لئے تو یہ الزام سن کر پریشان ہوا مگر پھر مسکرا کر بولا "پاگل ہو گئی ہو کیا؟ ..... یا کسی سکنڈل منگر نے تمہارے کان بھرے ہیں؟ آخر یہ خیال تمہیں پیدا کیسے ہوا کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی؟"

"تو پھر اب تم میرا نوٹس کیوں نہیں لیتے؟ یاد ہے نینی تال میں جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو شادی سے پہلے تم میری ہر بات کا نوٹس لیتے تھے۔ اب تو تم کبھی دیکھتے ہی نہیں کہ میں کون سی ساڑھی پہنے ہوئے ہوں یا میں نے کون سی خوشبو لگائی ہے یا میرے بالوں میں کون سا پھول لگا ہوا ہے۔"

اب پہلی بار رمیش کی نظر اوشا کے جوڑے پر پڑی اور اس نے پھول کو سونگھنے کے بہانے چومتے ہوئے کہا "اوہو اس گلاب کی وجہ سے ہم پر ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ اچھا ابھی ہم اس پھول کی شان میں ایک پورا قصیدہ پڑھ دیتے ہیں۔ تمہارے بالوں میں یہ گلاب ایسا لگتا ہے جیسے کالے بادلوں میں سے سورج جھانک رہا ہو یا اندھیری رات میں گاؤں کے باہر الاؤ جل رہا ہو......"

"بس رہنے دو مذاق۔" اوشا نے آنسو پونچھ کر اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔

اور ان کی ازدواجی زندگی کا یہ پہلا حادثہ بخیر و خوبی گذر گیا مگر اوشا کے دل میں ایک عجیب سی بے اطمینانی اور عجیب سی چبھن رہ گئی۔ یہ بے اطمینانی اور بھی گہری ہوتی گئی، جب رمیش نے دفتر کے اوقات کے بعد بھی یونیورسٹی کی لیباریٹری میں ریسرچ کے لئے جانا شروع کر دیا۔

"صبح سے شام تک تو دفتر میں سر کھپاتے ہو، سمجھ میں نہیں آتا تمہیں ریسرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" اوشا نے چھوٹتے ہی کہا۔ جب رمیش نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"یہ دفتری کام تو میں مجبوری سے کرتا ہوں اوشا، صرف اپنا اور تمہارا پیٹ پالنے کے لئے" ورنہ ہمیشہ سے میرا ارادہ زراعت کے مختلف مسئلوں پر ریسرچ کرنے کا ہی تھا۔ شام کو بیکار بیٹھنے سے بہتر ہے کہ میں کچھ دیر لیبارٹری میں گذار آیا کروں۔"

"تو یہ ریسرچ کرنے سے کیا تمہاری تنخواہ بڑھ جائے گی؟"

"نہیں میری تنخواہ تو نہیں بڑھے گی مگر ہو سکتا ہے ہمارے سارے دیش کی گیہوں کی پیداوار بڑھ جائے۔ کیونکہ گیہوں کے پودوں کو جو کیڑے کھاتے ہیں ان کی روک تھام کے لئے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بڑے دیش سیوک آئے کہیں کے! میں پوچھتی ہوں دیش نے تمہارے لئے کیا کیا ہے؟ امریکہ سے اتنی بڑی ڈگری لے کر آئے ہو اور اس پر صرف پانچ سو روپے کی نوکری ملی ہے۔" اوشا کی بے اطمینانی میں یہ حسرت بھی شامل تھی کہ اس کے شوہر کی تنخواہ ہزار یا پندرہ سو کیوں نہیں ہے؟

"تم سے کس نے کہا کہ میں امریکہ سے اتنی بڑی ڈگری لے کر آیا ہوں؟ سچ پوچھو تو میں نے دو برس پردیس میں رہ کر جھک مارا، وہاں کے حالات یہاں سے اتنے مختلف ہیں کہ وہاں کی زراعتی تعلیم عملی طور پر ہمارے کسی کام کی نہیں۔ دوسرے یہ کہ پانچ سو روپے کچھ کم نہیں ہوتے مجھے تو شکایت صرف یہ ہے کہ مجھے ایک دفتر میں کرسی پر سجا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کسی فارم پر مجھے عملی کام کرنے کا موقع دیا جاتا۔"

اوشا نے روٹھی ہو کر کہا "تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم شام کو دفتر سے لیبارٹری چلے جایا کرو اور میں گھر میں بیٹھی تمہارا انتظار کیا کروں نہ کلب جاؤں نہ سینما نہ کسی سے ملنے......"

"یہ کس نے کہا ہے کہ تم گھر میں بیٹھی رہا کرو۔ تم کلب بھی جا سکتی ہو۔ اپنی سہیلیوں کے ہاں بھی جا سکتی ہو اور جب جی چاہے ان کے ساتھ سینما بھی۔ منع کس نے کیا ہے؟"

اس دن سے یہ معمول ہو گیا کہ رمیش دفتر سے سیدھا یونیورسٹی چلا جاتا اور اوشا وقت کاٹنے کے لئے کوئی نہ کوئی فلم دیکھنے چلی جاتی۔ رات کو کھانے پر ملاقات ہوتی تو رمیش کہتا "بڑی ہمت ہے تمہاری، نہ جانے کیسے تم ہر روز ایک فلم دیکھتی ہو۔ میری آنکھیں تو کبھی اتنا سٹرین نہ برداشت کر سکیں۔" واقعہ بھی یہ تھا کہ اپنی دبیز شیشوں کی عینک کے باوجود رمیش کو سینما کے پردے پر تصویریں دھندلی ہی نظر آتی تھیں اور اس لئے جہاں تک ہو تا وہ سینما جانے سے کتراتا تھا۔ مگر اوشا کہتی "واہ میرا بس چلے تو دن میں دو دو فلم دیکھا کروں۔ سچ کہتی ہوں تم دیپ کمار کی نئی فلم "آوارہ شہزادہ" دیکھو تو زخم ہو جاؤ۔"

"یہ زخم کیسے ہوتے ہیں؟"

"مطلب یہ کہ وہ اتنا ہینڈسم ہے کہ دیکھنے والے کا دم زخم سے نکل جائے۔ یہ ہمارے کالج کا محاورہ ہے۔"

"تمہارے کالج میں انگریزی، ہندی، تاریخ، جغرافیہ کے علاوہ فلم سٹاروں پر زخم ہونا بھی سکھایا جاتا ہے۔"

مگر اوشا پر اس طنز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی جوش و خروش کے ساتھ دیپ کمار اور اس کی فلموں کی تعریف کرتی رہی۔ "اس وقت اس کے مقابلے کا ایک بھی ایکٹر نہیں ہے۔ رومینٹک سین تو ایسے کرتا ہے کہ کیا کوئی ہالی وڈ کا سٹار بھی کرے گا؟ اور پھر جیسا اچھا ایکٹر ہے ویسا ہی ڈائریکٹر بھی۔ "آوارہ شہزادہ" میں اس نے کیا کام کیا ہے؟ واہ واہ! ایک ہی فلم میں چار چار میک اپ بدلے ہیں۔ شہزادہ، بھکاری،

داڑھی والا سکھ ٹیکسی ڈرائیور بن کر ایسی پنجابی بولتا ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ اور تو اور ایک سین میں گوالن کا بھیس بدلتا ہے اتنی اچھی عورت کی ایکٹنگ کی ہے کہ پہلے تو کوئی پہچانتا ہی نہیں جب دوسرا بھیس بدلنے کے لئے نقلی لمبے بالوں کی وگ اتارتا ہے تب پتہ لگتا ہے کہ ارے یہ تو وہی شہزادہ ہے۔ سچ کہتی ہوں گو ان کے بھیس میں اتنا خوبصورت لگتا ہے کہ تم بھی دیکھو تو عاشق ہو جاؤ۔"

رمیش نے ہنس کر کہا "ہم تو اسے بن دیکھے ہی عاشق ہونے کو تیار ہیں۔ اس لئے کہ جو اس پر عاشق ہے ہم اس پر عاشق ہیں۔"

ان دونوں میں اس قسم کے مذاق اکثر چلا کرتے تھے اور اب تک نہ کسی نے بُرا مانا تھا نہ غلط فہمی پیدا ہوئی تھی۔ سو اوشا نے کہا "تم اپنی لیبارٹری کی خبر سناؤ۔ سُنا ہے وہاں ایم۔ ایس۔ سی کی کتنی خوبصورت لڑکیاں بھی ریسرچ کرنے آتی ہیں۔ اسی لئے تم روز کام کا بہانہ کر کے جاتے ہو؟"

رمیش ہنس کر بولا "ہے تو کچھ ایسی ہی بات۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ مجھے منہ نہیں لگاتیں۔ میں سوچتا ہوں وہاں تو اپنی دال گلی نہیں۔ اب گھر ہی ریسرچ کیا کروں۔"

"گھر پر؟ کیا یہاں لیبارٹری بناؤ گے؟"

"لیبارٹری بھی ایک چھوٹی موٹی بنا لیں گے۔ مگر دراصل مجھے بعض نئی قسم کے گیہوں کے بیجوں پر ریسرچ کرنی ہے۔ اس کے لئے یا تو دس میل دُور یونیورسٹی کی فارم پر جاؤں جو میرے لئے مشکل ہے۔ یا اپنے ہی بنگلے پر میں ایک چھوٹا سا فارم بنا لوں۔"

"مگر ہمارے ہاں اتنی جگہ ہی کہاں ہے؟ مشکل سے تین چار کیاریاں تو ہیں اپنے باغ میں۔"

"اتنی جگہ بھی کافی ہے۔ اگر ہم ان سب کیاریوں کو توڑ کر ہل چلوا دیں تو گیہوں بو سکتے ہیں۔ تجربے کے لئے تھوڑی سی فصل بھی ہو جائے تو اپنا کام چل جائے گا۔"

اوشا نے تنک کر کہا "نا بابا! میں اپنی کیاریوں میں ہل نہیں چلنے دوں گی۔ یہ خوب ہے کہ میرے اتنے خوبصورت گلاب کے پودوں کو اُجاڑ کر تم وہاں گیہوں کی کاشت کرو۔ کھیتی باڑی کرنی ہے تو کوئی اور جگہ تلاش کرو۔"

اور رمیش نے دفعتاً سنجیدہ ہو کر کہا "تو پھر کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔"

اگلے ہفتے دفتر سے شام کو لوٹ کر رمیش نے اوشا کو خبر سنائی کہ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ مگر اب اسے لکھنؤ سکریٹریٹ کو چھوڑ کر بریلی کے قریب گورنمنٹ کے ایک تجرباتی فارم کو سنبھالنا ہو گا۔

اور اب ڈیڑھ برس سے وہ تھے اور یہ فارم تھا۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت، ٹریکٹروں کی غیر شاعرانہ گڑگڑاہٹ، گرمی میں لُو جاڑے میں پہاڑوں کی طرف سے آتی ہوئی برفیلی ہوائیں۔ برسات میں ہر طرف پانی ہی پانی، سڑکیں بالکل ہی بند ہو جاتیں اور ان کا چھوٹا سا گھر ایک جزیرہ بن جاتا۔ ویسے بھی اوشا کو اکثر یہی محسوس ہوتا تھا کہ رمیش نے اسے تنگ کرنے کے لئے ایک غیر آباد جزیرے پر لا کر قید کر دیا ہے۔ یوں تو فارم پر کئی سو کسان، مزدور، ٹریکٹر ڈرائیور اور ٹرک چلانے والے کام کرتے تھے جو آدھے میل کے فاصلے پر گاؤں میں رہتے تھے۔ لیکن اوشا کی نفاست پسند طبیعت ان کو لکھنؤ کی سوسائٹی کا نعم البدل تسلیم کرنے سے انکار کرتی تھی۔ ایک بار ہولی کے موقع پر رمیش اسے گاؤں لے گیا۔ رات کو فارم کے سارے سٹاف نے مل کر جلسہ کیا، دیہاتی گانے گائے، دیہاتی ناچ ناچے، مٹھائی تقسیم کی۔ رمیش نے سوچا تھا کہ اکیلے رہتے رہتے اوشا اکتا گئی ہے، اس جلسے میں شرکت کر کے اس کی طبیعت بہل جائے گی۔ مگر جو فلمی گانوں اور فلمی ناچوں کی دلدادہ تھی اسے ان بھدے ناچ گانوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ تین گھنٹے تک کرسی پر بیٹھی وہ غیر متعلق انداز میں اکتاہٹ کے ساتھ پروگرام دیکھتی رہی۔ اختتام پر رمیش کو اور اسے ہار پہنائے گئے۔ مگر یہ ہار گلاب کے پھولوں سے نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان میں گیہوں کی بالیں پروئی ہوئی تھیں، اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور نے گھبراہٹ کے مارے ہکلاتے ہوئے کہا "ہم اپنے ڈائرکٹر صاحب اور ان کی

شرتی جی کو گلاب کے پھولوں کی جگہ گیہوں کی بالوں کے ہار پہنا رہے ہیں۔ کیوں کہ ہم کسانوں کے لئے تو گیہوں میں ہی سارے جہاں کی خوبصورتی ہے، خوشبو ہے، خوش حالی ہے، گیہوں ہی ہیں ہماری زندگی ہے۔" اپنے گنوارو لہجے میں اس نے ہر لفظ کا تلفظ بگاڑ کر ادا کیا تھا۔ کھوب سورتی، کھس بو، کھس حالی، جندگی...... اوشا نے گھر پہنچتے ہی اس گندمی ہار کو جس کی کانٹے دار بالوں سے اس کی نازک گوری گردن پر خراشیں پڑ گئی تھیں اتار پھینکا جیسے وہ اس کے ساتھ فارم کی ساری خشک اور غیر شاعرانہ زندگی ہی کو گلے سے اتار کر پھینک رہی ہو۔

گیہوں، گیہوں، گیہوں۔ رمیش کے ساتھ رہ کر اوشا کو اس لفظ سے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ صبح اٹھو تو گیہوں کا ذکر، کھانے پر گیہوں کا ذکر، ٹہلنے جاؤ تو گیہوں کے کھیتوں میں، ہر قدم پر رمیش کو کوئی "گندمی" مسئلہ یاد آ جاتا۔ "دیکھو اوشا یہ گیہوں کی ایک نئی قسم ہے جو میں نے اگائی ہے۔ اس کا دانہ سُرخ اور سخت ہوتا ہے، اسے رسٹ کی بیماری نہیں لگ سکتی؟" یا "دیکھو اوشا یہ روسی نسل کا گیہوں ہے اور اسی کے برابر کے کھیت میں یہ امریکی نسل کا گیہوں، دونوں پنج شیلا کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ایک ہی فارم پر برابر برابر اُگ رہے ہیں۔ اب میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان دونوں کے میل سے گیہوں کی ایک نئی قسم اُگاؤں جس میں امریکی گیہوں کی طرح دانہ بڑا نکلے گا اور روسی گیہوں کی طرح گرمی، سردی ہر قسم کا موسم برداشت کرنے کی طاقت ہوگی۔ میں سوچتا ہوں اس نئی قسم کا نام رکھوں گا "شانتی گیہوں" کیوں کیسی رہی؟"

اور اوشا جل کر کہتی: "گیہوں، گیہوں، گیہوں...... تمہارے لئے دنیا میں اور کوئی بات ہی نہیں رہی۔ تم تو مجھے بھی گیہوں کا ایک دانہ ہی سمجھتے ہو۔"

"بے شک" رمیش ہنس کر کہتا "تم میں اور گیہوں کے دانے میں بڑی مشابہت ہے...... گیہوں کے دانے میں انسان کی زندگی ہے...

اور تم...... میری جان ہو۔"

"بس رہنے دو، جھوٹی خوشامد کوئی تم سے سیکھ لے۔ کب سے کہہ رہی ہوں کہ دہلی جاؤ تو وہاں کسی کے باغ میں سے گلاب کی قلمیں لیتے آؤ میں بنگلے کے سامنے پھولوں کا باغ بناؤں گی۔ مگر تمہیں کبھی یاد ہی نہیں رہتا۔"

اور ایک بار پھر رمیش وعدہ کر لیتا کہ اس بار وہ دہلی جائے گا تو گلاب کے پودے ضرور لائے گا۔ مگر اگلی بار پھر بھول جاتا، اور ایک بار پھر وہ ایک نیا وعدہ کر لیتا اور اوشا کی طبیعت گلاب کے پھولوں کے لئے اسی طرح تڑپتی رہتی جیسے بن اولادی عورت کی ممتا بچے کو گود میں کھلانے کے لئے تڑپتی ہے......

گلاب کے پھول! سُرخ، مخملی گلاب، منی منی گلابی کلیاں، ادھ کھلے غنچے، جیسے ننھے ننھے ہمکتے بچے ماں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہوں۔ ایسا لگتا تھا اوشا کی ساری آرزوئیں سمٹ کر فلمی رسالے کے سرورق کی اس رنگین تصویر میں آ گئی ہیں۔ نیچے لکھا تھا "فلم سٹار دیپ کمار کے باغ کا ایک منظر دیپ کمار پھولوں کا بہت دلدادہ ہے اور اس کے گھر کے گرد باغ میں بارہ قسم کے گلاب کھلے ہوئے ہیں۔ دیپ کمار کے گھر کی باقی تصویریں اندر دیکھئے۔"

اندر دو صفحوں پر دیپ کمار کے مکان، اوشا دیپ کی رنگین تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں پیلے پھولدار پردے، نیلے صوفوں پر رنگ برنگے کشن، دیوار پر ایک مشہور آرٹسٹ کی بنائی ہوئی پینٹنگ، ریڈیوگرام کے اوپر نٹراج کا بت، ڈائننگ روم میں ریفریجریٹر کے اوپر گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا گلدان، بیڈ روم کی کھڑکی میں سے گلاب کی جھاڑیاں سر اٹھائے جھانکتی ہوئی۔ کتنا شاعرانہ، حسن پرور ماحول ہے اس گھر کا۔ اوشا نے سوچا — اور ایک ہمارا گھر ہے جدھر دیکھو گیہوں کی بالیں، بدبودار کھاد کے نمونے، صوفوں کے بجائے مونڈھے، سپرنگ دار مسہریوں کے بجائے رسی سے بنے ہوئے پلنگ، ریفریجریٹر کے بجائے گھڑا، ریڈیوگرام کے بجائے ہینڈل گھما کر چلنے والا گراموفون اور بیٹری کا ریڈیو جس کی بیٹری ہمیشہ ہی بگڑی رہتی ہے۔ "سچ کہتی ہوں اگر آج بھی بیٹری نہ بنوا کر لائے تو......"

دور سے جیپ کے کرخت ہارن کی آواز آئی اور اوشا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، رمیش کے استقبال کے لئے پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی

اور ساڑھی کا پلّو سنبھالتی ہوئی برآمدے کی طرف دوڑی۔ رمیش کے ساتھ ڈاک بھی آئی ہوگی۔ اسے کئی فلمی رسالوں کا انتظار تھا۔

کھیتوں کے بیچ میں سے کچی سڑک پر دھول کے بادل اڑاتی جیپ آئی اور دفعتاً بریک کی آواز کے ساتھ ٹھہر گئی۔ رمیش کے برابر کی سیٹ پر ڈاک کا پلندا تھا۔ اوشا برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دوڑی۔

"ارے ..... رے کیا کرتی ہو؟ اتنی دھوپ میں ننگے سر دوڑی چلی آرہی ہو۔ لُو لگ جائے گی۔" رمیش جیپ سے اترتے ہوئے چلّایا۔ "چلو اندر۔ ورنہ کوئی فلمی رسالہ نہیں ملے گا۔"

رمیش حسبِ معمول خاکی نیکر، خاکی قمیص، ہیٹ اور پٹھانی چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس کے گھنے بالوں میں راستے کی گرد اٹی ہوئی تھی۔ پسینے سے قمیص بھیگی ہوئی تھی۔

وہ صبح سویرے ہی شہر روانہ ہو گیا تھا اس لئے شیو نہیں کیا تھا اور داڑھی کے سخت سیاہ بالوں کی کھونٹیاں نکلی ہوئی تھیں۔

"پہلے یہ بتاؤ میری سب چیزیں لائے ہو یا نہیں؟" اوشا نے برآمدے میں ٹھٹک کر کہا۔

"سب کچھ لایا ہوں۔" رمیش نے اپنا ہیٹ اوشا کے سر پر رکھتے ہوئے کہا اور جیپ میں سے سامان اتارنے لگا۔

"بیٹری ٹھیک ہو گئی ہے؟"

"بالکل ——— یہ لو ——— اب تم ریڈیو سیلون کی سب بکواس سُن سکتی ہو۔"

"اور وہ کولڈ کریم؟"

"کولڈ کریم بھی ہے مگر راستے میں گرم ہو کر تیل بن گیا ہو تو میں ذمہ دار نہیں۔"

"اور میرے لئے اور کیا لائے ہو؟"

"اور کچھ نہیں سوائے تمہارے رسالوں اور کچھ میری کام کی چیزوں کے، گیہوں اور دھان اور ترکاریوں کے بیج ہیں اور کچھ پودوں کی قلمیں ہیں۔"

"یہ نہ ہوا کہ میرے لئے گلاب کی قلمیں بھی لے آتے۔" اوشا ٹھنک کر بولی۔

"ان کی تم فکر نہ کرو۔ ایک دن جادو سے میں گلاب کے پھول تمہارے باغ میں کھلا دوں گا ——— اچھا اب اندر آؤ، مجھے تمہیں ایک ضروری بات بتانی ہے۔"

رمیش نے قمیص اتاری۔ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر تولیہ لئے باہر آیا اور ڈاک کے پلندے میں سے ایک خط نکال کر اوشا کی طرف بڑھایا۔

"بھئی یہ پڑھو۔ بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ ایک فلم کمپنی یہاں فارم پر شوٹنگ کرنے کے لئے آنے والی ہے اور ہمیں ان کی مہمان داری کرنی پڑے گی۔ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ ان کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ کیونکہ سرکاری پالیسی یہی ہے کہ ایسے پروڈیوسروں کی مدد کی جائے جو پروجیکٹس وغیرہ کے بارے میں فلمیں بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے تو ٹریولوگ پروگرام معلوم ہوتا ہے۔ کام کا بھی ہرج ہوگا سو الگ۔ مگر تم تو ضرور خوش ہو گی۔"

"چھوڑو جی۔" اوشا نے بددلی سے کاغذ لفافے سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "کوئی نیوز ریل والے ہوں گے، موٹے کالے کیمرہ مین، جو ٹریکٹروں اور ہلوں کی ہر زاویے سے تصویریں لے کر چل دیں گے۔"

"کمپنی کا نام تو پڑھو۔" رمیش نے شرارت سے کہا۔ "دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"

"دیپ کمار پروڈکشنز اپنے فلم "نیا ہندوستان" کی شوٹنگ کرنے! اس کا مطلب ہے کہ ....."

"تمہارے محبوب اداکار، ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور نہ جانے کیا کیا الابلا، مسٹر دیپ کمار بذاتِ خود جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔"

اور اوشا نے رمیش کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا: "سچ رمیش! تب تو بڑا مزا آئے گا۔ مگر میرے پاس تو کوئی ڈھنگ کی ساڑھی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ آئیں گے تو میں پہنوں گی کیا؟"

دیپ

"ہاں تو مسٹر دیپ کمار اس وقت آپ اپنے کون سے فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کرنے جا رہے ہیں؟"

"نیا ہندوستان۔"

"اس فلم کے بارے میں آپ ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"ضرور۔ اس فلم میں ہم ان تبدیلیوں کو دکھانا چاہتے ہیں جو ہندوستانی سماج میں آزادی کے بعد ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور کھیتی باڑی کرتی ہے۔ اس لئے فلم کا پس منظر ہے ایک ماڈل فارم جہاں ہیرو کسانوں کو زراعت کے نئے طریقے سکھاتا ہے۔ دراصل میں کئی برس سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے بیشتر فلموں کا ماحول اور کردار پرانے ہو چکے ہیں۔ ان کا تعلق آج کے ہندوستان سے، آج کے سماجی اور نفسیاتی ماحول اور مسائل سے بالکل نہیں ہے، ان فلموں کو دیکھنے سے تو ایسا لگتا ہے، جیسے ہم ابھی تک انیسویں بلکہ اٹھارھویں صدی میں رہ رہے ہوں۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسے کردار کسی صدی میں بھی وجود نہیں رکھتے تھے۔"

"جیسے آپ کا فلم 'آوارہ شہزادہ'، جس میں ہیرو ایک ٹین کی تلوار سے ایک درجن سپاہیوں کو گرا دیتا ہے اور ہیروئن جو ایک چرواہے کی بیٹی ہے، ہر سین میں ایک نیا ریشمی لباس پہنے نظر آتی ہے۔"

"آوارہ شہزادہ کو REALISM کی کسوٹی پر پرکھنا ایک غلطی ہوگی۔ یہ ایک تفریحی فلم تھا جو عوام کو ہنسانے اور ان کا دل خوش کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ پبلک کا دل بہلانا ہی تو آرٹسٹ کا اولین فرض ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ 'آوارہ شہزادہ' جیسے فلم نئے ہندوستان کی تشکیل اور ترقی میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ صرف آوارہ شہزادہ کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگا ہے اس کا حساب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس فلم نے گورنمنٹ کو ایک کروڑ روپیہ دیا ہے، یہ روپیہ کہاں جائے گا؟ نہریں، سڑکیں، ڈیم اور بجلی گھر بنانے میں خرچ ہوگا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "آوارہ شہزادہ" جیسے فلم کتنے اہم اور ضروری ہیں۔"

"سنا ہے 'آوارہ شہزادہ' سے آپ کو بھی چالیس پچاس لاکھ روپے کا منافع ہوا ہے۔"

"ہوا ہوگا شاید۔ روپے آنے پائی کا حساب میرے اکاؤنٹنٹ جانتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ میں کوئی فلم روپیہ کمانے کے لئے نہیں بناتا۔ میرا مقصد تو صرف آرٹ کی خدمت کرنا ہے اور آرٹ کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کرنا....."

"جی ہاں اس میں کیا شک ہے!"

یہ انٹرویو بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر فرنٹیئر میل کے ایرکنڈیشنڈ درجے کے سامنے ہو رہا تھا۔ دیپ کمار پروڈکشنز کے عملے کے باقی لوگ اپنے اپنے ڈبوں میں بیٹھ چکے تھے۔ ہیروئن الکا رانی اور اس کی اینگلو انڈین ہیئر ڈریسر جولیا ایک ایرکنڈیشنڈ کمپے میں، کیمرہ مین بھاسکر اور ساؤنڈ انجینئر ڈیسائی سیکنڈ کلاس میں، اسسٹنٹ ڈائریکٹر وغیرہ انٹر میں اور باقی ملازمین تھرڈ کلاس میں۔ صرف دیپ کمار جرنلسٹوں اور تماش بینوں کی بھیڑ میں گھرا ہوا پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ مگر جب اس کے سیکرٹری دمن راؤ نے آ کر اسے یاد دلایا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں تو دیپ کمار نے بڑے اہتمام سے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے سب سے اجازت چاہی۔

"اچھا تو بھائی لوگو اب اجازت۔ کچھ اور لوگوں کو بھی رخصت کرنا ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ اپنے ریزرو کوپے میں داخل ہوا اور دروازہ بند ہو گیا۔

"کیوں پارو کہو کیا ارادہ ہے؟ چلتی ہو؟ ٹکٹ کی کوئی فکر نہیں۔ کیونکہ اس پورے کوپے پر قبضہ کرنے کے لئے میں نے پہلے ہی دو ٹکٹ خریدے ہوئے ہیں۔ رہے کپڑے تو دہلی میں خرید لینا؟"

"نہیں جی۔ تم جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں گی تو لوگ نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ دیکھتے نہیں کتنے جرنلسٹ باہر کھڑے ہیں۔"

"کہیں گے کیا؟ کیا میاں بیوی کا ساتھ سفر کرنا جرم ہے؟"

"عام لوگوں کے لئے نہیں ہے مگر تمہارے جیسے فلم سٹار کوئی معمولی لوگ تھوڑا ہی ہیں۔ ذرا سوچو تو راستے میں ہر سٹیشن پر جب تمہارے چاہنے والوں کی بھیڑ لگے گی اور اسکول و کالج کی لڑکیاں اپنی کلاسیں چھوڑ کر تمہارے درشن کرنے آئیں گی تب اگر انہوں نے دیکھا کہ ان کا چہیتا دیپ اپنی بیاہتا بیوی کے ساتھ سفر کر رہا ہے تو ان کو کتنی مایوسی ہوگی؟ ایسی باتوں سے تمہاری مقبولیت کو کافی دھچکا لگ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری اگلی پکچر فیل ہو جائے۔ ایک بات یاد رکھو کہ فلم سٹار کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ لاکھوں لڑکیاں من ہی من میں اسے اپنا چاہنے والا تصور کرتی ہیں۔ بیوی جیسی غیر رومانی ہستی ان کے رومانی تصورات کو چکنا چور کر دے گی۔ اس لئے میرا نہیں رہنا بہتر ہے۔"

دیپ کو معلوم تھا کہ پاروتی جو کہہ رہی ہے ٹھیک ہی کہہ رہی ہے لیکن جس انداز سے وہ کہہ رہی تھی اس میں اسے طنز کی ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی وہ پاروتی سے شادی کے پانچ سال بعد بھی ویسی ہی محبت کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس سے ویسی ہی شدید محبت کرتی ہے، لیکن اسے شبہ یہ تھا (اور یہ شبہ اب یقین میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا) کہ وہ عظیم فنکار دیپ کمار کا رعب بالکل نہیں مانتی بلکہ شاید اس کی عزت بھی نہیں کرتی اکثر دیپ کو یہ محسوس ہوتا کہ پاروتی دل ہی دل میں اس پر ہنس رہی ہے۔ اس کے عظیم فنکارانہ پوز کا مذاق اڑا رہی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتی جیسے بزرگ، بچوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یا عقلمند کم عقلوں کے ساتھ۔ اور اس وقت دیپ کو اپنی زندگی میں ایک عمیق خلا کا احساس ہوتا، جیسے اپنی بے انتہا دولت کے باوجود وہ کنگال ہو، جیسے اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود وہ گمنام اور غیر معروف ہو اور باوجود اس کے کہ فلمی حلقوں میں اسے GENIUS سمجھا جاتا تھا وہ جاہل اور بے وقوف ہو، بات یہ تھی کہ پاروتی کے سامنے دیپ کو احساس کمتری رہتا تھا۔ وہ اس کی فلموں کی ہر ہیروئن سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کا باپ بمبئی کا ایک مشہور اور مالدار سالسٹر تھا جبکہ دیپ کا باپ دو سال پہلے تک دہلی کے چاندنی چوک میں گھڑیوں کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا) اس نے انگلش لٹریچر میں ایم۔اے کیا تھا جبکہ دیپ کی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک تھی۔ وہ باپ کے ساتھ یورپ گھوم آئی تھی اور پیرس کے لوورے میوزیم، روم کے سینٹ پال گرجا، لندن کے ہائڈ پارک کی باتیں ایسی لاپروائی سے کیا کرتی جیسے کوئی بمبئی والا دادر، ماہم یا کالا دیوی کا ذکر کر رہا ہو۔ جبکہ دیپ بمبئی اور دہلی کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی تیسرے بڑے شہر سے بھی ناواقف تھا۔ فلمی رسالوں میں مضمون چھپتے (جن میں سے اکثر دیپ کے اپنے پبلسٹی منیجر کے لکھے ہوئے ہوتے تھے) کہ دیپ کمار کی اداکاری میں دلیپ کمار کی سنجیدگی اور راج کپور کی شوخی کا ایک انوکھا امتزاج ہے۔ اس کی ایکٹنگ کا مقابلہ کلارک گیبل اور جیمز سٹورٹ سے کیا جاتا لیکن جب وہ گھر پر آتا تو پاروتی لارنس اولیویر یا چارلس بوئر کے فن کا ذکر اس انداز میں کرتی کہ ان کے مقابلے میں دیپ اپنے آپ کو ہیچ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کی فلم "چال غبارہ" کی تعریف میں اخباروں نے کالم کے کالم لکھ ڈالے اور دیپ کمار کو حقیقت نگاری کا ماہر کہا جانے لگا۔ لیکن پاروتی نے صرف اتنا کہا "تم کیوں اٹالین فلموں کی نقل میں اپنا دیوالہ نکالنا چاہتے ہو؟"

اس کی فلم "آوارہ شہزادہ" نے کئی برس کے ریکارڈ توڑ ڈالے لیکن اپنی بیوی کی زبان سے اس نے تعریف کا ایک لفظ نہ سنا، سوائے اس کے کہ "چلو اچھا ہے تمہارے پچھلے قرضے تو اتر جائیں گے۔"

مگر اب "نیا ہندوستان" فلم بنا کر دیپ کو یقین تھا کہ وہ پاروتی کو بھی ایک بار اپنے آرٹ کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر سکے گا۔

اس فلم سے وہ فلمی دنیا میں انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا۔ سماج کے لیڈروں، منسٹروں اور گورنمنٹ کے افسروں کو دکھانا چاہتا تھا کہ کس طرح فلم سے ساری قوم کو بیدار کیا جا سکتا ہے اور عوام کو نئے اور ترقی پسند خیالات سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ یہ فلم وہ ایک نئے ڈھنگ سے بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس میں زیادہ آؤٹ ڈور شوٹنگ ہوگی۔ ایکسٹراز کے بجائے سچ مچ کے کسان مزدور کام کریں گے گورنمنٹ سے خط و کتابت کے بعد اس نے ایک سرکاری ماڈل فارم پر شوٹنگ کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی اس لئے وہ چاہتا تھا کہ اس سفر میں پاروتی بھی اس کے ساتھ ہو اور ایک بار اس کو بھی یقین ہو جائے کہ اس کا شوہر ایک گھٹیا فلم ایکٹر اور تجارتی فلم پروڈیوسر نہیں ہے بلکہ ایک مخلص اور بلند تخیل فنکار ہے۔ مگر پاروتی نہ مانی۔ اس نے کہا کہ میں جاؤں گی تو بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا اور اس گرمی میں میں بچوں کو اتنے لمبے سفر پہ لے جانا نہیں چاہتی۔

"اچھا تو پارو اب تم اترو" دیپ نے کہا جب گاڑی کی سیٹی سنائی دی "جونیر اور جمو کو پیار کہنا اور ہر روز اپنی اور بچوں کی خیریت کا تار بھیجتی رہنا۔"

"اور تم بھی اپنا خیال رکھنا" پاروتی نے اٹھتے ہوئے کہا "دھوپ میں شوٹنگ کرو تو ہیٹ برابر سر پر رکھنا اور نیبو کا شربت پیتے رہنا ایسا نہ ہو لو لگ جائے" پھر پیار سے زیادہ ممتا بھرے انداز میں اس نے دیپ کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ہلکے سے اس کے گال کو ایک تھپکی دی اور دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی اور دیپ کو ایک لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بچہ ماں سے پہلی بار جدا ہو کر دور دراز کے سفر پہ جا رہا ہو اور اس نے سوچا "پارو کے بغیر اتنے دنوں تک میرا گزارا کیسے ہوگا؟"

گاڑی پلیٹ فارم سے نکل گئی اور ساری بھیڑ باہر جانے لگی تو ایک لڑکی نے پاروتی سے پوچھا "کیوں جی آپ تو دیپ کمار سے بڑی دیر باتیں کرتی رہی تھیں۔ آپ ان کی کیا لگتی ہیں؟"

"جو آپ لگتی ہیں" پاروتی نے ہنس کر جواب دیا "میں بھی ان کی FAN ہوں اور ان کے آرٹ کی قدردان ہوں سو آٹو گراف لینے آئی تھی۔"

گاڑی بمبئی کے مضافات سے گذر رہی تھی۔ سٹیشنوں کی روشنیاں اس طرح دوڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں جیسے مشعلیں ہاتھ میں لئے کوئی غیر انسانی فوج شکست کھا کر بھاگی جا رہی ہو۔ مہالکشمی، لوئر پریل، الفنسٹن برج ..... سٹیشن کے بعد سٹیشن ..... پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے گاڑی بمبئی سے دہلی کی طرف دوڑ رہی تھی اور دیپ کا تخیل اسی رفتار سے اُلٹی سمت دوڑ رہا تھا۔

دادر۔ ماٹنگا روڈ۔ ماہم۔ باندرہ۔

انیس سو چھپن۔ انیس سو چون۔ انیس سو ترپن۔ انیس سو باون۔

کھار۔ سانتا کروز۔ ولے پارلے۔ اندھیری۔

آٹھ برس ہوئے وہ پہلی بار دہلی سے بمبئی آیا تھا۔

مگر اس وقت اس کا نام دیپ کمار نہیں تھا، سورج نرائن ماتھر تھا۔ اس وقت اس نے ایر کنڈیشنڈ کوپے میں سفر نہیں کیا تھا، تھرڈ کلاس میں آیا تھا۔ اس وقت اس کے پاس شارک سکن کے سوٹوں اور سلک کی قمیصوں سے بھرے ہوئے تین سوٹ کیس نہیں تھے صرف ایک ٹین کا صندوق تھا جس میں دو پتلونیں، ایک کوٹ، چار قمیصیں تھیں اور گھر کے بنے ہوئے ستوؤں کی ایک تھیلی۔ جب بھی بھوک لگتی وہ ستوؤں کو پانی میں گھول کر پی لیتا۔

گاڑی پال گھر کے اسٹیشن پر ٹھہری اور ڈائننگ کار کے ویٹر نے آ کر کہا:

"ڈنر کا ٹائم ہو گیا ہے سرکار۔"

"ویس ویری سر" ڈائننگ کار کے منیجر نے خود اس کا استقبال کیا اور کھڑکی کے قریب کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے اسٹاف کے لوگوں میں سے جو سیکنڈ کلاس والے تھے وہ بھی آگئے تھے مگر دوسری میزوں پر بیٹھے تھے۔

"کیوں الکا رانی کھانا نہیں کھائیں گی؟" دیپ نے کیمرہ مین بھاسکر سے پوچھا۔

"جی نہیں وہ اور جولیا تو رمی کھیل رہی ہیں، اپنے کمپارٹمنٹ میں کھانا منگوایا ہے۔"

دیپ نے سوچا چلو اچھا ہی ہے۔ دونوں یہاں آتیں تو بک بک کر کے میرا دماغ چاٹ جاتیں اور آج کی رات نہ جانے کیوں وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔

"کیا کھائیں گے سرکار؟" ویٹر نے مینو کارڈ پیش کرتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

کھانے کا آرڈر دیتے ہوئے دیپ نے دیکھا کہ باقی میزوں پر جتنے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان سب کی نگاہیں اس پر ہیں۔ دو پارسی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ایک نوجوان رشک بھری نگاہوں سے دیپ کو گھور رہا تھا جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو "اف کتنا خوش نصیب ہے یہ دیپ کمار، کاش میں بھی ایسا ہی مشہور فلم سٹار بن سکتا۔" ٹکٹ چیکر اور سب مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے کے بعد اس کی میز کی طرف آیا مگر دیپ کمار کا ٹکٹ دیکھنے کے بجائے نوٹ بک اس کے سامنے کر دی: "اس پر آٹوگراف کر دیجئے۔ میری بیٹی آپ کے فلموں کو بہت پسند کرتی ہے۔" اور ٹرین کی رفتار کے ساتھ دیپ کی یاد ماضی کی طرف گئی۔ جب وہ تھرڈ کلاس میں دہلی سے بمبئی آرہا تھا اور اس نے ڈائننگ کار میں آکر کھانے کا آرڈر دیا تھا۔

"ٹکٹ پلیز!" ٹکٹ چیکر نے کہا اور جب دیپ نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ دکھایا تو اس نے کرخت لہجے میں ڈانٹا، "چلو باہر۔ ڈائننگ کار صرف فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے لئے ہے۔ کم آن۔ گٹ آؤٹ!"

کتنے برس گزر گئے تھے اس واقعے کو۔ آٹھ برس؟ آٹھ سو برس؟ آٹھ ہزار برس؟

ان آٹھ برسوں میں دنیا کتنی بدل گئی تھی۔ سورج نرائن ماتھر کتنا بدل گیا تھا!

بے خیالی سے وہ کھانا کھاتا رہا اور ڈائننگ کار کی چوڑی کھڑکی کے شیشے میں سے وہ چاندنی میں چمکتے ہوئے پیڑوں، جھونپڑوں اور کھیتوں کو پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مگر کچھ دیر بعد اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کھڑکی کے شیشے پر خود اس کی زندگی کے گزشتہ مناظر ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں جیسے سنیما کے پردے پر فلم کے سین نظر آتے ہیں۔

انیس سو اڑتالیس —— جب ہندوستان فلم سٹوڈیو سے اسے دھکے مار کر باہر نکالا گیا کیونکہ وہ دربان کی نظر بچا کر شوٹنگ دیکھنے سٹوڈیو کے اندر گھس گیا تھا اور اس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے اور اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، اور اس نے دو وقت سے کھانا نہیں کھایا تھا اور اس کے گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ کیونکہ اسے اب تک فٹ پاتھ کے پتھریلے فرش پر ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی تھی۔ اور اس لئے وہ مستقبل کا مشہور ایکٹر نہیں بلکہ ایک غنڈہ لگتا تھا۔

انیس سو انچاس۔ جب وہ پاپولر شو مارٹ میں پچاس روپے مہینے پر نوکر تھا اور دن بھر لوگوں کے پیروں میں جوتے پہنا کر دکھاتا تھا۔۔۔ میلے پیر، بھدے پیر، کالے پیر، گورے، نازک اور سڈول پیر، ان دنوں خواب میں بھی اسے پیر ہی پیر نظر آتے تھے اور ایک بار تو اس نے خواب دیکھا کہ لاکھوں پیروں کے نیچے اسے روندا جا رہا ہے اور اس کا دم گھٹ کر نکلنے ہی والا ہے۔ مگر اسی دن اسے جوتوں کی دنیا سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا تھا۔ جب دکان پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور بوہری مالک نے فون پر درجنوں بار "جی جناب، جی جناب" کر کے دیپ (جو اس وقت سورج کہلاتا تھا) سے کہا۔ "دیکھو چار نمبر کے لیڈیز سینڈلوں کے جتنے اچھے اچھے اور بڑھیا نمونے ہیں سب لے کر آئیڈیل سٹوڈیو

میں مس رادھارانی کے پاس جاؤ۔ ان کو اپنی نئی فلم کے لئے جوتے خریدنے ہیں۔ مگر صورت ٹھیک کر کے جانا تمہاری قمیص پھٹی ہوئی ہے۔" اور اس نے دکان کے پیچھے والی کوٹھڑی میں جا کر جہاں وہ اپنے کپڑے رکھتا تھا، اپنی اکلوتی اچھی قمیص پہنی پتلون پہ استری کی، بالوں میں تیل ڈال کر کنگھا کیا اور جاتے جاتے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔

دُبلا وہ ضرور تھا مگر اس کی شکل بُری نہیں تھی۔ کتنے ہی ہیروؤں سے اچھی تھی۔ غرض وہ چودہ ڈبے چھوٹی ٹیکسی میں ڈال کر آئیڈیل سٹوڈیو میں پہنچا اس لئے سٹوڈیو کے دروازے اس کے لئے کھول دئے گئے اور چونکہ وہ پاپولر شو مارٹ کا کارڈ لے کر مس رادھارانی کو جوتوں کی ٹرائی دینے آیا تھا اور صورت سے غنڈہ موالی نہیں لگتا تھا اس لئے اسے دھکے مار کر باہر نہیں نکالا گیا بلکہ فوراً مس رادھارانی کے پاس پہنچا دیا گیا۔

"میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گی۔ آپ دیکھتے نہیں وہ بالکل گنجا ہو گیا ہے۔" رادھارانی ڈائرکٹر ڈیسائی کو ڈانٹ رہی تھیں جب دیپ (جو ابھی تک سورج ہی کہلاتا تھا) وہاں پہنچا۔

"ور میڈم میں پاپولر شو مارٹ سے آیا ہوں۔" مگر ایک منٹ کے لئے رادھارانی نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف گھورتی رہی۔ پھر بولی: "اچھا جوتے دکھاؤ۔ کوئی اچھا نمونہ بھی ہے؟"

دیپ ڈبوں سے سینڈل نکال نکال کر دکھاتا رہا اور رادھارانی اور ڈیسائی میں ہیرو کے انتخاب کے سلسلے میں بحث ہوتی رہی۔ کوئی گنجا تو کوئی موٹا، تو کوئی ضرورت سے زیادہ لمبا تو کوئی ضرورت سے زیادہ چھوٹا۔ جو ہیرو اسے پسند تھے وہ (بقول ڈائرکٹر ڈیسائی کے) یا بہت پکچروں میں مصروف تھے یا روپے بہت مانگتے تھے۔

"اس سے تو اچھا ہے آپ کوئی نیا لڑکا ٹرائی کریں؟" رادھارانی تنگ آکر بولی۔

"مگر کام کا لڑکا یہاں ملتا ہی کہاں ہے؟ تم تو اس طرح کہتی ہو نیا لڑکا ٹرائی کرو جیسے لڑکا نہ ہوا جوتا ہوا۔"

"ہاں تو فرق بھی کیا ہے۔ جوتے اور ہیرو جب پرانے ہوتے ہیں پھینک دئے جاتے ہیں، ان کے بجائے نئے جوتے اور نئے ہیرو لائے .... ہاں یہ سینڈل مجھے فٹ ہے۔" یہ الفاظ اس نے دیپ سے کہے جو رادھارانی کے پیروں کے پاس بیٹھا ایک جوتے کے بعد دوسرا پہنا رہا تھا۔

اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں رادھارانی اور ڈیسائی کے درمیان نہ جانے کیا اشارے ہوئے کہ اپنے سینڈل کا بل وصول کرنے جب وہ ڈائرکٹر کے کمرے میں پہنچا تو ڈیسائی نے چھوٹتے ہی پوچھا: "کیوں مسٹر! فلم میں کام کرو گے؟" اور سورج کے منہ سے کچھ نہ نکلا سوائے "جی! جی — ایک گلاس پانی" کے۔

۱۹۵۰ - جب وہ سورج نرائن ماتھر سے دیپ کمار بن چکا تھا۔ اور اس کے پاس سات فلموں کے کنٹریکٹ تھے اور اس کے بینک کے لاکر میں سوا لاکھ روپیہ "بلیک" تھا۔ اور جب وہ ایک شام اپنی بیوک میں بیٹھ کر معاہدوں کے بارے میں قانونی مشورہ کرنے مالابار ہل پر اپنے سالسٹر مسٹر ڈیکا چند پریم چند کے گھر گیا تھا۔ گو وہ خود بھی اس وقت ورلی پر تین سو روپے مہینے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ لیکن اتنا عالیشان اور خوبصورت مکان اس نے کبھی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی اونچی الماریاں، دنیا کے مشہور مصوروں کی شاہکار تصویریں، قیمتی قالین، خوبصورت دبیز پردے، بڑھیا اور آرام دہ فرنیچر، صوفے، دیوان، کشن، کاٹھیاواڑی کام کی پیڑھیاں، کانسی کے پرانے بت، ہر چیز مالک مکان کی خوش مذاقی کا اعلان کرتی تھی۔ پھر ڈرائنگ روم کی دیواز پیر لمبی کھڑکی میں سمندر کا خوش نما منظر اور کام کی باتیں ختم کرنے کے بعد جب سالسٹر پریم چند نے دیپ کا تعارف اپنی بیٹی پاروتی سے کرایا جو اسی سال ایم۔ اے کا امتحان دے رہی تھی، تو دیپ کو ایسا لگا کہ اس گھر کا سارا حُسن اور خوش مذاقی اس نازک اور ذہین لڑکی میں سمٹ آئی ہے جو کہیں میں جا کر اپنے ہاتھوں سے پکوڑے بھی تل سکتی ہے۔

ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر بڑے سلیقے سے چائے انڈیل سکتی ہے اور ساتھ ساتھ بائرن کی شاعری اور گوئٹے کے ڈراموں کے بارے میں علمی بحث بھی کر سکتی ہے۔ اور دیپ جس نے نہ کبھی ایسا گھر دیکھا تھا نہ کبھی ایسی لڑکی سے ملا تھا، یہ سوچتا ہوا رخصت ہوا کہ میری ساری دولت اور شہرت کس کام کی اگر پاروتی جیسی بیوی نہ ملے۔

۱۹۵۱۔ جب بڑی دھوم سے اس کی شادی پاروتی سے ہوئی اور اس کی کمپنی دیپ کمار پروڈکشنز کا افتتاح ہوا۔

۱۹۵۲۔ جب ان کا پہلا بچہ پیدا ہوا جس کا نام جگدیپ رکھا گیا (مگر جسے پاروتی جونیر کے نام سے پکارتی تھی) اور جب دیپ پروڈکشنز کے فلم "آسمانی چوڑیاں" کی سلور جوبلی ہوئی۔ کمپنی کو سات لاکھ کا منافع ہوا جس سے دیپ نے اپنا اسٹوڈیو بنوانا شروع کیا۔ اور ان کی دوسری اولاد ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام جمنا رکھا گیا۔ مگر جسے ماں باپ پیار سے جمّو کہنے لگے۔ اسی سال کے اخیر میں دیپ اور پاروتی کا پہلا جھگڑا ہوا جب پاروتی نے دیپ کا نیا فلم "ہائے میرے بالم" دیکھا اور دیپ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے کہا "یہ میری پسند ناپسند کا کیا سوال۔ پبلک تو پسند کرتی ہے نا؟ سلور جوبلی تو ضرور ہو گی نا؟ بس تو یہ کافی ہے۔" اور دیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی کامیابی کے شربت میں کسی نے کونین گھول دی ہو۔

۱۹۵۳۔ جب دیپ کی فلم "ہائے مورے بالم" کی گولڈن جوبلی ہوئی اور اس نے جوہو پر ایک بنگلہ خریدا اور پچاس ہزار اس کے فرنیچر اور بیس ہزار باغ اور لان لگانے پر خرچ کر دئے۔

۱۹۵۴۔ جب دیپ کمار پروڈکشنز کی فلم "چال نمبر بارہ" جو ایک بڑے شہر میں غریبوں کی زندگی کے متعلق تھی فیل ہو گئی۔ دیپ کمار کے باغ کے پھولوں کو فلاور شو میں اول انعام ملا۔ جونیر پہلی بار اسکول گیا اور جمو نے "پاپا" "ممی" کہنا شروع کیا۔ دیپ نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ حاصل کر کے شراب کا پرمٹ بنوایا۔

۱۹۵۵۔ دیپ کی نئی فلم "آوارہ شہزادہ" کی بے انتہا مقبولیت نے کئی برس کے ریکارڈ توڑ دئے۔ دیپ کمار کو اتنا فائدہ ہونے کا خطرہ ہوا کہ اس کے اڈیٹر نے مشورہ دیا کہ وہ ٹیکس سے بچنے کے لئے فوراً ایک ایسی فلم شروع کر دے جس میں نقصان دکھایا جا سکے اور چنانچہ اس کی فلم "نیا ہندوستان" کا مہورت ہوا۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ کسی چھوٹے سے اندھیرے اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور مسافر ڈائننگ کار سے اپنے ڈبوں کی طرف چلے۔ دیپ کمار نے ویٹر سے کہا دو سوڈے کی بوتلیں دے دے۔ پھر اپنے کوپے کا دروازہ بند کیا۔ سوٹ کیس میں سے وہسکی کی بوتل نکالی اور گلاس میں ایک پیگ انڈیلا۔ پھر اس نے تین تصویروں کا ایک تہ ہونے والا چمڑے کا فریم نکالا جو سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک طرف جونیر دوسری طرف جمو۔ بیچ میں پاروتی کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر۔

"ویل پارو! ہیراز ٹو یو" اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ پانچویں پیگ کے بعد اس نے پاروتی کی تصویر کی طرف غور سے دیکھا اور بڑبڑایا۔ "تم مجھ پر ہنستی کیوں ہو، پارو! میرا مذاق اڑاتی ہو۔ اس لئے کہ میرا باپ غریب تھا اور تمہارا امیر؟ یا اس لئے کہ میں انٹر میڈیٹ تک پڑھا ہوں اور تم ایم۔ اے ہو؟ یا اس لئے کہ تم کلاسیکی موسیقی اور بھارت ناٹیم اور روسی بیلے اور اٹالین فلم پسند کرتی ہو اور میں "آوارہ شہزادہ" جیسی گھٹیا فلمیں بنا کر روپے کماتا ہوں۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

ساتویں پیگ کے بعد اس نے گلابی آنکھوں سے پاروتی کی تصویر کو گھورا۔ "ساری دنیا میری عزت کرتی ہے۔ لاکھوں میرے کام کو سراہتے ہیں، میری تعریف کرتے ہیں۔ میں جہاں جاتا ہوں میرے چاہنے والوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ تین ہزار خط ہر مہینے میرے پاس آتے ہیں۔ اتنی FAN MAIL کسی ستارے کی بھی نہیں ہے۔ مگر تم میری عزت نہیں کرتیں پارو۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو مگر جیسے ماں اپنے بے وقوف بچے سے

کرتی ہے۔ مجھے ایسی محبت نہیں چاہیئے، پارو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے برابر کا سمجھو۔ میری عزت کرو۔"

اور نویں پیگ کے بعد اس نے پھر پاروتی کی تصویر کو مخاطب کیا۔ "تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟ پارو! مانا کہ تم حسین ہو، پڑھی لکھی ہو، امیر ماں باپ کی بیٹی ہو۔ مگر دنیا میں ہزاروں لڑکیاں اور بھی ہیں۔ سمجھیں پارو؟ نہیں سمجھیں تو میں تمہیں سمجھاؤں گا۔ پھر ہنس رہی ہو؟ پارو مت ہنسو۔ مت ہنسو۔"

مگر اس کی مدہوش آواز کی گونج کوپے ہی میں کھو کر رہ گئی تھی اور جب وہ نشے سے چور ہو کر سو گیا پاروتی کی تصویر اسی طرح طنز اور تمسخر اور رحم کے انداز میں مسکراتی رہی۔

رمیش

ٹریکٹر کے سٹیرنگ وہیل کو سنبھالے رمیش اپنے پیروں تلے موٹر کی دھڑدھڑاہٹ کو محسوس کر رہا تھا۔ جب کبھی وہ ٹریکٹر چلاتا تھا اس کے تن بدن میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ جاتی، اس کا دل ایک عجیب احساسِ فتح سے بھر جاتا اور اسے ایسا لگتا کہ وہ ایک ماڈل فارم کا ڈائریکٹر نہیں ایک فوج کا سپہ سالار ہے جو یلغار کرتی، دشمنوں کو پسپا کرتی چلی جا رہی ہے، اور یہ ٹریکٹر نہیں ہے جس پر وہ سوار ہے، بلکہ نپولین کا جنگی گھوڑا ہے، ہٹلر کا ٹینک ہے ..... نہیں ہٹلر کے ٹینک تو روس کی توپوں کے سامنے بری طرح مار کھا گئے تھے۔ مگر اس ٹریکٹر اور اس کے پیچھے لگے ہوئے ہارویسٹر کمبائن کی کلدار تیز درانتیوں کے سامنے اونچے سے اونچے گیہوں کا بڑے سے بڑا کھیت بھی ہیچ ہے۔

ہارویسٹر کمبائن پکی ہوئی فصل کو اس طرح کاٹ رہا تھا جیسے سر کے گھنے بالوں میں باربر کی مشین چلتی ہے، اس تشبیہ کو سوچ کر رمیش آپ سے آپ مسکرا دیا۔ واقعی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے کھیت کی حجامت ہوتی جا رہی ہو۔ مگر یہ تشبیہ بھی کس قدر غیر شاعرانہ ہے۔ کوئی اور خوبصورت تشبیہ سوچنی چاہیئے۔ کرشن چندر نے کسان کی درانتی کو ادیب کے قلم اور آرٹسٹ کے برش سے تشبیہ دی تھی۔ اس لئے کہ درانتی سے کسان زمین کے کینوس پر کیسی کیسی تخلیقی گلکاریاں کرتا ہے، کیسے کیسے شاہکاروں کو ترتیب دیتا ہے۔ اگر درانتی پرانے زمانے کے کسان کا قلم تھی، رمیش نے سوچا تو ہارویسٹر کمبائن آج کے کسان کا ٹائپ رائٹر ہے جس پر کھٹا کھٹ نئے افسانے کی کہانی لکھی جا رہی ہے۔ نہیں یہ تشبیہ بھی تسلی بخش نہیں ہے، رمیش نے سوچا کاش میں ادیب ہوتا، آرٹسٹ ہوتا کہ اس عجیب اور خوبصورت اور سرور انگیز جذبے کا اظہار کر سکتا جو اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا، جو وہ ہر بار محسوس کرتا تھا۔ جب بھی وہ فارم پر کسی مشین سے کام کرتا ہر بار وہ سوچتا دس سال پہلے اتنے بڑے کھیت کی فصل کاٹنے کے لئے سینکڑوں کسانوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو کم سے کم دس دن لگتے اور اب چند ہی گھنٹے میں وہ سارا کام ایک ٹریکٹر اور ایک کمبائن سے ہو سکتا ہے اور اسے ایسا لگتا جیسے انقلاب وہ نہیں تھا جو سیاست دانوں نے اپنی دھواں دھار تقریروں سے برپا کیا بلکہ انقلاب یہ ہے جو اس کے فارم کی مشینیں کسانوں کی زندگی میں برپا کر رہی ہیں وہ مشینیں جو ہمیشہ کے لئے کسانوں کو جانوروں کی طرح مشقت کرنے کی مجبوری سے آزاد کر رہی ہیں، جو ملک کی زراعتی پیداوار بڑھا رہی ہیں جو ہندوستان کے دیہات کا نقشہ بدل رہی ہیں۔ سامنے دوسرا ٹریکٹر گنگوا چلا رہا تھا۔ اٹھارہ برس کا کسان چھوکرا جس کے باپ دادا سینکڑوں برسوں سے زمینداروں کی زمینیں جوتتے، زمینداروں کی فصلیں کاٹتے اور خود آدھے پیٹ بھوکے رہتے آئے تھے۔ جنہوں نے کبھی ہل اور درانتی کے سوا کوئی دوسرا اوزار نہیں دیکھا تھا۔ جو کبھی ریل میں بیٹھ کر بریلی شہر تک بھی نہیں گئے تھے۔ انہی کی اولاد گنگوا آج اس فارم کا بہترین ٹریکٹر ڈرائیور ہے۔ ہندی میں لکھ پڑھ سکتا ہے۔ رمیش کی طرح خاکی نیکر اور قمیص اور ہیٹ پہنتا ہے۔ اس کا بوڑھا باپ اب بھی برسوں کی عادت سے مجبور ہو کر زمیندار کی اولاد سے اور ہر سرکاری افسر سے ہاتھ جوڑ کر بات کرتا ہے مگر گنگوا کا مزاج بدل چکا ہے۔ وہ ٹریکٹر چلانا سیکھنے کے لئے

بھوپال کا سفر کر آیا ہے۔ وہ صبح کو ہندی کا اخبار پڑھتا ہے۔ رات کو ریڈیو سنتا ہے، ہفتے میں کم سے کم ایک بار بریلی جا کر سنیما دیکھتا ہے اور نہ کبھی کسی کے سامنے گڑگڑاتا ہے نہ ہجور ہجور کرتا ہے۔ اور رمیش نے سوچا میں مصوّر ہوتا تو ننگوا کی بڑی خوبصورت تصویر بناتا اور اس کے نیچے لکھ دیتا "ہندوستان کا نیا کسان"۔ پسینے میں نہایا ہوا سیاہ گٹھا ہوا بدن، ڈریکٹر کے ہینڈل کو سنبھالے ہوئے آہنی ہاتھ، مضبوط ٹھوڑی اوپر کو اٹھی ہوئی، اور بے خوف نظر آسمان پر......

سامنے آسمان پر افق کی طرف سے بھورے بھورے بادل اٹھ رہے تھے۔ کیا خوبصورت منظر تھا۔ حدِ نظر تک لہلہاتے ہوئے کھیت، گیہوں کی سنہری بالیں دھوپ میں چمکتی ہوئی، شمال کی طرف آم کے پیڑوں کے جھنڈ کے پیچھے دور پہاڑیوں کی دھندلی قطاریں دھیرے دھیرے گہرے سیاہ بادلوں کے پردے میں چھپتی جا رہی تھیں۔ رمیش نے سوچا اس سے بڑھ کر حسین منظر دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اور نہ ٹریکٹر کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ پیارا کوئی سنگیت ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس مشینی سنگیت میں طاقت ہے، آہنی آہنگ ہے، نئی زندگی کا پیغام ہے۔

"کٹ!"

فضا میں ایک مبہم سی آواز گونجی مگر رمیش کے سلسلۂ خیالات پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک سیٹی بجی مگر رمیش کو اپنی زندگی سے اس سیٹی کا کوئی تعلق نہ معلوم ہوا۔ وہ ٹریکٹر چلاتا رہا، کمبائن کی چرخی گھومتی رہی، اس کی کٹدار درانتیاں فصل کو کاٹتی رہیں، سامنے آسمان پر بادلوں کے رنگین نقش بنتے رہے۔ گیہوں کی بالوں پر سورج کی آخری کرنیں ناچتی رہیں......

"کٹ! کٹ!" کسی دوسری دنیا سے آواز آئی۔ سیٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ مگر رمیش کا ہاتھ ٹریکٹر کے بریک پر نہیں گیا۔ فاتحانہ شان سے نپولین کا گھوڑا دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا......

"ٹریکٹر ٹھہراؤ!"

اس کے بالکل قریب آ کر کوئی چلایا تو رمیش نے گھوم کر دیکھا کہ دیپ کمار کا اسسٹنٹ ہے اور اس کے پیچھے پیچھے ہانپتا کانپتا فصل پر پھسلتا، گرتا دیپ کمار بھاگا آ رہا ہے۔ اب رمیش نے بریک لگا کر ٹریکٹر روکا اور انجن بند ہوتے ہی اس کے خیالات کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔

"ارے بھائی کیا کرتے ہو، شاٹ بالکل خراب کر دیا۔ ادھر کے کھیت پر تو لائٹ ہی نہیں ہے۔ پھر کٹ کر کے ہمیں مڈ شارٹ میں جانا تھا......"

اب رمیش کو یاد آیا کہ وہ فصل ہی نہیں کاٹ رہا ہے وہ دیپ کی فلم "نیا ہندوستان" کے ایک شاٹ میں حصہ لے رہا تھا۔ کیونکہ دیپ خود ٹریکٹر نہیں چلا سکتا تھا اس لئے اس نے رمیش سے درخواست کی تھی کہ لانگ شوٹ میں وہ ٹریکٹر چلا دے۔ ان دونوں کا قد و بدن تقریباً ایک سا ہی تھا۔ دیپ بھی رمیش کی طرح خاکی نیکر، قمیص اور ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ دور سے پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون ہے۔ جب کیمرہ قریب آئے گا تو دیپ کو ٹریکٹر کو بریک لگا کر اترتے ہوئے دکھا دیا جائے گا۔

"تھینک یو رمیش" دیپ نے ٹریکٹر پر سوار ہوتے ہوئے کہا، "ذرا یہ تو بتاؤ بریک کیسے لگاتے ہیں؟"

رمیش نے اسے سب کل پرزے سمجھائے اور نیچے اتر آیا۔ کیمرہ مین کیمرہ لگا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دیپ کے آرٹسٹوں اور اسسٹنٹوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور ان ہی میں اوشا بھی کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔

"کہو اوشا، اب تو میں بھی فلم سٹار ہو گیا نا؟" رمیش نے پسینہ پونچھتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔

"ہیں؟ کیا کہا؟" آشا کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس کی نگاہیں دیپ پر جمی ہوئی تھیں۔

"کچھ نہیں۔ تم شوٹنگ دیکھو، میں گھر جاتا ہوں۔ ریڈیو پر موسم کی خبریں سننی ہیں۔" اور وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

اگلا شاٹ شروع ہو گیا تھا۔ گنگوا نے آکر ٹریکٹر کو ایک بار پھر سٹارٹ کیا۔ دیپ نے چند گز چلایا، پھر جیسے ہی پلے بیک مشین پر لتا منگیشکر کی رکارڈ کی ہوئی تان "او...... و...... و...... اجی...... ہو...... ہو......" سنائی دی۔ دیپ نے مڑ کر دیکھا، مسکرا کر بریک لگائی اور ٹریکٹر سے کود کر دائیں جانب بھاگا۔ کیمرے نے گھوم کر اس کو فوکس میں رکھا۔ کھیتی میں سے الکا رانی نمودار ہوئی۔ کریپ کی اوڑھنی، ریشمی گھاگھرا اور چولی پہنے ہوئے، لتا منگیشکر کی آواز میں تان لگاتی ہوئی "او...... او...... و...... و...... اجی...... ہو......"

دیپ نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ کھیتی میں چھپ گئی۔ دیپ نے اسے ڈھونڈھ نکالا۔ وہ پھر بھاگی، چھپی اور آخر کار دیپ نے لپک کر اسے کلائی سے پکڑ ہی لیا۔ پلے بیک مشین پر لتا منگیشکر چلائی "چھوڑو، چھوڑو جی موری کلیّا"۔ گھما الکا رانی ساتھ ساتھ ہونٹ ہلانا بھول گئی — اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا "کٹ۔ کٹ" دیپ نے گھڑی دیکھی، کیمرہ مین نے آسمان کی جانب دیکھا اور دیپ نے اعلان کر دیا —

"شوٹنگ پیک اپ" الکا رانی اپنی نقلی چوٹی جولیا کی طرف پھینکتے ہوئے چلائی "کم آن ڈارلنگ، چل کر ٹھنڈے پانی سے نہائیں۔" دوسرے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس کو سینڈل پہنائی اور وہ جولیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیروں میں پڑی ہوئی پائل کو چھنکاتی چل دی۔

"کہئے اوشا جی۔ آپ چلتی ہیں؟"

"چلئے"

کافی دور تک ان کو کھیتوں کے بیچ میں سے پگڈنڈی پگڈنڈی ہو کر جانا تھا۔

راستے میں اوشا نے کہا "دیپ جی آپ اتنے بہت کام کیسے کر پاتے ہیں؟ ایکٹنگ، ڈائریکشن، پھر پروڈکشن کی ساری ذمہ داریاں، میں تو سوچ سوچ کر حیران رہ جاتی ہوں؟"

دیپ نے اپنی مشہور مسکراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اس میں کمال کی کون سی بات ہے۔ اگر کوئی کام بھی اچھا نہ کیا جائے تو آدمی جتنے کام چاہے کر سکتا ہے۔"

"کیوں آپ مجھ سے تعریف کرانا چاہتے ہیں۔ سچ کہتی ہوں میں نے آج تک آپ کی ایک پکچر بھی مِس نہیں کی۔ اتنا اچھا کام کرتے ہیں آپ تو......"

نہ جانے کیوں اس وقت دیپ کو پاروتی کا خیال آیا اور اس نے سوچا کاش یہ الفاظ کبھی پارو کی زبان سے سُنے ہوتے۔ مگر آشا سے اس نے کہا "تو پھر یہ بتائیے کہ میرے کام میں آپ کو کیا بات اچھی لگتی ہے۔ ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی اور ایکٹر کی حیثیت سے بھی......"

چند لمحے سوچ کر آشا بولی "میں بتاتی ہوں ڈائریکٹر کی حیثیت سے ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کا درد آپ کے دل میں سمٹ آیا ہے۔ ...... آپ زندگی کے جس رُخ کو بھی اپنی فلموں میں دکھلاتے ہیں اس کے ساتھ آپ کی پوری ہمدردی جھلکتی ہے۔ "چال نمبر بارہ" میں آپ نے شہر کے غریبوں کا حال دکھایا ہے۔ "آوارہ شہزادہ" میں جب شہزادہ ڈاکو کے بھیس میں امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں تقسیم کرتا ہے ...... بڑا ہی پُر اثر ہے وہ سین "پھر گانے بھی تو غضب کے ہوتے ہیں آپ کی فلموں میں......"

"ایکٹر کی حیثیت سے تو آپ کمال کرتے ہیں۔ جو پارٹ بھی کرتے ہیں اس میں گھل مل جاتے ہیں مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کے رومینٹک سین غضب کے ہوتے ہیں۔ آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

"کہئے، کہئے میں تو آپ کی باتیں بڑی دلچسپی سے سُن رہا ہوں۔"

"ہمارے کالج کی سب ہی لڑکیاں یہ کہتی ہیں کہ جب کوئی لڑکی آپ کو سکرین پر LOVE Scene کرتے دیکھتی ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ خود اس سے ...." اور شرم کے مارے اس کی زبان رُک گئی۔

"محبت کا اظہار کر رہا ہوں؟ کیوں؟"

اوشا نے سر ہلا کر ہاں کہا۔ پھر چند منٹ دونوں خاموشی سے چلتے رہے اور شام کے حسین سناٹے میں، آشا کی قربت میں، حنا کے اس عطر میں جس کی خوشبو کی لپٹیں آشا کے کپڑوں سے آ رہی تھیں اور ان الفاظ میں جو ابھی اوشا نے اس کے بارے میں کہے تھے۔ دیپ کو ایک عجیب راحت، ایک عجیب تسکین محسوس ہوئی جو اسے کبھی پہلے نہ ہوئی تھی اور اسے ایسا لگا جیسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی محرومی آج دور ہوئی ہو۔

سگریٹ جلانے کے بہانے سے وہ رُکا، اوشا بھی رُک گئی، سگریٹ جلاتے وقت دیپ نے اوشا کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اوشا نے نگاہیں جھکا لیں۔

ایک بار دیپ کا ہاتھ بے اختیار اوشا کی کمر کی طرف بڑھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔

"کہئے آپ کی زندگی یہاں کیسے گذرتی ہے؟" پھر قدم بڑھاتے ہوئے دیپ نے سوال کیا۔

"ہماری بھی کیا زندگی ہے دیپ جی۔"

"اب یہ دیپ جی کا تکلف رہنے بھی دو اوشا میرا نام صرف دیپ ہے۔"

"آپ تو نفسیات کے ماہر ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ماحول میں کیسی زندگی گذر سکتی ہے۔ بڑی بے مقصد، بے رنگ، بے مزہ زندگی ہے اپنی تو......"

"کوئی کام کیوں نہیں کرتیں آپ؟ آپ تو پڑھی لکھی ہیں......"

"پڑھی لکھی کیا ہوں۔ انٹر تک پڑھا تھا کہ شادی ہو گئی۔ ٹیچر ہونے کے لئے بھی تو گریجویٹ...... مگر آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہیں کیا؟"

"نہیں نہیں میں تو اس لئے ہنس رہا ہوں کہ میں بھی صرف انٹرمیڈیٹ تک پڑھا ہوا ہوں۔ پھر بھی دیکھئے کام کرتا ہی ہوں۔"

"مگر آپ تو فلم میں کام کرتے ہیں۔"

"تو آپ بھی فلم میں کام کر سکتی ہیں۔"

"جی ـــــ میں؟" اور اوشا کو ایسا لگا جیسے دفعتاً فضا میں نقرئی گھنٹیاں بجنے لگی ہوں۔ جیسے گیہوں کے کھیت دفعتاً گلاب کے تختوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

"مگر مجھے کام کون دے گا دیپ جی؟"

"صرف دیپ کہو۔ تو میں ہی کام دے سکتا ہوں اوشا۔"

"سچ دیپ!"

"ہاں اوشا میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ فلم سٹار بننے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، خوبصورتی اور ذہانت! ہماری بہت سی فلم سٹارز صرف خوبصورت ہیں۔ بلکہ بعض تو اب خوبصورت بھی نہیں رہیں جیسے ہماری اکثر رانی ہیں جو اب تک دس برس پہلے کی شہرت کے بھروسے پر چل رہی ہیں مگر تم تو خوبصورت ہونے کے ساتھ ذہین بھی ہو۔"

"آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟ دیکھئے یہ میری ساری زندگی کا سوال ہے۔"

"نہیں اوشا، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ مگر شاید مجھے ایسا کہنا نہیں چاہئے تھا۔ رمیش صاحب سنیں گے تو کیا کہیں گے؟"

"میں ان کی بیوی ہوں، لونڈی نہیں ہوں۔ اپنی بہتری کے لئے جو چاہے کر سکتی ہوں۔"

اور اس عرصے میں بنگلہ آ گیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ بنگلے کے برابر ہی میں چار خیموں کا کیمپ لگا ہوا تھا ایک میں دیپ، دوسرے میں الکارانی اور جولیا، تیسرے میں کیمرہ مین اور اسسٹنٹ اور چوتھی چھولداری میں قلی اور دوسرے نوکر۔

اوشا نے دیپ کو بلند آواز سے رخصت کیا۔

"اچھا مسٹر دیپ، آپ چلئے، ہاتھ منہ دھو لیجیے۔ میں ابھی چائے بھجواتی ہوں۔"

"تھینک یو مسز رمیش، آپ کو ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔"

اوشا اندر کمرے میں چلی گئی جہاں رمیش ریڈیو کے قریب بیٹھا غور سے خبریں سن رہا تھا۔ دور سے بادلوں کی کڑک کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک بجلی کی لہر آسمان کو چیر گئی۔ مگر اوشا کو کوئی گمان نہ گذرا کہ طوفان آنے والا ہے۔

ریڈیو اناؤنسر کہہ رہا تھا "کیندریہ سرکار کے کھادیہ وبھاگ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس برس ہندوستان میں اور سب سالوں سے زیادہ غلہ پیدا ہوا ہے۔ گیہوں کی جو فصل اب پک کر کٹائی کے لئے تیار ہے۔ اگر یہ بارش سے پہلے پہلے کٹ گئی تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس برس کال کا کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"سنا تم نے اوشا۔" رمیش نے بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کٹائی کرنے میں ہمارا فارم تو سب سے آگے ہے۔ ان فلم والوں نے بار بار ٹریکٹر کو رکوایا نہ ہوتا تو آج ہی ساری فصل کٹ جاتی۔ مجھے امید ہے گیہوں کی پیداوار میں ہمارا فارم سب پر بازی لے جائے گا۔"

"فصل، ٹریکٹر، گیہوں، کٹائی کیا ان کے علاوہ دنیا میں کوئی بات ہی نہیں رہ گئی۔ کبھی میرا بھی خیال کیا کرو۔"

"کیوں کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ دن بھر دھوپ میں کھڑے کھڑے کہیں لُو تو نہیں لگ گئی؟" "نہ جانے کب ان فلم والوں کی بک بک سے نجات ملے گی۔"

اوشا کا جواب سن کر رمیش ہکّا بکّا رہ گیا تھا۔ ایک دم چلّا کر وہ بولی: "وہ لوگ بالکل بک بک نہیں کر رہے۔ ایک اچھا فلم بنا رہے ہیں۔ بک بک تو کرتے ہو تم۔ ہر وقت بیج، کھاد، نلائی، کٹائی۔ کوئی اور بات ہی نہیں رہی تمہارے لئے۔"

"ارے آج تمہیں ہوا کیا اوشا؟" رمیش نے حیران ہو کر پوچھا اور اسی وقت باہر اندھیرے آسمان میں بجلی اتنے زور سے کوندی کہ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور ایک لمحے بعد ایسی بھیانک کڑک سنائی دی کہ سارا گھر ہل گیا۔

"رمیش میں بمبئی جا رہی ہوں۔"

چند لمحوں کے لئے رمیش اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ "کیا کہا، بمبئی؟ مگر کیوں؟ کب؟"

اوشا نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ "میں فلم میں کام کرنے جا رہی ہوں۔ دیپ۔ مسٹر دیپ نے مجھے آفر دیا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" رمیش ہنس کر بولا۔ "تو دیپ صاحب تمہیں بھی فلم سٹار بنانا چاہتے ہیں؟ بھئی مبارک ہو۔ اب تم بھی الکارانی کی طرح ریشمی گھاگھرا چولی پہن کر 'چھوڑ دو چھوڑ دو جی موری کلیاں' گایا کرنا۔ ... مگر بھئی اپنے فلموں کے پریمیئر پر ہمیں ضرور بلانا۔ پہلی فلم کون سی ہو گی؟ بمبئی کی تتلی؟ یا بغداد کی حور؟"

"رمیش!" بجلی کی کڑک کی طرح اوشا کی آواز گرجی۔ "میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ اب میں یہاں رہتے رہتے تنگ آ گئی ہوں۔"

"تنگ آگئی ہو مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ زندگی میں گیہوں ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ گلاب کے پھولوں کی بھی کوئی اہمیت ہے۔"

"تو تمہیں گلاب کے پودے چاہئیں۔ وہ تو ہیں......"

بات کاٹ کر وہ چلائی "میں گلاب کی دو جھاڑیوں کا ذکر نہیں کر رہی، اپنی ساری زندگی کی بات کر رہی ہوں۔ تم نے اس فارم پر لاکر مجھے قید کر دیا ہے، نہ رہنے کو ڈھنگ کا مکان، نہ پہننے کو ڈھنگ کے کپڑے، نہ کوئی ملنے جلنے والا، نہ سیر تفریح، ہر طرف اُجڈ گنوار جنہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، ہر طرف کھاد کی بُو، ٹریکٹر کی گھر گھر۔ تم نے میری ساری زندگی کو بے کار، بے مصرف، بے مقصد بنا کر رکھ دیا ہے۔"

رمیش کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ مگر جب آتا تھا تو بہت زور سے۔ اوشا سے بھی اونچی آواز میں وہ چلا کر بولا "تم اس زندگی کو بے مقصد کہتی ہو؟...... تم اناج پیدا کرنے کو بکواس سمجھتی ہو؟ اگر یہی کسان جن کو تم اُجڈ گنوار کہتی ہو، کل کام کرنا بند کر دیں تو روٹی کہاں سے کھاؤ گی؟ بولو کیا گلاب کے پھول سونگھ کر زندہ رہو گی؟"

بجلی ایک بار پھر زور سے کوندی۔ ایک لمحے کے لئے سارا کمرہ چکاچوند کرنے والی روشنی سے بھر گیا۔ ایک غیر قدرتی روشنی جیسی تھیٹر کے سٹیج پر ہوتی ہے یا فلم سٹوڈیو میں شوٹنگ کے وقت ہوتی ہے اور اس لمحے ایسا لگا جیسے رمیش اور اوشا جھگڑتے ہوئے میاں بیوی نہیں بلکہ کسی پرانے ڈھنگ کے ناٹک کے ہیرو ہیروئن ہیں جو کوئی بڑا ڈرامائی سین کر رہے ہیں۔ اگلے لمحے بجلی کا کوندا غائب ہو گیا اور ایسا زور کا تڑاخا ہوا کہ اوشا کے منہ سے بے اختیار "اوئی" نکل گیا۔

"کاشتکاروں کے لئے ضروری اطلاع، کاشتکاروں کے لئے ضروری اطلاع" ریڈیو پکار رہا تھا۔ "اُتر پردیش کے ترائی کے علاقے میں زبردست طوفان، آندھی اور بارش آنے والی ہے۔ سب کاشتکاروں کو چاہئے کہ فصل کی کٹائی پوری کر کے اناج کو گوداموں میں رکھ دیں، ورنہ بارش کی وجہ سے زبردست نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے، پہاڑی علاقوں میں پچھلے چوبیس گھنٹوں میں بارہ انچ بارش ہوئی ہے۔ اس لئے ندیوں میں باڑھ آنے کا بھی خطرہ ہے۔ ندی کے کنارے والے علاقوں کو ہوشیار رہنا چاہئے۔"

"اوشا، ہماری فصل!" رمیش کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، اور اس لمحے وہ اپنا اور اوشا کا سارا جھگڑا بھول گیا۔ اس کے دماغ میں صرف ایک فکر، صرف ایک دھن رہ گئی، کسی طرح فصل کو بچانا چاہئے۔

برآمدے میں پیتل کا ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا، ایسے ہی موقع کے لئے فارم پر کام کرنے والوں کو ہدایات تھیں کہ اس کے بجتے ہی سب ڈائریکٹر کے گھر پر جمع ہو جائیں۔ رمیش نے موگری لے کر گھنٹے کو پیٹنا شروع کر دیا اور چند ہی منٹ میں اس کے درجنوں آدمی دوڑتے ہوئے آگئے۔

"گنگوا سب آدمیوں کو جمع کرو۔" رمیش اس طرح ہدایات دے رہا تھا جیسے جنگ سے پہلے کمانڈر اپنے افسروں کو احکامات دیتا ہے۔ "جتنی کٹائی ہو کر کھیتوں میں پڑی ہے اسے بارش ہونے سے پہلے گوداموں میں فوراً پہنچانا ہے اور پچھلے کونے پر جو کھیت رہ گیا ہے اس میں ابھی کٹائی کرنی ہے۔ ایک ٹریکٹر اور کمبائن تم چلاؤ ایک میں سنبھالتا ہوں۔ فارم پر جتنے مرد عورتیں بچے ہیں سب سے کہو درانتیاں لے کر چل پڑیں۔ بارش ہونے سے پہلے پہلے سارا کھیت کٹ جانا چاہئے۔"

"بہت اچھا رمیش بابو...... مگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں گنگوا یہ کام ہونا ہی چاہئے۔"

"مگر اندھیرے میں کٹائی کیسے ہو گی، ہجور؟" گنگوا کا بوڑھا باپ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

رمیش کو ایسا لگا، جیسے جنگ سے پہلے کسی جرنیل کو معلوم ہو کہ اس کے سپاہیوں کے پاس گولی بارود نہیں ہے۔ اب دشمن کا مقابلہ کیسے کریں گے؟

چند لمحوں کے لئے سب خاموش ہو گئے۔ مگر پھر پیچھے سے آواز آئی "اندھیرے کا انتظام میں کئے دیتا ہوں رمیش جی۔"

سب نے مڑ کر دیکھا۔ دیپ کمار ایک شوخ رنگ کا ریشمی ڈریسنگ گاؤن پہنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "ہمارے جنریٹر اور آرک لیمپ کب کام آئیں گے؟"

"آرک لیمپ؟" رمیش کو ایسا محسوس ہوا جیسے لڑتے لڑتے اس کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی تلوار آ گئی ہو۔ "کتنے آرک لیمپ ہیں آپ کے پاس؟"

"آٹھ ہیں۔ جس کھیت میں کٹائی کرنی ہے اس کے لئے کافی ہیں۔" اور پھر اس نے چلا کر اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ "اپنے آدمیوں سے کہو جنریٹر اور آرک لیمپ سب اس کھیت کے کنارے لگا دیں، چلو جلدی کرو۔ ذرا بھی دیر نہیں ہونی چاہئے۔" یہ کہہ کر اس نے ڈریسنگ گاؤن اتار پھینکا اور رمیش کے ساتھ کھیت کی طرف بھاگا۔ اوشا نے محسوس کیا کہ اس لمحے رمیش اور دیپ دونوں نے اس کی ہستی کو بھلا دیا ہے۔

اس غیر متوقع کمک کے پہنچتے ہی ہلّہ شروع ہو گیا۔ کھیت کے چاروں طرف آرک لیمپ روشن کر دئیے گئے اور اس روشنی میں رمیش اور گنگوا کے ٹریکٹروں نے کٹائی کا کام شروع کر دیا۔ سو سے زیادہ مرد عورتیں بچے درانتیاں لے کر فصل پر ٹوٹ پڑے، باقی لوگ کٹی ہوئی فصل کو اٹھا کر گوداموں کی طرف دوڑنے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادل امڈے ہی چلے آ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی اور تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ بجلی بار بار چمک اور کڑک رہی تھی۔ کسی بھی لمحے بارش شروع ہو جائے گی اور آندھی کٹی ہوئی فصل کو اڑا کر تتر بتر کر دے گی۔ ہر آدمی، ہر عورت، ہر بچے کے دماغ میں بس یہی ایک دھن تھی کہ کسی طرح بارش اور طوفان سے پہلے فصل کو بچا لیا جائے۔

رمیش ٹریکٹر کو اس طرح چلا رہا تھا جیسے وہ ٹریکٹر نہ ہو ٹینک ہو اور وہ گیہوں کی فصل نہ کاٹ رہا ہو بلکہ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔

مگر گنگوا بڑی بے فکری سے اپنا ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ ایک دیہاتی گیت گنگناتا جا رہا تھا۔ آرک کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے ٹریکٹر کی سیدھ میں بکھیا کی بیٹی گوری درانتی چلا رہی ہے۔ گوری جو دراصل سانولی تھی مگر اس روشنی میں کتنی سندر دکھائی دیتی تھی وہ! گوری جو بچپن میں گنگوا کے ساتھ کھیلی ہوئی تھی مگر اب ایک دو برس سے اس سے شرمانے اور گھونگھٹ کرنے لگی تھی۔ "او گوری! ہٹ جا سامنے سے، گنگوا مہاراج کی سواری آتی ہے۔" وہ ہنس کر چلّایا۔ اور گوری میں بھی اس وقت نہ جانے کہاں سے ہمت آ گئی۔ درانتی ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئی۔ "ارے جاؤ جاؤ، اپنا رستہ لو۔ گوری کی درانتی تمہارے ٹریکٹر پھریکٹر سے جیادہ پھسل کاٹ دے سکتی ہے۔"

کچھ ہی دور پر گنگوا کا باپ اپنے بوڑھے، جھریاں پڑے ہاتھ سے درانتی چلا رہا تھا۔

اس کے قریب گوری کے چھوٹے بھائی بہن منوا اور رجی چھوٹی چھوٹی درانتیاں لئے کام کر رہے تھے۔

اور کھیت کی مینڈھ پر کھڑی اوشا یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اور سب کام کر رہے ہیں اور وہ بے کار ہے۔

اس نے دیکھا ایک بوڑھی عورت کانپتے ہوئے ہاتھوں سے درانتی چلا رہی ہے مگر شاید اس کی چندھی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اوشا نے سوچا "کہیں یہ بے چاری اپنا ہاتھ نہ کاٹ لے۔"

"لاؤ ماں جی مجھے دو، تم آرام کرو۔" اس نے بڑھیا سے درانتی چھینتے ہوئے کہا۔ مگر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کٹائی کا کام جو دیکھنے میں بہت آسان معلوم ہوتا تھا، اتنا آسان نہیں ہے۔ زمین پر اکڑوں بیٹھنے سے اس کی ٹانگیں اکڑ گئیں۔ اس کی ریشمی ساڑھی کانٹوں میں الجھ کر پھٹ گئی۔ گیہوں کی سخت بالوں سے اس کے ہاتھوں اور بانہوں پر خراشیں پڑ گئیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے جڑیں پکڑ کر درانتی چلائی مگر درانتی پھسل گئی۔ ایک ڈنٹھل بھی نہ کٹا۔ ایک بار تو اس نے اپنا ہاتھ ہی کاٹ لیا۔ "ہائے رام، میں بھی کتنی بے کار ہوں، اتنا کام بھی نہیں کر سکتی" اس نے سوچا۔ اتنے میں گوری کی بہن رجی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "کاکی ایسے نہیں ایسے کاٹتے ہیں۔" اور اس نے درانتی چلا کر دکھایا کہ اسے سیدھا نہیں کسی قدر ٹیڑھا کر کے چلاتے ہیں۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے۔" رمیش غصے سے چلایا جب اس نے دیکھا کہ عین اس کے ٹریکٹر کی سیدھ میں کوئی عورت فصل کاٹ رہی ہے۔

"کون؟ اوشا — تم؟"

"ہاں تو اور کیا؟ —— تم سمجھتے ہو میں اتنا کام بھی نہیں کر سکتی۔"

"شاباش۔ بس اب تھوڑا سا کھیت رہ گیا ہے۔ تم ان سب عورتوں سے کہو جتنی کٹائی ہو گئی ہے اسے اٹھا کر گوداموں میں رکھیں اور ذرا جلدی۔ یہ دیکھو بوندیں پڑنے لگی ہیں۔"

اوشا کے ہاتھوں پر جو زندگی میں پہلی بار جسمانی مشقت سے گرم اور چُور ہو رہے تھے بارش کی ایک بوند گری اور وہ چلائی "ارے سب جلدی کرو۔ جلدی۔" اس نے دیکھا کہ گوری کٹی ہوئی فصل کا ایک بہت بڑا گٹھا سر پر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور وہ فوراً اس کی مدد کو دوڑی۔

جیسے ہی بوندیں گرنی شروع ہوئیں، ہر ایک کے کام میں تیزی آ گئی۔ درانتیاں زور سے چلنے لگیں، ٹریکٹروں کی گڑگڑاہٹ میں تیزی ہو گئی، فصل ڈھونے والوں کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔

اور پھر فتح کا وہ لمحہ آیا جب رمیش نے دیکھا کہ کھیت کا آخری کونہ بھی اب اس کے ٹریکٹر کی زد میں آ گیا ہے۔ اب بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ کٹی ہوئی فصل اڑنے لگی تھی، مگر کام کرنے والے ہوشیار تھے۔ انہوں نے گیہوں کی ایک بال کو بھی اڑ کر کھیت سے باہر نہ جانے دیا تھا۔

"گنگوا! بس!" رمیش چلایا "ٹریکٹروں کو واپس لے چلو نہیں تو بھیگ کر خراب ہو جائیں گے۔"

اسی دم بارش شروع ہو گئی اور رمیش کے ساتھ دیپ کی آواز فضا میں گونجی "کٹ!" رمیش نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا۔ دیپ کیمرے کے اوپر چھتری سنبھالے کھڑا تھا۔

"کیا تم نے اس سب کا فلم اتارا ہے؟" رمیش نے کسی قدر چڑ کر اس سے پوچھا۔

"ہاں، اور کیا؟ ایسا سین روز روز تھوڑا ہی ملتا ہے۔ کیا کلائمکس بنا ہے۔ مزا آ گیا۔"

اور رمیش نے سوچا یہ فلم والے زندگی کو بس اپنے ہی زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ان کی بلا سے کوئی مرے کوئی جئے، کال پڑے یا باڑھ آئے فصل جل جائے یا بہہ جائے یہ اپنے کیمرے چلاتے رہتے ہیں۔ اپنے فلمی کلائمکس ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

"مگر تمہارے فلم کے کلائمکس میں تو ہیرو ٹریکٹر چھوڑ کر گاتا ہوا ہیروئن کے پیچھے بھاگتا تھا۔" اس نے جل کر کہا۔

"وہ سب بدل گیا۔ اب کلائمکس یہی ہو گا۔"

اب موسلا دھار بارش گر رہی تھی۔ اوشا جس کی پھٹی ہوئی ساڑھی شرابور ہو کر اس کے بدن سے چپک گئی تھی، دور سے چلائی

"ارے بھئی بحث گھر چل کر کرنا، بھیگ کر نمونیہ کرنا ہے کیا؟"

"رمیش بابو، رمیش بابو؟" کوئی ندی کی طرف سے دوڑا چلا آ رہا تھا۔

"کیا ہے ماتا دین؟"

اس سے پہلے کہ ماتا دین کوئی جواب دیتا ایک آرک لیمپ دھماکے کے ساتھ پھٹا، جلتے ہوئے بلب پر بارش کی بوند گر گئی اور یکلخت سامنے کے سارے لیمپ فیوز ہو گئے۔ اندھیرے میں آواز آئی "رمیش بابو ندی میں باڑھ آ گئی ہے۔"

رمیش نے ایسے خطرے کے لئے فارم پر ریت کے بورے بھروا کر رکھے تھے۔ وہ چلایا "گنگوا! ماتا دین! سب لوگوں کو ساتھ لو اور ریت کی بوریاں ندی کے کنارے پہنچاؤ۔ میں بھی وہیں جاتا ہوں۔"

بجلی چمکی تو اس نے دیکھا اوشا اور دیپ ابھی تک وہیں کھڑے بھیگ رہے ہیں۔ "اوشا تم گھر جاؤ اور دیپ صاحب آپ بھی اپنے لوگوں اور سامان کو خیموں سے نکال کر ہمارے گھر میں لے آئیے۔"

"یہ سب کام میرے آدمی دیکھ لیں گے، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

اندھیرے کو مخاطب کر کے رمیش نے کہا اور اس کے انداز میں سختی اور جلن تھی۔ "یہ جان جوکھوں کا کام ہے، مسٹر دیپ کوئی فلم کا سین نہیں لیا جا رہا ہے۔"

جب وہ ندی کے کنارے پہنچا جہاں بند کو توڑ کر پانی کا ایک تیز دھارا نشیب کی طرف بہہ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ فارم کے سب لوگ جو تھوڑی دیر ہوئی درانتیاں چلا رہے تھے، اب ریت کی بوریاں اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں۔ رمیش ان کو بند کے ٹوٹے ہوئے حصے میں ڈلوا رہا تھا "ادھر نہیں اُدھر — ارے یہ بوری ادھر رکھو۔" بجلی کوندی تو اس نے دیکھا کہ بوریاں رکھوانے والوں میں دیپ بھی ہے۔ حیرت اور غصے سے وہ چلایا "مسٹر دیپ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ جائیے جائیے آپ کو کچھ ہو گیا تو خواہ مخواہ الزام مجھ پر آئے گا۔"

مگر اسی دم اس کے ایک آدمی نے آ کر کہا "رمیش بابو، جلدی کیجئے بند ایک جگہ سے اور بھی ٹوٹ گیا ہے ......"

ساری رات بھر اندھیرے میں یہ مہم جاری رہی۔ یہاں تک کہ سویرے کا دھندلکا ہو گیا۔ بارش کا زور بھی کسی قدر رکا تھا، تھک کر رمیش اور دیپ دونوں ریت کی بوریوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گئے اور لوگ کام ختم کر کے اپنے اپنے گھر جانے لگے۔

"کہئے مسٹر دیپ کمار آپ جیسے فن کار کو تو اس رات میں اپنے فلموں کے لئے بڑا مواد ملا ہو گا؟" رقابت کی خلش اب تک اس کے دل میں چبھ رہی تھی۔

"اس میں کیا شک ہے۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ زندگی فلم سے بھی زیادہ دلچسپ اور ڈرامیٹک ہے۔"

"جی ہاں! آپ کو تو یہ سب بھی فلم کا سینریو ہی معلوم ہوتا ہو گا۔ ہیرو اور ولین دونوں موجود ہیں۔" اس نے دیپ کمار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "صرف ہیروئن کی کمی ہے۔"

"تو لیجئے، ہیروئن بھی آ پہنچی۔" دیپ کمار نے جو کھیتوں کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا اُدھر اشارہ کیا۔ رمیش نے دیکھا اس کی برساتی پہنے، پایاب کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اوشا چلی آ رہی ہے۔ جب وہ قریب آئی تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے کندھوں پر تھرموس لٹکی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھوں میں بسکٹوں کا ڈبہ ہے۔

"آپ لوگوں کے لئے چائے لائی ہوں۔" اس نے کہا "رات بھر بھیگے ہیں کہیں سردی نہ لگ جائے۔"

وہ گلاس میں چائے انڈیل رہی تھی کہ ندی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دیپ کمار زور سے چھینکا۔

"پہلے انہیں دو۔ یہ بمبئی کے نازک لوگ ہیں، کہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔" ایسے کچھ کے لگانے میں رمیش کو ایک عجیب مزا آرہا تھا۔
دونوں کو چلتے دے کر اوشا کنارے کی طرف گئی۔ جہاں سے بند ٹوٹا تھا اس جگہ کو جھک کر دیکھنے لگی۔" یہ سارا حصہ ٹوٹ گیا تھا کیا؟
بڑی خیریت ہوئی کہ تم لوگ آگئے نہیں تو......"

اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اس کے بھیگے ہوئے سینڈل کنارے کی چکنی مٹی پر پھسلے اور وہ ندی کے تیز رفتار دھارے میں جا پڑی۔

"اوشا!" دیپ اور رمیش بے اختیار چلا پڑے اور اس سے پہلے کہ رمیش کچھ کرے دیپ کمار پانی میں کود گیا۔

رمیش جو تیراکی کا ماہر تھا، کچھ دور کنارے کنارے بہاؤ کے رُخ دوڑا پھر پانی میں کودا اور کودتے ہی اسے معلوم ہوا کہ اسے اوشا کو ہی نہیں دیپ کو بھی بچانا پڑے گا۔ اوشا کو رمیش نے تھوڑا بہت تیرنا سکھایا تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ صرف تیز بہاؤ کا ڈر تھا کہ کہیں سے کہیں نہ پہنچا دے۔ لیکن دیپ؟ اس کو تو ہاتھ پاؤں مارنا بھی نہیں آتا تھا۔ ڈبکیوں پر ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ رمیش نے پہلے اسے سنبھالنا چاہا مگر دیپ نے گھبرا کر رمیش کو اس بُری طرح پکڑ لیا کہ اسے بھی نیچے لے بیٹھا۔ ایک ڈبکی کھا کر جب دونوں ایک دوسرے ہی گتھے پانی کے اوپر آئے تو تیرتے تیرتے اوشا یہ دیکھ کر چیخ پڑی کہ رمیش نے ایک زور کا گھونسا دیپ کی کنپٹی پر رسید کیا اور وہ بے چارا بے ہوش ہو کر الٹ گیا، مگر اسی دم رمیش نے اس کے گھونگریالے بال مضبوطی سے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیے اور اسی طرح اسے گھسیٹتا داہنے ہاتھ سے تیرتا اوشا کے قریب پہنچا۔ تھک کر اور بوجھل برساتی میں اُلجھ کر وہ بھی ڈبکی کھانے ہی والی تھی کہ رمیش اس کے قریب پہنچ گیا اور اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک زور کا جھٹکا مار کر برساتی کو اتار پھینکا۔ پھر اوشا کی طرف داہنا ہاتھ بڑھا کر چلایا۔ "میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لو اوشا، اور کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کرو، مجھے اس بجر بٹو کو بھی سنبھالنا ہے۔"

جان کے خطرے کے باوجود بجر بٹو کا لفظ سُن کر اور دیپ کمار کے بے ہوش چہرے کو دیکھ کر اوشا کو ہنسی آگئی۔ اور جب اس نے رمیش کے ٹریکٹر چلانے والے مضبوط ہاتھ کی گرفت اپنے ہاتھ پر محسوس کی تو اس کو ایسا لگا کہ طوفان ختم گیا ہے، اور اب اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

گنگوا

دیپ کمار پروڈکشنز والوں کو اسٹیشن پر چھوڑ کر رمیش اور اوشا جیپ میں واپس آرہے تھے۔
"رمیش!"
"ہوں!"
"مجھے معاف کر دیا تم نے؟"
"قصور تو میرا تھا اوشا"
تمہارا؟"
"ہاں میرا۔ گلاب کے پھول بھی زندگی میں اتنے ہی اہم ہیں جتنے گیہوں۔"
"پھر؟"
"پھر میں نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ فارم کے لوگوں کے لئے ایک سینما ہونا چاہئے تاکہ ہم لوگ بھی دیپ کمار کے فلم دیکھ سکیں خصوصاً اس کا اگلا فلم 'نیا ہندوستان' جس کی شوٹنگ ہمارے فارم پر ہوئی ہے۔"

"اور؟"

"اور اس سال چھٹی ملے گی تو میں پچھلے سال کی طرح یہیں بیٹھ کر ریسرچ نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"ہم دونوں بمبئی جائیں گے۔ دیپ کمار نے اپنے سٹوڈیو میں آنے کی دعوت دی ہے۔ اس کی شوٹنگ دیکھیں گے۔"

"مجھے شوٹنگ دیکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے۔"

"مگر مجھے تو شوق ہے۔ میں دیپ کمار کو اس کے اپنے کام کے ماحول میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بُرا آدمی نہیں ہے مگر ہر آدمی کا اپنا کام ہوتا ہے، اپنا ماحول ہوتا ہے، اس کے باہر وہ بوکھلا جاتا ہے، جیسے ندی میں کود کر وہ بے چارہ بوکھلا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سٹوڈیو میں مجھے کیمرے کے سامنے میک اپ کر کے کھڑا کر دیا جائے تو ڈر کے مارے مجھے پسینہ آجائے۔ جانتی ہو جاتے جاتے دیپ مجھ سے کیا کہہ گیا ہے؟ کہتا تھا رمیش تمہارے فارم پر ان پندرہ دنوں میں میں نے زندگی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس نئی سمجھ بوجھ کی جھلک تمہیں میرے فلموں میں ملے گی۔ تب ہی تو میں یہاں سینما بنوانا چاہتا ہوں اور دیپ کمار کی فلمیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"پھر دیپ کمار کا ذکر؟"

"کیوں تم اس سے خفا معلوم ہوتی ہو۔ تم سے الگ کچھ کہہ رہا تھا۔ لگتا ہے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی جس سے تم ناراض ہو گئیں۔"

"وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کہنے لگا مسز رمیش آپ فلموں میں کامیاب نہیں ہو سکتیں آپ کی آنکھیں کسی قدر بڑی اور آپ کی ناک کسی قدر چھوٹی ہے۔ آیا بڑی لمبی ناک والا۔"

اتنے میں گھر آگیا، جیپ سے اتر کر رمیش نے اوشا کو سہارا دے کر اتارا۔ پھر بولا "آؤ اب میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔"

"دکھاؤ، تو پھر میں بھی تمہیں ایک بات بتاؤں گی۔"

"وہ دیکھو۔ تمہارے گلاب کتنے خوبصورت پھول کھلے ......"

گلاب کی جھاڑیاں مکان کے پیچھے باغ میں لگی ہوئی تھیں مگر ان میں پھول ایک بھی نہیں تھا۔

"یہ پھول کس نے چرائے؟"

"میں نے، رمیش بابو!"

گنگوا کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کی جھولی میں سرخ گلابی اور سفید گلاب کے تازہ تازہ پھول بھرے ہوئے تھے۔

"شما کیجئے گا، رمیش بابو! میں نے آپ کی آگیا بنا یہ پھول توڑ لئے۔ مگر بات یہ ہے کہ آج میری شادی ہے...... سو میں نے...... مگر آپ کو چاہئیں تو یہ لیجئے......"

"نہیں گنگوا" اوشا جلدی سے بولی "تم سب پھول لے جاؤ اور میری طرف سے دلہن کو بھینٹ دینا اور ہاں شادی ہو جائے تو گلاب کی ایک قلم یہاں سے لے جانا اور اپنے گھر کے باہر ضرور لگانا۔ سمجھے؟"

"جی ضرور — تو میں یہ سب لے جاؤں؟"

"لے جاؤ" رمیش نے اجازت دے دی "مگر ایک پھول مجھے دے جاؤ" اور اس نے ایک خون کے رنگ کا سرخ گلاب چھین لیا۔ گنگوا چلا گیا۔

"دیکھا تم نے گنگوا بھی گلاب کے پھولوں کو کتنا پسند کرتا ہے؟"

"مگر یہ بھی دیکھا کہ گنگوا ٹریکٹر چلا کہ گیہوں کتنا پیدا کرتا ہے۔"
"گنگوا بڑا خوش نظر آتا ہے نا!"
"شادی بھی تو گوری سے ہو رہی ہے، جانتے ہو کتنی خوبصورت ہے وہ؟"
"تم سے زیادہ خوبصورت تھوڑا ہی ہے؟"
"گنگوا کے دل سے پوچھو۔"
"اچھا تو میرے دل سے بھی پوچھو۔" اور یہ کہہ کر اس نے آشا کے جوڑے میں گلاب کا پھول لگا دیا اور اس کے بالوں کو ہلکے سے چومتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ وہ بات۔"
"تو لاؤ کان یہاں۔"
"سچ!"
"ہوں!"
"ایک چھوٹی سی منی سی اوشا۔"
"اونہوں۔ ایک چھوٹا سا منا سا رمیش۔"
"اوشا! وہ دیکھو۔"
اوشا نے مڑ کر دیکھا۔
گلاب کی جھاڑیوں پر ایک چھوٹی سی منی سی گلابی گلابی کلی ایک معصوم نوزائیدہ بچے کی طرح مسکرا رہی تھی۔

شرپا

ممتاز مفتی

"افسانہ نویس!"

اسے دیکھ کر میں چونکا۔ نہ تو اس کے چہرے سے کسی افسانے کا اظہار ہوتا تھا اور نہ ہی پیشانی پر افسانہ نویسی کی جھلک تھی۔ البتہ اس کی محروم آنکھوں، ڈھلکے ہوئے گالوں اور بے حس خدوخال کی اوٹ میں افسانہ بننے کی ایک دم توڑتی ہوئی خواہش سمٹی ہوئی تھی۔ "افسانہ نویس" میں نے زیرِ لب دہرایا۔ آپ کا اسمِ گرامی۔

"عمر"

"عمر ——" میرا جی چاہا کہ قہقہہ مار کر ہنس دوں۔ مگر عمر کی بڑی بڑی بھیگی آنکھوں میں محرومی اور بے بسی دیکھ کر وہ قہقہہ گھٹ کر رہ گیا۔

اس وقت ہم مری کے ایک ویران ٹیلے پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف بھیگا بھیگا اداس سبزہ پھیلا ہوا تھا اور دور "دھوڑی" کا سفید دھواں روئی کے گالوں کی طرح اُٹھ رہا تھا۔ "وہ دیکھو وہ ——" اشفاق چلایا۔ "وہ پھر دریاں جھاڑنے لگے۔ توبہ کس قدر گرد ہوتی ہے یہاں کی دریوں میں۔ بہت شادیاں ہوتی ہیں یہاں کے گاؤں میں، روز دریاں جھاڑتے رہتے ہیں۔"

عمر نے غور سے اشفاق کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگا "یہ نہیں صاحب یہ گرد نہیں بادل ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کبھی پہاڑ پر نہیں آئے۔"

"اچھا جی!" اشفاق نے اُلّو کے پٹھے کی سی شکل بنا کر کہا۔ "ویسے دو بار ہمالیہ جانے کا اتفاق ہوا ہے مجھے۔" وہ گردن کھجانے لگا لیکن عمر اس دوران میں "دھوڑی" میں لٹکی ہوئی چوٹیوں میں کھو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اسے ہمارے وجود تک کا احساس نہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں نکٹائی کا سرا تھام رکھا تھا۔ آنکھوں میں ایک غیر مرئی چمک لہرا رہی تھی، ہونٹوں کے خم میں محرومیت کے باوجود مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔ اس کے گال کسی ان جانے شوق سے تمتمانے لگے تھے۔ اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے وہ افسانہ نویس نہیں بلکہ ایک "شرپا" ہو جو کسی برفیلی چوٹی پر اپنا جھنڈا گاڑنے کے خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے اشفاق کی طرف پرمعنی نگاہ سے دیکھا اور اشفاق نے حسبِ عادت ایک مختصر سے اشارے سے عمر کی شخصیت پر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اشفاق نے انگلی سے اپنا گال یوں پونچھا جیسے آنسو خشک کر رہا ہو۔

عمر سے وہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لیکن آج چار سال کے بعد بھی اس کے متعلق میری رائے نہیں بدلی، وہ آنکھ سے گرا ہوا آنسو ہے جس کی تمام تر خواہش یہ ہے کہ کوئی حسین مخروطی انگلی بہ رعنائی اور جمیل جنبش سے اسے پونچھ دے۔

ممکن ہے کہ آپ نے بھی کبھی عمر کو پشاور روڈ پر سائیکل چلاتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس کے چہرے پر بے حسی کی ایک موٹی تہہ چڑھی ہوتی ہے گال گلوں پر ڈھلکے ہوتے ہیں۔ آنکھیں معصوم اکتاہٹ سے بھری ہوتی ہیں، پیشانی پر شکن ہوتی ہے اور سر کندھوں پر یوں رکھا ہوتا ہے جیسے کیلوں سے ٹھونک دیا ہو۔ لیکن نہیں ——— راولپنڈی میں آپ عمر کو نہیں دیکھ سکتے۔ اسے دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اسے شہر سے دور لے جائیں ——— دور مری کے ٹیلوں پر، پہاڑوں کی چوٹیوں کے قریب جہاں وہ روز دریاں بچھاتے ہیں اور گرد اڑتی ہے، جہاں شام کو آسمان میں آگ لگ جاتی ہے اور صبح سویرے فضا میں دودھ کے دھارے ابلتے ہیں اور برف سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے دھرتی کی دیوی نے عنفوانِ شباب میں قدم رکھ دیا ہو۔

عمر کو ان پھول دار وادیوں سے محبت ہے جو پہاڑوں کے ڈھلانوں پر بچھی ہوتی ہیں۔ اس گھروندے سے محبت ہے جو برسات میں اُگ آتی ہے۔ اسے اس سرزمین سے عشق ہے جہاں ہر موڑ ایک نیا منظر چھپائے ہوتا ہے۔ اسے ہموار زمین سے چڑ ہے۔ خالی پھیلاؤ اس کے لئے جاذبِ نظر نہیں، وہ زیر و بم کا متوالا ہے اور "ہمواریت" کو موت کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کی انتہائی خواہش ہے کہ زندگی میں زیر و بم کی حرکت قائم رہے اسے سب سے بڑا ڈر یہ ہے کہ "ہمواریت" کے ہاتھوں اس کی زندگی فنا ہو جائے۔

مری میں اس کی آمد کے چند روز بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ اس میں فطرت کی محبت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس روز برف باری ہو رہی تھی مسعود اور میں کمرے میں بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ "عجیب احمق ہو" وہ کمرے میں داخل ہو کر چلانے لگا۔ "یہ وقت کیا شطرنج کھیلنے کا ہے؟ ایسے خوبصورت منظر کو اپنے آپ پر حرام کر رہے ہو۔ یہ کیا حماقت ہے؟" عمر کے منہ سے اس وقت کف جاری تھا۔ پیشانی شکنوں سے بھری ہوئی تھی۔ گال تمتا رہے تھے اور وہ غصے میں یوں ہاتھ چلا رہا تھا جیسے تلوار سے ڈوئل کھیل رہا ہو۔ اس کے باوجود مسعود جو اس کا پرانا دوست تھا یوں بیٹھا کھیل رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

کچھ دیر تک ہمیں برا بھلا کہنے کے بعد وہ غصے میں باہر نکل گیا اور برآمدے میں کھڑا ہو کر درختوں اور جھاڑیوں کو ڈانٹنے لگا۔ پھر ٹھٹک کر وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا "کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ اندھے!" دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں منظر دکھانے کے لئے بیتاب نہیں بلکہ خود محتاج ہے، اس بات کا محتاج ہے کہ خوشی میں کوئی اس کا ساتھی ہو۔ ساتھی کے بغیر اسے اپنی سالمیت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ خوشی کا جذبہ تکمیل نہیں پا سکتا۔ میں نے مسعود سے کہا "چلو بھائی تمہارے بغیر اس کی زندگی حرام ہو رہی ہے" ہم دونوں نے برساتیاں اوڑھیں اور سونٹے پکڑ کر باہر نکل گئے۔

ہمیں برف پر چلتے دیکھ کر پہلے تو وہ غصے سے بھوت بن گیا "خبردار جو برف پر قدم رکھا تو خدا کی قسم میں ماروں گا" پھر وہ منتیں کرنے لگا "خدا کے لئے آگے نہ جاؤ۔ دیکھو نا اس حسین روئی کے گالوں پر پاؤں کا نشان لگ جائے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے سفید چادر میں لپٹی ہوئی پاکیزہ کنواری پر جارحانہ اقدام کیا ہو۔"

عمر دھرم سالہ کا رہنے والا ہے جہاں سے جنوب کی طرف کانگڑے کے پہاڑی ڈھلان پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کانگڑہ جہاں سیاہ فام عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کے دروازوں پر کھڑی یوں ہر راہ چلتے کی طرف دیکھتی ہیں جیسے روزِ ازل سے اسی کے انتظار میں کھڑی ہوں اور کام کاج میں مصروف ہونے کے باوجود واہیوں سے بیٹھے ہوئے مرد کی طرف بار بار یوں تکتی ہیں جیسے اس کا وجود کسی ڈھکی چھپی امید کا مرکز ہو۔ وہ کانگڑہ جہاں ڈھلانوں پر عورت کی نس نس سے پیاسِ حیات جھلکتی ہے اور پھر شمالی چوٹیوں کی طرف بتدریج بے حسی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ دھرم سالا

جس کے شمال میں سیاہ چٹانی چوٹیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں جنہیں دیکھ کر کوہ پیمائی کی خواہش انسان کو بیتاب کر دیتی ہے۔

عمر کی شخصیت وہرم سالا کے ان ڈھلانوں اور چٹانوں کی آمیزش سے بنی ہے، اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ دور کی سیاہ چوٹیوں کو جائے اور راستے میں ہر جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی ہوئی جوان عورت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے جیسے وہ روزِ ازل سے اسی کا انتظار کر رہی ہو اور وہ جھونپڑے میں داخل ہوئے بغیر اپنی راہ ناپتا ہوا چلا جائے۔

اسے جھونپڑے میں داخل ہوتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیونکہ وہ ازلی طور پر ڈرپوک واقع ہوا ہے اسے ہر اس چیز سے پیار ہے جو عورت کے قرب کی امید دلائے یا اس کا وعدہ کرے مگر عورت کے قرب سے وہ خائف ہے لیکن اگر وہ قرب کی امید سے محروم کر دیا جائے تو وہ کھو جاتا ہے اور اس کے پاؤں میں چلنے کی ہمت نہیں رہتی۔ وہ پانی سے خائف ہے مگر سراب کو دیکھ کر دیوانہ وار پانی کی تلاش میں چلے جانے کا دیوانہ ہے۔ بچپن ہی سے یہ دوعملی اس کے جذبات پر حاوی رہی۔ نوجوانی اس نے گرم ڈوگری عورتوں کی متلاشی نگاہوں کی حدت سے ڈر کر بھاگنے اور بے جس گدنوں کا تعاقب کرنے میں گزاری اور یوں کانگڑے کے مشتعل اور سرگرم خطے میں بھی وہ اپنے آپ کو محروم اور متلاشی بنائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ آج بھی عمر وہی محروم و متلاشی عمر ہے، اس کی تلاش محروم رہنے کا ایک ذریعہ ہے اور اس کی محرومیت تلاش کا ایک بہانہ ہے۔

عمر کے افسانوں میں بھی کانگڑہ اور کلو کی رنگین جھلکیاں موجود ہوتی ہیں۔ اسے منظر نگاری کا خبط ہے اور اس کی منظر نگاری میں منظر کی نسبت منگاری زیادہ ہوتی ہے اور پس منظر بار بار زبردستی پیش منظر میں یوں آگھستا ہے جیسے وہ ریڈیو کا راوی ہو اور پھر وہ کرداروں کی ذہنی کیفیت میں رنگ بھرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ عمر کی کہانیوں میں سبزہ کچھ زیادہ ہی سبز ہوتا ہے اور ڈھلانوں پر کچھ زیادہ ہی پھولدار قالیچے بچھے ہوتے ہیں جن سے گرد کچھ زیادہ ہی اڑتی ہے۔

خوبصورت جھونپڑوں میں جلتے ہوئے سنگری کوٹھوں کے قریب تپائیوں پر چائے کے برتن کچھ زیادہ ہی کھنکتے ہیں اور جب رنگین اور شوخ دوشیزائیں کچھ زیادہ ہی بے باک نگاہوں سے ہیرو کی طرف دیکھتی ہیں تو ان کے والدین آنکھیں جھکا لیتے ہیں جیسے دیکھنے کے لئے پگڈنڈیاں چپکے سے دبے پاؤں وادی سے اوپر چڑھ آتی ہیں۔ اس رنگین کھیل کو دیکھ کر شاخیں حال کھیلتی ہیں، پھول مسکراتے ہیں اور پنچھی گاتے ہیں۔

عمر کے افسانوں میں جذبات کا شیرا کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہوتا ہے حتیٰ کہ ہونٹ چپکنے لگتے ہیں۔ اسی لئے اس کی پہلی کہانی پڑھ کر میں ہنس دیا تھا۔ انہی دنوں اگر اتفاق سے میری ملاقات زرّی سے نہ ہوتی تو اب بھی میں اس کی کہانیوں پر ہنسا کرتا اور میرے دل میں ان کہانیوں کے لئے کوئی دلچسپی نہ ہوتی جو انسان کو سوچنے پر مائل نہیں کر سکتیں اور جن میں ایک واضح اور مضبوط مرکزی خیال نہیں ہوتا۔

زرّی کا خاندان ایک سبز ٹیلے کے پہلو میں ندی کے کنارے سُرخ جھونپڑے میں مقیم تھا۔ ایک روز پارک پور سے واپسی پر میں راستہ بھول کر اس جھونپڑے کی طرف جا نکلا۔ بڈھے زرّی نے دور سے مجھے دیکھا اور شوق سے میری طرف بڑھا۔ "آخا ——— آیئے۔ آیئے" وہ میری طرف دیکھ کر یوں چلّانے لگا جیسے میرا لنگوٹیا ہو۔ "آیئے نا اس طرف۔"

"جی ——— جی" میں نے اس سے راستہ پوچھنے کی کوشش کی۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "مجھے معلوم ہے آپ راستہ سے بھٹک گئے ہیں کوئی بات نہیں میاں یہاں جو بھی آتا ہے راستہ بھول کر آتا ہے۔ میں نے یہ جھونپڑا یہاں اسی لئے بنایا ہے کہ جو راستہ بھول کر آنکلے وہ دو گھڑی یہاں سستا سکے۔ آؤ میاں چلے آؤ بس ایک کافی کا گرم پیالہ اور پھر تم سیدھے چلے جانا۔ بیگم! بیگم!!" وہ چلّانے لگا "ذرا آؤ نا باہر کیتلی کو ٹھوں پر رکھ کر چلی آؤ۔ مہمان آئے ہیں۔"

بیگم زرّی ایک معمر عورت تھی جس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ منہ پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں مگر آنکھوں میں ایک عجیب سی تازگی اور چمک تھی۔ "پانی ابھی اُبل جائے گا۔ تم کافی پیو گے بیٹا یا چائے؟" مجھے ہچکچاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں گویا رس کی بوندیں اڑنے لگیں "تکلّف کی کوئی بات

نہیں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو بیٹا اس گھر کے سبھی لوگ تمہاری طرح راستہ بھولے ہوئے ہیں۔"

"ہی ہی ہی" بڈھے نے قہقہہ لگایا۔ "جب لوگ راستے پر چل رہے ہوتے ہیں تو ان میں فرعونیت کی جھلک ہوتی ہے اور جب وہ راستہ بھول کر بھٹک جاتے ہیں تو ان میں انسانیت کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔ بیگم اپنے منہ سے اپنی تعریف نہیں کیا کرتے۔ ہی ہی ہی" وہ پھر ہنسنے لگا بیگم نے مسرت سے دمکتی ہوئی نظر زری پر ڈالی اور اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔

"وہ دیکھو وہ ندی کا دھارا" بڈھا چلانے لگا۔ "وہ بھی راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہے اور وہ سبز پوش وادی بھی۔" وہ ہنسنے لگا۔

"بیٹا!" بیگم زری نے بہ آواز بلند پکارا "دیوہیٹڑ کافی ہو گئی کیا؟"

"لا رہی ہوں امی!" قریب ہی سے بل کھاتی ہوئی بہکی ہوئی آواز آئی۔ پانی کے دھارے کا شور مدھم پڑ گیا۔

پھر دروازہ کھل گیا دیا کیتلی اٹھائے کھڑی تھی اور میں نے محسوس کیا جیسے صراط مستقیم بذات خود میرے روبرو ہو۔ وادی پر سکوت طاری ہو گیا۔ موت کا سا سکوت ——— پھر مجھے معلوم نہیں دور بڈھا زری ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بیگم زری نہ جانے کیا گنگنا رہی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں، ایک دھندلکا چھا گیا تھا جس میں مژگاں تلے جھکی ہوئی صرف دو نیم باز شربتی آنکھیں روشن تھیں، جن میں سے رنگ کی بوندیاں اڑ رہی تھیں۔

اس روز واپسی پر پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ زمین پر سبزے کی جگہ پھولدار غالیچے بچھے ہیں اور ہوا چلتی نہیں بلکہ گدگداتی ہے اور پانی کے دھارے بہتے نہیں بلکہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

ہائیں! دفعتاً میں رک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ عمر کی لکھی ہوئی کوئی کہانی دہرا رہا ہوں۔ مجھے اس واقعہ کی حقیقت پر شک ہونے لگا۔ شاید وہ محض تخیل تھا۔ عمر کی کہانی کا ایک تاثر۔ گھر پہنچ کر میں بھاگا بھاگا عمر کی طرف گیا "یار بھئی کوئی اپنی کہانی تو دو۔"

"کہانی؟" عمر نے یوں میری طرف دیکھا جیسے اسے کہانی سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

عمر اپنی کہانیوں کی نمائش کرنے کی بجائے ان کے تذکرے پر ندامت محسوس کرتا ہے جیسے اس کی کہانیاں اس کے راستہ بھول نے اور بھٹک جانے کا واضح ثبوت ہوں۔ "اپنی کوئی سی کہانی دے دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے پڑھنا ہے۔" اس نے یوں مشکوک نگاہ سے میری طرف دیکھا جیسے کہانی کو پڑھنے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ "میرے پاس کوئی کہانی نہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"ارے یار!" میں نے اسے اطمینان دلانے کے لئے زری کی بات چھیڑ دی۔ "عجیب واقعہ ہوا ہے آج۔ بوندی سے واقف ہو نا جو گڑیال کے قریب واقع ہے وہاں سے راستہ بھول کر میں نہ جانے کہاں جا نکلا۔ وہاں ایک خوبصورت ڈھلان پر ایک سرخ جھونپڑے میں میری ان سے ملاقات ہوئی وہ رنگین بڈھا ———"

"زری کی بات کر رہے ہو؟" وہ ہنسنے لگا۔ "خوب لوگ ہیں وہ سب" اس کی آنکھوں میں دبی رس کی بوندیاں ناچنے لگیں، گال تمتما اٹھے اور ہونٹ حسرت زدہ مسرت سے کھل گئے۔ "لیکن" وہ بولا۔ "اگر تم ایبٹ آباد کی دادی اماں اور چیترہ کے مسٹر رنگلے اور کوہالہ کے عظمت خان سے ملو تو پاگل ہو جاؤ گے بالکل پاگل ——— ان کے جھونپڑے کتنے سادہ ہیں اور کیسے خوبصورت مقامات پر بنے ہوئے ہیں اور ان کی طبیعتیں گویا اندھیری رات میں پھلجھڑیاں ——— اور ان کی مہمان نوازی، محبت، اخلاق ———" وہ اس قدر مدھم آواز سے کہہ جا رہا تھا گویا مجھے سنانے کی بجائے خود ان لمحات سے گذر رہا ہو۔ پھر وہ میری موجودگی سے بھی بے خبر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہاڑوں کی چوٹیاں لہرا رہی تھیں، بھویں تنی ہوئی تھیں، ہاتھ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے شرپا "کے ٹو" کے خواب دیکھنے میں محو ہو اور "کے ٹو" کے سرسبز ڈھلانوں پر راہ سے بھٹکے ہوئے سرخ جھونپڑوں میں سے زری، دادی اماں، مسٹر رنگلے اور عظمت خان اسے اشارے کر رہے ہوں۔

عمر ایک دلچسپ مجموعۂ اضداد ہے۔ ازلی آوارہ ہونے کے باوجود اسے ان سرخ جھونپڑوں سے محبت ہے جن میں ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی ہے

اور جہاں ہر وقت ہر راہ گیر کے لئے کافی اور کریم کا پیالہ تیار رہتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں وہ افراد ملتے ہیں جو راستہ بھول آئے ہوں، جن کا برتاؤ بے حد غیر رسمی ہوتا ہے، جو بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں اور جن کی گفتگو میں امریکی بے تکلفی اور انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ عمر کو انگریزی تہذیب اور دورِ حاضرہ کی ملمع سے عشق ہے اسی وجہ سے اس کی شخصیت میں ایک انوکھا دوغلا پن ہے۔ بسا اوقات یہ تضاد اتنا نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عمر کو دیکھ کر میں یہ محسوس کرنے لگتا ہوں جیسے کسی بن مانس کو سوٹ پہنا کر ڈنر ٹیبل پر بٹھا دیا گیا ہو۔

اس تضاد کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مرم سالہ کے اس آوارہ منش کو دہلی عربک کالج میں تعلیم کے لئے بھیج دیا گیا اور یوں تن سنگھ اور ہلیری گڈمڈ ہو گئے۔ بن مانس اور ڈنر سوٹ خلط ملط ہو گئے اور اس دلچسپ اختلاط سے "آتش داں کے قریب" "ترلونڈی کی برف" "سراہ کے پھول" "سحر ہونے تک" "پس پردہ" "میم صاحب" "ذوبی" اور "مسلم ہوٹل" سے افسانے پیدا ہوئے جن کے پس منظر میں تن سنگھی مناظر پھیلے ہوتے ہیں اور کلوز اپ میں ہلیریانہ کردار رقص کرتے ہیں اور ان کرداروں میں کوئی تن سنگھی حسینہ ہلیریانہ انداز لئے پردۂ سیمیں پر ظاہر ہوتی ہے اور پھر منظر پر پھولدار غالیچے بچھ جاتے ہیں اور جذبات کی گرد اڑتی ہے۔

عمر سے پوچھئے بھئی تم کہانی کس طرح لکھتے ہو تو وہ شرما جائے گا جیسے کہانی لکھنا جرم یا گناہ ہو۔ اگر اصرار کیا جائے تو وہ مسکرا دے گا "بس لکھ دیتا ہوں اور کیا" —— "آخر کسی بات سے متاثر ہو کر لکھتے ہو گے نا" —— "متاثر!" وہ حیرانی سے آپ کی طرف دیکھے گا۔ "بھئی یہ سب کچھ، یہ مناظر، یہ قہقہے، یہ آنسو جو جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور پلاٹ تو خود بخود بن جاتا ہے خود بخود"

عمر سے ایسے سوالات پوچھنا بے کار ہے کیونکہ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیوں اور کیا لکھتا ہے۔ اس کی تحریروں کو خیال، یا سوچ بچار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ جذبات کے بل بوتے پر لکھتا ہے۔ اس نے کبھی افسانے کے مرکزی خیال کے متعلق سوچنے کی کوشش نہیں کی اور یہی اس کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ اس کی کہانیاں مرکزی خیال سے بوجھل نہیں ہو پاتیں اور انہیں پڑھتے ہوئے قاری کو جذبات سے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ سوچے۔

بات کرتے ہوئے وہ چمکیلے فقرے دہرانے کا عادی ہے، ایسے فقرے جو اس نے انگریزی کی کتابوں میں پڑھے ہوئے ہیں مگر عمر اپنی افسانہ نویسی یا تحریکِ افسانہ نویسی کے متعلق کوئی جملہ کہہ دے تو یقین کیجئے اس کی حیثیت ہاتھی دانت کی سی ہوگی۔ عمر کے افسانے تحریک کے محتاج نہیں۔ گرد و پیش کے واقعات سے وہ عموماً بیگانہ رہتا ہے۔ اسے اپنی تن سنگھیت سے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ گرد و پیش کی طرف دیکھ سکے۔ وہ راہ چلتے ہوئے عموماً راہ سے بھٹک کر کسی زری کے جھونپڑے کے گرد گھومتا رہتا اور پھر ایک روز قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے اور یہ جانے بغیر کہ وہ "ترلونڈی کی برف" لکھنے والا ہے یا "میم صاحب" بے سوچے سمجھے لکھے جاتا ہے۔ پھر اس کی آنکھوں تلے سرخ جھونپڑے آ کھڑے ہوتے ہیں اور زری قہقہے لگاتے ہیں پھر کوئی دروازہ کھل جاتا ہے اور ربنا کچھ کہے بغیر داخل ہو جاتی ہے اور اس کی شربتی آنکھوں سے رس کی بوندیاں برستی ہیں اور کرداروں کے ساتھ ساتھ قاری بھی بھیگ جاتا ہے۔

عمر کے افسانے درحقیقت اس کے عالمِ بیداری کے خواب ہیں اس کے افسانوں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور وہ سب بلا کی شوخ اور تیز ہوتی ہیں اور محبت کی تحریک لڑکی کی طرف سے ہوتی ہے اور بے وفائی ہمیشہ مرد کی طرف سے، اس لحاظ سے عمر کے افسانے سنگیت کی ٹھمریاں ہیں جن میں اظہارِ محبت ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور بے پروائی مرد کی طرف سے۔ عمر کے یہ جاگتے کے خواب اس کے سوتے کے خوابوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ نیند میں بھی وہ لڑکیوں کے جھرمٹ دیکھتا ہے اور وہ لڑکیاں اس پر ہنستی ہیں، اسے گدگداتی ہیں۔

افسانوں کے علاوہ جاگتے میں اس کا محبوب ترین خواب بھی شانِ محبوبیت کا غماز ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے اور اس کے

جنازے کے گرد لوگ کھڑے اس کی باتیں کر رہے ہیں اور پھر اس کی موت کی خبر فلاں تک پہنچی ہے اور پھر فلاں تک اور عمر چھپ کر کھڑا دیکھتا ہے اور سنتا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور یہ خبر سن کر ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔

عمر سے اس جاگتے کے خواب کی وجہ پوچھو تو وہ کہے گا بھئی ظاہر ہے کہ مجھے اپنے دوستوں سے دلچسپی ہے اور اسی لئے میں ان کے جذبات سے واقف ہونے کا خواہش مند ہوں۔ عمر کو اس امر کا احساس نہیں کہ وہ اپنے دوستوں سے اس حد تک مایوس ہو چکا ہے کہ لاشعوری طور پر اسے یقین ہو چکا ہے کہ جیتے جی احباب نے اس کی قدر نہیں کی، البتہ اس کی موت کی خبر سن کر دفعتاً وہ چونک کر محسوس کریں گے کہ انہوں نے کیا کھو دیا، وہ ایک لمحہ عمر کے لئے کس قدر فتحمندی کا ہوگا، اس لمحے کو حاصل کرنے کے لئے عمر مرنے سے بھی گریز نہیں کرتا اور پھر چوری چوری اپنے دوستوں کے بین سن کر خوش ہوتا ہے یہ خواہش ایک حرماں نصیب عاشق کی ہی ہو سکتی ہے، ایک ایسے عاشق کی جسے محبوب کی نسبت حرماں نصیبی سے زیادہ لگاؤ ہے۔ عمر ایک ایسا ہی عاشق ہے لیکن اگر آپ اسے آئینہ کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھ لیں تو آپ اس کے انہماک کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور محسوس کریں گے جیسے وہ عمر نہیں بلکہ پانی کے کنارے اُگا ہوا نرگس کا پھول ہو۔

فرصت کا بیشتر وقت وہ بناؤ سنگار میں وقف کرتا ہے۔ خوبصورت کپڑے پہنتا ہے، مناسب ٹائی خریدنے کے لئے گھنٹوں کانوں پر مارا مارا پھرتا ہے۔ ذرا سی کوفت محسوس کرنے پر غسل خانے کی طرف دوڑتا ہے اور منہ دھونے اور بال بنانے کے بعد از سر نو تازہ دم ہو جاتا ہے۔ مسلسل سوچ بچار کے باوجود آج تک میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ عمر کی شخصیت میں محروم عاشق کہاں ختم ہوتا ہے اور کہاں محبوب اُبھر آتا ہے۔ افسانوں میں اس کا اپنا مرتبہ محبوب کا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی ہیروئن محبت کی تحریک شروع کرتی ہے اور عملی طور پر اسے پیش رہتی ہے۔ مجھے خود عمر کے افسانوں کی ہیروئن سے محبت ہے۔ مجھ سے ہر سست لذت پرست آدمی کو ایسی ہیروئن پسند ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اپنا افسانہ "آپا" لکھا تھا تو حسن عسکری نے مجھے ایک خط بھیجا جس میں برسبیل تذکرہ لکھا تھا "ہمیں بھی کسی ساجو باجی کا پتہ لکھ بھیجو۔" عسکری کے خط سے مجھے ایک گونہ تسلی ہو گئی ورنہ میں حیران تھا کہ لوگ "آپا" کے کردار کو کیوں پسند کرتے ہیں۔

عمر کو چنچل ہیروئن اس لئے پسند نہیں ہو سکتی جس وجہ سے وہ مجھے پسند آتی ہے کیونکہ عمر سست آدمی نہیں۔ البتہ وہ تو ضرورت سے زیادہ چست ہے۔ شاید اس کی وجہ محبوبیت ہے لیکن عمر کی شخصیت کو سمجھنا کچھ ایسا آسان نہیں۔ اس کی شخصیت دوسری جماعت کے بچے کی جیب کی سی ہے جس میں رنگین بتی، ٹوٹی ہوئی گھڑی کی چابی، چنے، چاک، سیاہی اور چمکیلے ورق بھرے ہوتے ہیں۔

عمر سے پوچھئے "بھئی تمہیں کیا پسند ہے؟" تو وہ غصہ سے آپ کی طرف دیکھے گا "کیا مطلب ——— مجھے وہی پسند ہے جو قابل پسند ہے اور کیا۔ مجھے بارش پسند ہے اندھیرا پسند ہے۔ بادل کی دھوڑی پیاری لگتی ہے اور برف جیسی سفید برف۔ یہی قابل پسند چیزیں ہیں اور کیا۔" "اور جھونپڑے کے دروازہ پر کھڑی منتظر لڑکی؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ "فضول باتیں۔" اس نے غصہ میں منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔" میں نے کہا "بھئی ایک بات کہوں تم سے تحلیل نفس کے اصولوں کے مطابق برف، بادل اور بارش تینوں پھیلے پھیلے دھندلکوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور گہری تشویش اور اضطراب کے نشان ہیں۔ "بکو نہیں!" اس نے غصہ سے میری طرف دیکھا اور بالوں کو ٹھیک کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

جوانی ہی میں ان لوگوں سے متاثر ہوتا تھا جو متوازن اور معقول تھے شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ اس زمانہ میں صرف ان لوگوں کی عزت ہوا کرتی تھی جو رسمی نقطہ نظر سے متوازن اور معقول ہوتے تھے اور صرف ان ہی کی بات کو درخور اعتنا مانا جاتا تھا۔ اسی لئے میں نے مطالعہ

کی ابتدا انھیں سے کی اب اور جب کہ میری حیات منجمد ہو چکی ہے جب کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ چکا ہوں ان افراد سے متاثر ہوتا ہوں جن کی شخصیت میں جذبات کا مد و جزر ہو زندگی کی فراوانی ہو۔

چند روز عمر کے ساتھ رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بھرپور زندگی کا مالک ہے اس محرومیت کے باوجود جو اس کے چہرے پر چھائی رہتی ہے، اس جھجک کے باوجود جو اسے بظاہر روکے رکھتی ہے۔ اس بن مانسیت کے باوجود جو اکثر اس پر مسلط رہتی ہے اس کی زندگی بھرپور ہے۔ دفتر کو جاتے ہوئے وہ کسی عمودی چٹان کی طرف دیکھ کر رُک جاتا۔ "تم چلو میں یہ شارٹ کٹ کروں گا۔"

"شارٹ کٹ—" میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا۔

"ہاں ہاں میں یہ شارٹ کٹ ٹرائی کرتا ہوں۔ مشکل ہے مگر کتنا مزا رہے گا۔" وہ بوٹ اتار کر بندر کی طرح چڑھنے لگتا۔

آدھی رات کے وقت وہ نیند سے بیدار ہو کر کوٹ پہن لیتا۔ "کیوں بھئی۔" وہ مجھے جھنجھوڑ کر جگاتا۔ "گھومنے پھرنے کے لئے چلو گے؟"

"ہائیں اس اس وقت برف باری میں۔" میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا۔ "اس وقت سیر کا موڈ ہے۔ باہر بلا کی چاندنی ہے اور وہ سامنے والا پہاڑ ایسا یوں ایستادہ ہے اس چاندنی میں جیسے سائن کلر کا ایک دل کش منظر ہو۔ اچھا میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ سونٹا اٹھا کر باہر نکل جاتا۔

کسی اشد ضروری کام کو جاتے ہوئے سینما کا پوسٹر دیکھ کر دفعتاً وہ رُک جاتا۔ "آؤ یار شو دیکھیں۔"

"ارے!" میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا۔ "اور وہ کام—؟"

"چھوڑو یار اس وقت سینما دیکھنے کا موڈ ہے چلو۔"

اس کی ایسی بے تکی باتیں سن کر بسا اوقات میں محسوس کرتا جیسے وہ عمر نہیں بلکہ عنفوانِ شباب سے سرشار ایک الھڑ دوشیزہ ہو جو موڈ کے سہارے کے بغیر جی ہی نہیں سکتی اور میں اس کا کوٹ بردار ہوں۔ پھر حسینہ کی جگہ عمر کا محروم اور ڈھلکا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے غصہ آجاتا۔

ان دنوں مہینے کے آخری دن تھے، صبح سویرے ہی وہ میرے پاس آیا۔ "آج سینما دیکھنے کا موڈ ہے۔" وہ بولا۔

"کوئی خاص فلم چل رہی ہے کیا؟"

"نہیں تو۔" وہ مسکرایا۔ "ویسے ہی سینما دیکھنے کا موڈ ہے۔"

"یہ تمہارے موڈ کیسے بنتے اور بگڑتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آ بھی جائیے۔" وہ بولا۔ "تو کیا فرق پڑے گا لیکن دقت یہ ہے کہ پیسہ نہیں ہے کوئی۔ تم کہو ہے کچھ؟"

"یہاں بھی اللہ کا نام ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ پروا نہیں۔" دفعتاً شرپا نمودار ہوا۔ "ہو کر لوں گا میں۔"

"اگر نہ ہوا تو؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ ہنسا اور باہر نکل گیا۔

سارا دن وہ نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرا۔ دوپہر کے قریب آ نمودار ہوا۔ "ہو گیا بھائی۔" اس نے پانچ کا نوٹ یوں لہرایا جیسے وہ اس کی کامیابی کا جھنڈا ہو۔

شام کو ہم دونوں سینما کی طرف چل دئے۔ موڑ پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ میں نے کہا ادھر سے کیوں نہ چلیں شارٹ کٹ ہے راستہ میں لال ٹین والیوں کا بازار ہے نا——پھر کیا ہوا۔"

لال ٹین والیوں کے بازار میں وہ رک گیا۔ "وہ دیکھو وہ سُرخ دوپٹے والی بیچاری کس قدر مغموم بیٹھی ہے۔ یار مجھے ترس آتا ہے۔ یہ کیا عیش پرستی کی جگہ ہے لاحول ولاقوۃ۔ دیکھو تو کتنی اُداسی چھائی ہے، حسرت کی تصاویر ہیں یہ سب۔ اچھا میں ذرا اس سے بات تو کر وں۔" وہ چلا گیا، اور چار ایک منٹ ایک لال ٹین کے قریب کھڑا ہو کر اس سے باتیں کرتا رہا پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے پاس یوں پہنچا جیسے کوئی تازہ والی سٹ سر کر کے آیا ہو۔ "چلو بھئی۔" وہ بولا "چلو سینما کو۔"

سینما گھر کے بکنگ آفس کے قریب وہ دفعتاً گھبرا گیا اور جیب ٹٹولتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنسا: "چلو گھر!" وہ چلّایا۔ "چلو۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کیا سینما کا موڈ نہیں رہا؟"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "پیسہ ہی نہیں کوئی۔"

"اور وہ پانچ کا نوٹ؟" میں نے پوچھا۔

"یار وہ تو میں نے اس کو دے دیا تھا۔ بے چاری کس پرسی کی حالت میں تھی۔"

"وہیں بتا دیا ہوتا۔" میں نے غصہ میں کہا۔

"مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" —— وہ غصے میں چلّایا۔ ایسے جملے کو غصہ میں ادا کرنا عمر ہی کا حصہ ہے آج تک مجھے صرف ایک واحد شخص سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے جو "مجھے معاف کر دو" کہتے ہوئے منہ سے جھاگ نکال سکتا۔

رہا عقل و دلیل کا سوال، تو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ عمر کو دلیل سے قائل کرنے کی بجائے آپ کوئی اور شغل فرمالیں تو بہتر ہوگا۔ تین سال گزرے ہیں جب میں نے اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی تھی۔ موضوع کیا تھا یہ مجھے یاد نہیں۔ میں نے بات مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا تھا۔ "دیکھو میری جان سیدھی سی بات ہے اگر تمام کوے کالے ہوں۔"

"اگر کیوں؟" وہ چلّایا۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ سبھی کالے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا: "بھائی جان فرض کر لو۔"

"خواہ مخواہ فرض کر لوں، فضول وقت ضائع کروں میں فرض کرنے میں لاحول ولاقوۃ۔" یہ کہتے ہوئے اس کے منہ سے تھوک کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور وہ یوں ہاتھ چلانے لگا جیسے تلوار سے "ڈوول" کھیلنے کی تیاری کر رہا ہو۔ اس کے بعد میں نے اسے دلیل سے سمجھانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ اگرچہ مسعود کا اب بھی یہ خیال ہے کہ غلطی میری تھی۔ مجھے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے "میری جان" نہیں کہنا چاہئے تھا بہر حال اس روز سے میں اسے بڑی احتیاط سے خطاب کرتا ہوں۔

عمر "اگر" کا قائل نہیں، وہ فرض نہیں کرتا بلکہ صرف وہی بات کرتا ہے جو اس کے نزدیک حقیقت ہے اور اس کے نزدیک وہی حقیقت ہے جو وہ محسوس کرتا ہے۔ وہ محسوسات کا ایک پلندا ہے، محسوسات ہی اس کا اوڑھنا اور وہی اس کا بچھونا ہیں۔ اس کے لئے سب سے بڑی دلیل جذبات سے بھرا ہوا ایک لفظ ہے۔ جذبات سے چھلکتی ہوئی ایک جنبش ہے اور وہ اس ایک جنبش اور ایک لفظ کو حاصل کرنے کے لئے سرگرداں ہے، لڑکی کی ایک انتہائی مسکراہٹ دیکھنے کے لئے وہ میلوں کا سفر طے کرنے کے لئے تیار ہے۔ ایک دوستانہ گونگا اشارہ دیکھنے کے لئے وہ گھنٹوں انتظار کر سکتا ہے۔ لیکن اس بھری ہوئی دنیا میں جب تنہائی کے احساس کی شدت اسے بے قرار کر دیتی ہے تو اس کی شخصیت کا ھگوڑا "ثریا" باہر نکل آتا ہے اور ایسی حالت میں یا تو وہ اپنا سونٹا پکڑ کر مری کی کسی چوٹی کی طرف نکل جاتا ہے او یا قلم اٹھا کر کرے میں آنکھیں موند کر ان وادیوں میں جا پہنچتا ہے جہاں سبھی راستہ بھول کر بھٹک کر آنکلے ہوتے ہیں، جہاں سبزے کی جگہ غالیچے بچھے ہوتے ہیں جن سے جذبات کی گرد اُڑتی ہے اور پھر کوئی "مینا" نمودار ہوتی ہے۔ جیتی جاگتی مینا —— اور پھر شربتی آنکھوں سے رس کی بوندیں اڑتی ہیں اور کردار کے ساتھ قاری بھی بھیگ جاتا ہے۔

بھاگ بھری

ہاجرہ مسرور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی ——— میڈیکل کالج کے زمانے میں اپنے آپ پر روپوں کی کیسی کیسی بارش نہ دیکھی تھی۔ اپنے بڑے بڑے پروفیسروں کی لمبی لمبی کاریں دیکھ کر آدمی اور سوچ بھی کیا سکتا ہے۔ مگر جب ڈگری لے کر اس بازار میں آئی تو معلوم ہوا کہ گلی کے اندر حقیر سے کمرے پر بورڈ لگا کر بیٹھنے سے وہی دولت واپس آنا مشکل ہے جو بیوہ ماں کے زیورات بک بک کر فیسوں اور کتابوں پر خرچ ہوئی ——— آگے چل کر میں نے کیا رُخ اختیار کیا، یہ ایک الگ قصہ ہے جس کا ذکر کرنا اس موقع پر ضروری نہیں۔

ہاں تو ان دنوں جب پہلی بار مجھے دُور دراز کے ایک گاؤں میں زچگی کا ایک کیس کرنے کی دعوت ملی تو میں کافی خوش ہوئی۔ بظاہر میں نے منہ بنایا اور اپنے بے شمار مریضوں کی پریشانی کا ذکر کیا لیکن جب سیدھے سادے مچیل پیغامبر نے میرا بھاؤ ایک دم بڑھا دیا تو میں فوراً تیار ہو گئی ——— دو سو روپے روز کے کم نہیں ہوتے۔ میں حیران رہ گئی کہ شہر کی دوسری چلتی ہوئی ڈاکٹرنیوں سے بچ کر یہ میرے پلّے کیسے پڑ گیا۔

میں نے جلدی سے اندر جا کر والدہ سے ذکر کیا لیکن وہ خوش ہونے کے بجائے کچھ پریشان ہو گئیں کہ بڑا دُور کی بات ہے، جوان کنواری لڑکی، لاکھ ڈاکٹر ہو پھر بھی ——— والدہ کی اس بات پر تو سچ میں بھی ذرا پریشان ہوئی، لیکن پھر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ دوڑ کر سائیکل پر جائے اور کالج میں کم از کم چھ دن کی چھٹی کی درخواست دے آئے اور ساتھ ہی میں نے گھر کی پرانی ملازمہ مائی کو سفید شلوار کرتا پہنوا کر بطور نرس ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا ——— جب میں واپس اپنے مطب کے اُجڑے کمرے میں گئی تو یہ بات بھی فوراً طے ہو گئی کہ نرس کو دس روپے روز ملیں گے۔

پھر میں نے پوچھا کہ وہاں ٹرین یا بس کس وقت جائے گی؟

"کار ساتھ لایا ہوں۔" جواب ملا۔

اور میں یہ سوچ کر پریشان ہوئی کہ دیہات سے شہر تک پہنچتے پہنچتے کار کہیں اتنی بے کار نہ ہو گئی ہو کہ راستے میں پریشانی اٹھانا پڑے۔

لیکن جب میں اپنے دو محافظوں کے ساتھ والدہ کو دعائیں پڑھتے چھوڑ کر نکلی اور گھٹ سٹے کے شرک پر آئی تو تازہ بتازہ کیڈی لک دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ ضرور بدل گیا ہوگا ——— میں پچھتائی کہ میں نے فیس اور زیادہ کیوں نہ مانگی۔

راستے میں میرے چھوٹے بھائی نے کرید کرید کر کئی بار یہ معلوم کیا کہ ہم ضلع سرگودھا کے ایک جاگیردار کے ہاں جا رہے ہیں۔ جاگیرداری منہ تیس کہ ولایت لاہور سے ڈاکٹرنی بچہ جنانے آئے ——— بڑے ارمانوں کی پہلی نسل تھی۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لاہور سے بالکل مختلف دنیا میں وارد ہوئے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڑی سی حویلی ہماری منزل تھی۔ بڑی سی بیٹھک کے دروازے پر پیلی پڑتی دھوپ میں ایک درجن شکاری کتوں کو شام کا راتب تقسیم ہو رہا تھا، اور دس بارہ آدمی ان کتوں کی زنجیروں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ہماری آمد پر وہ چونکے لیکن پھر کتوں کی زنجیروں پر جٹ گئے ——— اسی پیلی دھوپ میں گدے دار کرسی پر میرے دوسو روپے روز کے داتا، ملک گل نواز آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے ——— سفید سلک کی تہد اور نیلی سلک کی قمیص، سر پر بنیر کلاہ کی بھاری پگڑی ——— اور کلائی پر باز ——— باز، ملک کے ہاتھ پر رکھی ہوئی تازہ تازہ فاختہ کے پر بکھیر بکھیر کر گوشت نوچ رہا تھا ——— یہ وقت باز کے راتب کا بھی تھا۔ کیڈی لک کے اس مالک کا تصور میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر پھر بھی اس ماحول سے میں کافی مرعوب ہو گئی۔

"ڈاکٹرنی صاحب بڑی تکلیف اٹھائی آپ نے، میں آپ کو خوش کر دوں گا۔" ملک نے گہری نظروں اور بھاری آواز سے بیک وقت کہا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ملک صاحب کی صورت اس بادشاہ سے ملتی ہے جس کی تصویر میں نے اسکول کے زمانے کی کسی کتاب میں دیکھی تھی۔ ماتھے تک پیچ در پیچ بڑی سی پگڑی، بڑی گھنی مونچھیں، کرسی پر آلتی پالتی مارے اور ہاتھ پر باز بٹھائے ——— بس مانگ کیا مانگتا ہے کہنے کی کسر تھی۔

زنان خانے کا ماحول لباس اور سجاوٹ کی تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا عموماً ہمارے پرانے ٹھاٹ کے بڑے گھروں میں ہوتا ہے صحن میں رنگین پیڑھیوں پر کافی سے زیادہ عورتیں رنگین تہمد اور موٹی ریشمی کناروں والی چادریں لپیٹے متفکر شکلیں بنائے بیٹھی تھیں اور ایک کھیس سے ڈھکے ہوئے پلنگ پر ایک بوڑھی عورت فکرمند سی بیٹھی نسوار ٹھرک رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر کی بڑی بوڑھی ہوں گی۔ حقیقتاً یہی ملک کی والدہ بڑی ملکنی تھیں ——— مجھے امید تھی کہ وہ اٹھ کر میرا استقبال کریں گی۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ میں ٹھٹکتی ہوئی پلنگ کے قریب رک گئی۔

بڑی ملکنی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے دوشالے کا پلو سرکا کر گردن سے لے کر ناک تک ڈال لیا اور اب میں صرف اس کی تیز آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی جو مجھے سختی سے گھور رہی تھیں۔ مجھے اتنا غصہ آیا، اتنا کہ میں نے جی ہی جی میں دعا کی کاش ان سب عورتوں کے دردِ زہ ہونے لگے۔

"مریض کہاں ہے؟" میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ سب عورتیں جنگلی ہرنیوں کی طرح گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے حیرت سے گھورنے لگیں۔

"بیمار کہاں ہے؟" اب کے میری مائی نے انتہائی کرخت زبان میں سوال کیا۔

"اللہ کا نام لو، بیمار یہاں کہاں؟" ایک عورت نے دونوں طرف چھدی ہوئی ناک کی ٹاپس نما کیلیں چمکا کر بڑی ہی کرخت آواز میں جواب دیا ——— سب کی معاندانہ نظریں مجھی پر تھیں۔

میں نے سمجھا میں دیر میں پہنچی ہوں، اسی لئے سب کی نفرت کا نشانہ ہوں ——— شاید بے چاری ختم ہو چکی ——— اور میں افسوس میں ڈوبی ہوئی دوبارہ ملک صاحب کی صوفوں سے ٹھنسی ہوئی بیٹھک میں پہنچ گئی۔

"مجھے افسوس ہے ملک صاحب میں مریضہ کو نہیں دیکھ سکی۔" اور میں نے دیکھا کہ اس فقرے سے بھائی کے چہرے کا رنگ یوں اڑ گیا جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ ظاہر ہے بھائی کو تعلیم کے لئے فیس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر ملک صاحب کے پلے ہوئے چہرے پر کوئی اثر نمایاں نہ ہوا۔ "اوہ! ڈاکٹرنی صاحب میں نے ابھی تک والدہ سے ذکر نہیں کیا کہ لاہور سے

ڈاکٹرنی بلائی ہے۔" یہ کہہ کر ملک صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"مگر ملک صاحب اب اندر جانے سے کیا فائدہ؟" میں نے گردن جھکا کر کہا۔

"وہ ڈاکٹرنی صاحب آپ بُرا نہ مانیں جی' دراصل میری والدہ رسم و رواج کے خلاف جانا پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے میں نے ان سے پہلے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

لیکن گھر کے اندر پہنچ کر ملک اور بڑی ملکنی کی جھک جھک شروع ہو گئی۔ وہ بار بار میری طرف اشارہ کر کے منہ بنا بنا کر اپنے بیٹے سے کہتی ——— بیمار کہاں ہے؟ بیمار ——— ہنہ بیمار!

یہ قصہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ——— بعد میں ملک نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر دھیرے سے بتایا کہ بڑی ملکنی کو آپ کی یہ بات ناگوار گزری ہے کہ آپ نے پہلے پہل کی زچہ کو بیمار کہہ دیا ——— زچگی آپ جانتی ہیں بڑی مبارک چیز ہے ——— وغیرہ وغیرہ۔

"وہ سامنے محل میں ہے۔" ملک نے ایک کمرے کے دروازے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے گوہرِ مقصود کا پتہ دے رہے ہوں ——— اور میں بجائے ہنسنے کے کھسیا کر رہ گئی۔

لمبے سے ایک دروازے اور بغیر کھڑکی اور روشندان کے پُرانے طرز والے کمرے میں ہونے والی زچہ تھی۔ وہاں بھی کافی عورتیں تھیں' اور ایک سڑی ہوئی عورت اس کا پیٹ پکڑے بیٹھی تھی ——— ساتھ کئی عورتیں اس کا سر' ہاتھ' پاؤں دبا رہی تھیں ——— زچہ کا پلنگ ایک تاریک کونے میں تھا اور اس کے علاوہ کئی اور پلنگ بھی کھیسوں سے سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قسم قسم کے خوبصورت برتن' اور آئینوں سے آرائش اس حد تک تھی کہ دیوار بمشکل نظر آتی تھی ——— یہ محل تھا۔

زچہ تیس پینتیس سالہ عورت تھی اور اپنے علاقے کے تمام زیورات سے مزین ——— اگر اس کے درد نہ ہو رہا ہوتا تو کافی اچھی معلوم ہو سکتی تھی۔

میں نے مائی سے مخاطب ہو کر کہا کہ مریضہ کو فوراً اس گھٹنے اور گھٹے ہوئے کمرے سے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے۔

مائی نے عورتوں کے سامنے تجویز رکھی اور ہڑ سا مچ گیا۔ انگلیاں ناکوں اور دانتوں پر پہنچ گئیں ——— اور اس ہڑ میں بڑی ملکنی ہانپتی ہوئی آگئیں۔

میری تجویز ایوان کی متفقہ رائے سے مسترد ہو گئی' کیونکہ اس قسم کا کمرہ ہر گھر کا محل کہلاتا ہے اور ضروری ہے کہ گھر کی بہو اس جگہ اپنے بچے کو جنم دے۔

"عورتیں کمرہ خالی کر دیں۔" یہ میری دوسری تجویز ہوتی اگر پہلی تجویز منظور ہو جاتی تب ——— لہٰذا میں نے مائی سے کہا کہ وہ زچہ کے پاس کھیس کی اوٹ کر کے کھڑی ہو جائے تاکہ میں مریضہ کا معائنہ کر سکوں۔

پہلی زچگی تھی۔ مریضہ نے بتایا کہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد یہ دن پورے ہوئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو کبھی نو مہینے پورے ہی نہ ہوئے۔ ایک سانقی بی کہتی تھی: "ایک جان رہے گی' ماں یا بچہ۔ میم صاحب دونوں کو بچاؤ۔ بڑا انعام دیں گے' خوش کر دیں گے۔" مریضہ درد اور خوف سے سفید ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ سُن کر ممنونیت سے مریضہ کے آنسو نکل آئے اور ناک سے رطوبت بہہ آئی۔ رومال سے اس کے آنسو پونچھ چکنے کے بعد ناک پونچھنے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ ہیرے کی بڑی بڑی کیلوں سے دونوں نتھنے ڈھکے ہوئے تھے۔

میں نے ویسے تو تسلی دے دی مگر یہ قصہ سُن کر خود پریشان سی ہو گئی ——— پکی عمر کی اولاد ذرا مشکل سے ہوتی ہے۔ اور پھر زچہ کو درد بھی بڑے بے تکے تھے ——— اور بچے کے قلب کی حرکت سست۔ میں نے اللہ میاں سے دعا کی کہ عزت رکھ لینا ——— ورنہ واپسی کے لئے

کیڈی لک تو کیا خاک نہ ملے گی۔

رات آ گئی اور عورتیں بدستور آپس میں بولتی رہیں ـــ اور باری باری مریضہ کا جسم دباتی رہیں۔ مائی نے ایک دفعہ چپکے سے کہا کہ میں بھی مریضہ کا پیٹ پکڑ لوں کیونکہ عورتیں کہتی ہیں، "یہ ڈاکٹرنی مفت خوری ہے، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہے"ـــ میں نے مائی کے حکم کی تعمیل کی۔

جب مریضہ زور سے کراہنے اور ہونٹ کاٹنے لگی تو میں نے سب عورتوں سے باہر نکل جانے کو کہا۔ لیکن کئی عورتیں لپکیں اور پلنگ کے پاس دو اینٹیں رکھ دیں اور سب مل کر زچہ کو اٹھانے لگیں تاکہ وہ اینٹوں پر اکڑوں بیٹھ جائے۔

"بسم اللہ، خیر اللہ" مریضہ ان کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور میں یہ صورتِ حال دیکھ کر خوف سے چیخ پڑی۔

"سب چھوڑ دو، بھاگ جاؤ یہاں سے، تم لوگ اسے مار ڈالو گی!" عورتیں اس مداخلت پر پھر بلبلا کر چلانے لگیں۔ مائی نے مریضہ کو بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا ـــ اور مجبوراً بغیر کسی اوٹ کے بچہ سب کے سامنے ایک کمزور سی آواز میں رونے لگا۔

مبارک سلامت کا شور اٹھا اور باہر سے جتنی عورتیں اندر آ سکتی تھیں آ گئیں باقی دروازے میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس وقت زچہ کی حالت نازک ہے۔ میں نے بلیڈنگ کم کرنے کے لئے اسے انجکشن کہنیوں کے ٹھوکوں کے درمیان دیا۔ سوئی دیکھ کر کئی عورتیں درد سے کراہ اٹھیں، زچہ کو غش آ گیا تھا۔

اچانک باہر بندوقوں کے فائر ہونے لگے اور پھر ڈھول نفیریاں بجنے لگیں ـــ اس کے بعد رسموں اور شگونوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی بار میری توجہ زچہ و بچہ کی طرف سے ہٹ ہٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ ساری چیزیں دلچسپ تھیں، مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس گھر کے تمام حاضرین کا رویہ ابھی تک میرے لئے دوستانہ نہیں تھا، حالانکہ میں نے کئی رسموں میں دوسری عورتوں کی دیکھا دیکھی روپے بھی دئے۔ لیکن چونکہ مجھے قدم قدم پر زچہ و بچہ کی زندگی کی خاطر ان سے جھگڑنا بھی پڑتا تھا اس لئے میری دلجوئی بھی اوپری اوپری گئی۔

رات بھر ڈھول بجا، زچہ کو پوری نیند لینا چاہئے تھی کیونکہ اسے بخار تھا۔ مگر وہ خود اس ہنگامے میں اتنی دلچسپی محسوس کر رہی تھی کہ میں بے بس ہو کر سونے کی کوشش کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

صبح جب میں ناشتے کے لئے، ملک صاحب کے بلاوے پر بیٹھک میں گئی تو میرے بھائی نے بتایا کہ باہر بھی رات آتش بازی چھوٹی، اور ملک کے سینکڑوں مزارعوں نے ناچ گا کر صبح کی، اور ملک صاحب کو بچے کی پیدائش کے سلسلے میں بڑی نذریں ملیں ـــ میں اس نذروں والی رسم پر کافی حیران ہوئی۔

لیکن دوسرے دن میری حیرانی شدید خوف میں تبدیل ہو گئی جب کہ وہ واقعہ ہوا۔

ایک تو سردی کا زمانہ اس پر سے سویرے ہی سے بادل آنا شروع ہو گئے ـــ میں نہانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے اپنے جسم پر منوں غلاظت لپٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ـــ یہ تو میں نے بالکل طے کر لیا تھا کہ اس گھر میں میری سب سے تناتنی ہے اس لئے میں نے نہانے کے لئے گرم پانی کسی سے طلب نہ کیا ـــ رات بھر کی بیگانگی کے بعد۔ بخار کی شدت میں تھوڑی سی نیند لینے کے بعد جب زچہ نے میری طرف کروٹ لی اور اس کی آنکھیں بیرونی کی کیلوں کے ساتھ چمکیں تو میں نے اس سے کہا کہ کیا نہانے کے لئے گرم پانی مل جائے گا ـــ

"بسم اللہ ضرور نہاؤ جی" اور پھر اس نے مسکرا کر بچے کو گھیرے بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک سے کہا کہ بھاگ بھری سے کہو میم صاحب کے لئے پانی گرم کر دے۔

زچہ کو انجکشن دینے کے بعد میں نے مائی سے کہا کہ سوٹ کیس سے میرے کپڑے نکالے۔

"کپڑے تو جی نہیں میم صاحب ہم انعام میں دیں گے" زچہ نے میٹھی ادا سے مسکرا کر کہا۔

اور مجھے بہت بُرا لگا، خدا جانے یہ گنوار ملکنی مجھے کوئی مائی خدمتگار سمجھتی ہے جو بیٹا جننے کی خوشی میں جوڑا دے گی۔

"ہم ڈاکٹر ہیں ملکنی' اپنی مقررہ فیس لیتے ہیں جوڑے نہیں۔" میں نے غرور سے منہ بنا کر جواب دیا اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"میم صاحب تم نے ہماری خدمت کی ہے' پھر ہم تو سبھی کو کچھ نہ کچھ دیں گے —— اللہ نے یہ دن دکھایا ہے۔"

"اچھا اچھا میری مائی کو دے دینا ہیں تو ——"

اتنے میں ایک دس بارہ سال کی لڑکی بھد ربھد ربھاگتی اندر آگئی —— خوب تندرست' چمپئی سا رنگ' ماتھے پر مہین گندھی ہوئی میڈھیوں کی محراب' کانوں میں چاندی کے بندے —— یہ بھاگ بھری تھی۔

"ہم اسے بھی جوڑا دیں گے' بیٹا جو ہوا ہے۔" زچہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اور بھاگ بھری مجھے دیکھ کر ایک دم شرمانے لگی۔

"پانی رکھ دیا بھاگ بھری' میم صاحب کو غسلخانے لے جاؤ۔" زچہ نے اس سے کہا —— اور میں نہانے چلی گئی۔

نہاتے ہوئے میں جھلا جھلا کر سوچتی رہی کہ کیسے لوگ ہیں' کسی کی پوزیشن تک کو نہیں جانتے —— جوڑا دے گی مجھے' ہنہ!

جب میں نہا کر سر پر تولیہ لپیٹے نکلی تو گیلے بال سکھانے کے لئے صحن میں بیٹھ کر آتی جاتی دھوپ میں سسیانے لگی۔ بھاگ بھری نے گھر کے کسی کونے سے مجھے دیکھا اور وہ ٹرکرسٹی کے کنگوروں والی انگیٹھی لا کر میرے پاس رکھ گئی۔ اس وقت بھاگ بھری میرے دل کو بھا گئی۔

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ عورتوں پر عورتیں اُمڈی چلی آرہی تھیں' اس وقت پھر گانے بجانے کا پروگرام تھا۔

اچانک ملک صاحب کھانستے کھنکارتے زنان خانے کی طرف آئے —— مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھا' زچہ و بچہ کے بارے میں دو ایک باتیں دریافت کیں اور پھر بڑی ملکنی کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ باہر چلے گئے۔

"بھاگ بھریئے! بھاگ بھریئے ملک جی نہائیں گے' تولیہ باہر غسلخانے میں رکھ آ ——" بڑی ملکنی نے حکم دیا۔

اور بھاگ بھری اسی طرارے سے بھد ربھد ربھاگتی مردانے غسلخانے کی طرف چل دی۔

گانے بجانے کی تیاریوں کو دیکھ کر میں بور ہونے لگی —— میں اطمینان سے سو جانا چاہتی تھی —— میرے خیال میں زچہ کو بھی سکون سے سونا چاہئے تھا' لیکن کوئی بس نہ چلا —— میں نے اس وقت سوچا کہ کسی مغربی مصنف کا قول ہے کہ دیہات صحت بخش قبریں ہیں' مگر میرے اللہ یہ قبریں کتنی پُرشور ہیں' کتنی ضدی ہٹیلی لاشیں ہیں —— کتنی یکسانیت ہے —— میں تو ہوں ہی شہر کا کیڑا' مگر شرط بد کر کہہ دوں کہ شہر کے مرغی باکتے تک کو یہاں لے آؤ تو' مراقبے ہی جا کر جان دے دیں —— میں نہایت تلخی سے سوچتی رہی' سوچتی رہی' مجھے اپنے روز کے دو سو روپلوں کا خیال تک نہ آیا —— اور پھر جیسے موت کے مراقبے میں جھونک کھا گئی۔ درحقیقت مجھے سخت نیند آرہی تھی۔

اچانک بھاگ بھری روتی' گھسٹتی میرے پاس سے گزری' اس کا منہ سُرخ ہو رہا تھا۔ دفعتاً وہ ڈگمگائی اور زمین پر گر گئی۔ اس کا نیلا تہمد خون کے دھبوں سے لال ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر اسے اٹھانے لگی —— کائیں کائیں شروع ہو گئی اور پھر ایک دم باورچی خانے سے ایک عورت دوڑتی ہوئی آ کر مہین سریلی آواز میں رونے بین کرنے لگی —— یہ بھاگ بھری کی ماں تھی۔

بھاگ بھری نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

"مائے! ملک جی! ملک جی ملسٹے!!" بھاگ بھری نے ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں پھر زور زور سے بین کرنے لگی۔

ظاہر ہے کیا ہو چکا تھا —— میں ایک کنواری لڑکی بن کر دہشت سے کانپ رہی تھی۔ تمام عورتیں اکٹھی ہو گئیں —— مائی مجھے کھپایا

دیکھ کر سہارے سے زچہ والے کمرے میں لے آئی۔ اچانک صحن سے بڑی ملکنی کی دبنگ آواز شور کرنے لگی۔

مائی دوبارہ ٹوہ لینے باہر چلی گئی ——— میں سن سی بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ذرا سی خاموشی طاری ہوگئی۔ زچہ اب تک آنکھیں پھاڑے باہر کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے تھی۔

جب مائی باہر سے آئی تو اس نے چپکے چپکے مجھے قصہ مختصر کر کے سنایا کہ بڑی ملکنی بھاگ بھری کی ماں کو روک رہی تھی کہ بچے والے گھر میں رونا مت ڈالو ——— لیکن جب وہ اپنی بچی کی حالت دیکھ کے بین ہی کرتی گئی تو بڑی ملکنی آپے سے باہر ہوگئیں کہ تیری لڑکی خود مستانی ہوتی ہے، تو لیہ رکھ کر وہاں رکی کیوں؟ مرد ہے کیا کرے ——— اور یہ بھی کہا کہ بڑی بیٹی کی عزت کی دہائی دینے والی آئی وہ دن بھول گئی جب تیرا خاوند کھیتوں پر ہوتا اور تو ملک جی کی بیٹھک میں ——— اس پر بھاگ بھری نے رو رو کر اپنی ہم چشموں سے فریاد کی تو بڑی ملکنی اور بھی جل گئیں کہ دیکھیں کون ہیں مریم بیبیاں، جنہیں تو پکار رہی ہے ——— اس پر شور دھیرے دھیرے خاموش ہوگئی ——— بھاگ بھری کی ماں جب رونے سے باز نہ آئی تو بڑی ملکنی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا، جاتے ہوئے وہ بھاگ بھری کو لے جانا چاہتی تھی، مگر جواب ملا "نہیں جائے گی، آج کام بہت ہے حویلی میں ——— سب رشتے ناطے والے جمع ہیں ——— ایسی کون سی موت آرہی ہے بھاگ بھری کو ———"

"اے بی، لونڈیا خون میں تر بتر ہے، تو یہ میری کیسے بے وقوف لوگ ہیں، خواہ مخواہ بھاگ بھری کی ماں کو اور غصہ دلایا، وہ ایسے غصے میں گئی ہے کہ پولیس لائے گی، دیکھ لینا۔" مائی نے "ختم شد" کے طور پر ایک زوردار آہ کھینچی اور سوچ میں غرق ہوگئی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے زچہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش اور سنجیدہ بنی پڑی تھی۔ اس کے پہلے ہی اس کا منتوں مرادوں کا پہلا بچہ گنڈوں تعویذوں سے گندھا پڑا تھا ———

میں نے سوچا اف انسان کے ساتھ یہ شیطان کیوں لگا ہوا ہے، اب یہ پہلا بچہ دیکھو اور باپ کے لئے جیل کا دروازہ کھلا ہوا ہے ——— خیر چاہے مجھے زچہ پر کتنا ہی رحم کیوں نہ آئے، میں تو سچی گواہی دوں گی ——— بھلے ہی مجھے دو سو روپے روز کے نہ وصول ہوں ———

اس کے بعد باہر صحن میں زور زور سے ڈھول ڈھمکنے لگا اور کسی گیت کے بول گونجنے لگے۔

میں اس موقع پر ڈھول کی آواز سے ہول گئی ——— گیت کے بول سن کر اداس لیٹی ہوئی زچہ کو جیسے ہوش آنے لگا اور اس نے میٹھے بول سے گنگناتا ہوا سر آہستہ سے بچے پر جھکا دیا اور اسے ہولے سے چوم کر موہوم طریقے پر مسکرائی ——— ایسی محتاط مسکراہٹ جیسے وہ مکڑی کے جالوں جیسی ہو، اور وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں کوئی تار ٹوٹ نہ جائے۔

میں نے ایک آہ بھر کر کہا "بچے کی قسمت بھی کیسی ہے۔"

"نصیبوں والا ہے، جیوے میرا لال۔" زچہ نے چونک کر جواب دیا ———

میں نے سوچا مجھے بچے کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنا چاہئے تھی، ماں کا دل بڑی سے بڑی مصیبت اور تباہی کی ذمہ داری بھی اپنے بچے پر نہیں ڈالے گا ——— مگر پھر بھی میں نے اپنی قانون دانی سب کی سب اس کے سامنے اگل دی۔

وہ تعجب اور خوف سے آنکھیں پھاڑے میری باتیں سنتی رہی اور پھر ایک لمبی سانس لے کر مسکرانے اور بچے کو چومنے لگی ——— بخار سے یا نہ جانے کیا کچھ سوچ کر زچہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ——— میں خاموش ہوگئی۔

حویلی کی انگنائی میں ڈھول کے ساتھ گیتوں کے بول لہراتے رہے ———

ایک عورت اندر آئی اور اس نے زچہ پر جھک کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکی ——— وہ چلی گئی۔

میں نے زچہ کا ٹمپریچر لیا بخار اور بھی تیز ہو گیا تھا ——— بچے کو بھی بخار تھا ——— میں اب یہاں سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ میں دوائیں دے کر رخصت ہو جاتی، مگر مجھے اپنے پاؤں میں ایک زنجیر سی بندھی معلوم ہو رہی تھی ——— ظاہر ہے یہ زنجیر کون سی تھی۔

ذرا دیر بعد وہی عورت آئی جو ذرا دیر قبل زچہ سے کھسر پھسر کر گئی تھی ——— اب کی اس کے ساتھ بھاگ بھری تھی ——— بھاگ بھری کی آنکھوں میں وہ شرم نہیں تھی جو میں نے پہلی بار اس کمرے میں آتے دیکھی تھی ——— وہ کواڑ کا سہارا لئے چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میم صاحب اس کا بھی علاج کر دو۔" زچہ نے میری طرف لجاجت سے دیکھ کر کہا ——— اور میں اس دیہاتی جاگیرداری کی عظمت کے سامنے سناٹے میں آ گئی۔

بھاگ بھری کی تکلیف کا جو بھی مداوا ممکن تھا وہ میں نے کیا۔ بھاگ بھری اس وقت کتنی بے حس ہو رہی تھی۔

ایک دن اور گذر گیا ——— دودھ اترنے کی وجہ سے زچہ کا بخار بہت زیادہ تیز ہو گیا، وہ بار بار غافل سی ہو جاتی ——— لیکن اسی دن میں واپس چل دی ——— شاید میں زچہ کی حالت دیکھ کر ایک دن اور رک جاتی، لیکن اسی دن بھاگ لینے میں میری مائی کا شدید اصرار شامل تھا ———

قصہ یوں ہوا کہ میں صبح صبح اپنے بھائی کے ساتھ قیمتی صوفوں سے سجے ہوئے دیوان خانے میں مرغ اور پراٹھوں کا ناشتہ کر رہی تھی، اور ملک صاحب مجھ سے زچہ بچہ کی خیریت پوچھ چکنے کے بعد باہر دھوپ میں اپنے مرغوب پوز میں دھوپ لے رہے تھے، اور ان کے شکاری کتوں کو صبح کا راتب تقسیم ہو رہا تھا ——— قریب ہی کہیں ڈھول نفیری بج رہی تھیں، اور اس لمحے میں نے طے کیا کہ دو ایک دن اور رہنا چاہئے، پیسے بن رہے ہیں۔

اس لمحے کے بعد قریب کے ایک مکان کی اوٹ سے نکل کر بھاگ بھری کی ماں آتی نظر پڑی۔ جاڑے کی دھوپ میں اس کا سیاہ تہمد شرخ لمبا کرتہ اور گہری زرد چادر چمک رہی تھی۔ وہ دھیمی چال سے چل رہی تھی۔ اس کے سر پر ایک بڑا تھال تھا جو گوٹا لگے شرخ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا ——— اس کے پیچھے اور بھی کئی عورتیں تھیں، وہ بھی کچھ نہ کچھ سر پر اٹھائے ہوئے تھیں اور مرد بھی تھے، بعض ناچ رہے تھے اور بعض ڈھول نفیریاں بجا رہے تھے ——— بھاگ بھری کی ماں کی قیادت میں یہ جلوس بالکل قریب آ گیا۔ راتب پر جھگڑتے ہوئے کتے بھونکنے لگے۔ ڈھول کی دھم دھم اور اُچکتے پھاندتے مردوں کی ہا و ہو سے ملک صاحب کے ہاتھ پر بیٹھا ہوا باز ایک دم اڑا اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا ——— اور سب کے بعد اکڑتے برتے گھوڑے کی لگام ایک شخص کی طرف اُچھال کر تعلقے دار ملک صاحب کی طرف بڑھا ———

حویلی کی ڈیوڑھی سے عورتیں سیلاب کی طرح باہر آ گئیں۔ بہت سی ریشمی کپڑوں والیاں دیوان خانے میں بھی گھس پڑیں ——— میرا بھائی گھبرا کر باہر نکل گیا اور میں نے عورتوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے دیکھا کہ بھاگ بھری کی ماں نے تھال اتار کر ملک صاحب کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

"بچے کے کپڑے آئے ہیں" کا شور اندر سے باہر تک برپا تھا ——— میں ایک دم اندر مائی کو ڈھونڈنے بھاگی۔ آنگن خالی تھا ——— زچہ خانے میں زچہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور بھاگ بھری کی مینڈھیاں اس کے ہاتھ میں تھیں ——— اور اس کا چہرہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ دردِ زہ میں مبتلا ہو ——— مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

"بدتمیز نے پانی بستر پر گرا دیا۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور اس کا چہرہ ایک دم یوں پرسکون اور آسودہ ہو گیا جیسے وہ ابھی ابھی پچھ جن کر فارغ ہوئی ہو ——— بھاگ بھری کے دونوں گالوں پر انگلیوں کے سفید نشان اُبھرے ہوئے تھے اور بستر یا کمرے میں پانی کا نام تک نہ تھا۔ میں نے جلدی سے مائی کو ڈھونڈھ کر اس سے کمر پٹسر کی، وہ شدت سے میری ہم نوا ہوئی اور ہم فوراً چلنے کو تیار ہو گئے ——— مجھے ان لمحات میں یوں لگ رہا تھا جیسے میں اکیلے گھر میں ہوں، ایسے گھر میں جس کی دیواریں گر چکی ہوں۔

گھر پہنچ کر تین دن کے چھ سو روپے والدہ کے ہاتھ پر رکھتے ہی بڑے زور کی بحث شروع ہو گئی، صحیح یا غلط؟ مطلب یہ کہ میں نے فوراً چلے آنے میں حماقت کی یا نہیں۔ والدہ کہتیں بالکل ٹھیک کیا۔ بھائی کہتا خواہ مخواہ گھبرا کر بھاگیں۔
اس سے پہلے کہ اس کا کوئی فیصلہ ہو، میں یہ بات بتا دوں کہ کرترپی کے جس جلوس کی قیادت بھاگ بھری کی ماں کر رہی تھی، وہ تھانیدار صاحب کے گھر سے آیا تھا۔

منٹو میرا دشمن

(۲)

اوپندر ناتھ اشک

ہمارے کردار پہلے سے ڈھلے ڈھلائے تھے اور ہم توانہیں صرف کھیلنے کے لئے مجبور تھے۔

اس میں ہمارے لکھکڑپنے، انانیت اور ضد ہی کا قصور نہ تھا۔ خارجی حالات بھی ایسے تھے۔ دوستوں نے ہمیں جب ایک دوسرے کا حریف مان لیا تو ہماری ہر بات کو وہ اسی روشنی میں دیکھنے لگے۔ ہمارا مطلب ایک دوسرے کو چڑانا ہو یا نہ ہو، لیکن دوست ضرور ہماری باتوں کا یہ مطلب نکال لیتے۔ مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آتا ہے۔ منٹو یوں کھادی کا کرتا پاجامہ پہننے کا عادی تھا لیکن ریڈیو کی زندگی میں سوٹ بھی پہنتا تھا۔ اس نے کوئی فلمی کہانی بیچی تھی، اس کے روپے آئے تھے یا یوں ہی اس نے ایک بڑھیا سوٹ سلوایا تھا۔ دس یا گیارہ روپے گز کا کپڑا تھا (جو اس زمانے میں کافی مہنگا سمجھا جاتا تھا) انہیں دنوں کرشن چندر نے نوکری چھوڑ دی۔ تنخواہ اور سال بھر کے پراویڈنٹ فنڈ کے اسے تین سو روپے ملے، جن سے اس نے میرے لئے ایک عمدہ سوٹ اور شیروانی بنوا دی۔ میں سوٹ پہن کر دفتر میں آیا۔ اتفاق سے میٹنگ کے وقت میں اور منٹو کرشن کے دائیں بائیں بیٹھے کرشن نے پوچھا ”یہ کھیس کتنے گز آیا ہے؟“ میں نے کہا ”بارہ روپے!“ کرشن منٹو کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا ”یہ تمہیں کسی میدان میں جینے نہیں دے گا۔“ اس سے پہلے کہ منٹو کوئی جلی کٹی بات کہتا، میٹنگ شروع ہو گئی۔

کرشن چندر نے ’نئے معیار‘ کے سلسلے میں منٹو پر لکھتے ہوئے ٹائپ رائٹروں کا ذکر کیا ہے اور اس واقعہ کو اچھا خاصا افسانوی رنگ دے دیا ہے حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ منٹو کے پاس دو ٹائپ رائٹر تھے اور میں نے تین لئے تھے۔ بلکہ منٹو کے پاس اُردو کا ٹائپ رائٹر تھا اور میں نے اُردو ہندی دونوں کے ٹائپ رائٹر خریدے تھے۔ میرا یہ اقدام کسی طرح منٹو کے مقابلے کے لئے نہیں تھا۔ ہاں دوستوں نے اسے وہ رنگ ضرور دیا اور میرے دو ٹائپ رائٹروں کو لے کر منٹو کو چڑایا۔

بات یہ ہے کہ میں کسی زمانے میں ہولڈر دوات سے فل سکیپ کاغذ پر افسانے لکھتا تھا۔ چونکہ مجھے قطع و برید کا مرض تھا اس لئے کئی بار نصف صفحہ لکھ چکا ہوتا اور چند فقرے کٹ جاتے اور سارے صفحے کو پھر سے لکھنا پڑتا۔ اس تکلیف سے بچنے کے لئے میں نے فل سکیپ کی آدھی سلپوں پر لکھنا شروع کیا کہ اگر کوئی سلپ خراب ہو جائے تو پورا فل سکیپ کاغذ دوبارہ لکھنے کے بجائے نصف لکھنا پڑے۔ اس طرح کہانی لکھ کر میں اخبار

کے دفتر میں دے دیا اور جیسا کہ میں نے سندرشن جی کو دیکھا تھا، اخبار یا رسالہ میں چھپتے ہی اس کی کٹنگ کاٹ کر فائل میں رکھ لیتا۔ اس سے رسالہ خراب ہو جاتا لیکن اپنے پاس افسانہ کی کاپی رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہوتا۔ ۱۹۳۵ء میں میں ہندی میں لکھنے لگا۔ انہیں دنوں میں نے ایک غیر معروف جرنلسٹ کو دیکھا کہ وہ پنسل ربڑ لے کر بیٹھتے۔ جو لفظ، فقرہ یا تشبیہ اچھی نہ لگتی اسے ربڑ سے مٹا کر دوبارہ لکھتے۔ میں RECEPTIVE آدمی ہوں جو چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے اسے اپنا لیتا ہوں۔ میں نے سلپوں کا طریقہ ہٹا کر یہ ربڑ اور پنسل والا طریقہ اپنا لیا۔ پہلا مسوّدہ میں اس طرح اردو میں تیار کرتا۔ دوسرا ہندی میں لکھ کر کسی پرچے کو بھیج دیتا۔ لیکن ہندی میں ترجمہ کرتے وقت میں کئی بار بڑی خوبصورت ترمیمیں کر دیتا۔ اور جب افسانہ ہندی میں چھپ کر آجاتا تو ان ترمیموں کو اُردو مسودے میں بھی شامل کر لیتا۔ انہی دنوں دوبارہ ایسا ہوا کہ میرے ہندی افسانے رسالے کے دفتر نہیں پہنچے میں ان دنوں دشومتر، کلکتہ میں لکھا کرتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسالے والوں نے افسانے گم کر دیئے ہوں اور اپنی نااہلی کا الزام ڈاک کے سر تھوپ دیا ہو۔ اُردو کاپی میرے پاس تھی، لیکن اسے پھر ہندی کرنے میں مجھے بڑی قباحت ہوئی۔ اس کے علاوہ ہندی مسودہ تیار کرتے وقت جو ترمیمیں میں نے کی تھیں وہ میں یکسر بھول گیا اور مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں پنسل اور کاربن سے تین کاپیاں کیا کروں گا۔ ایک رسالہ کو بھیجا کروں گا، ایک اپنی فائل میں رکھا کروں گا اور ایک فالتو اس غرض سے رکھوں گا کہ اگر کبھی کوئی افسانہ گم ہو جائے یا رسالہ کا ایڈیٹر واپس نہ بھیجے تو میں اسے کسی دوسرے پرچے کو بھیج سکوں۔ سن ۱۹۳۷ء سے دہلی آنے تک میں برابر افسانوں اور ڈراموں کی تین تین کاپیاں کرتا رہا۔ کام میں ہمیشہ باقاعدگی سے کرتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا ہوں اس لئے لگاتار تین تین کاپیاں کرنے سے میرے انگوٹھے پر گٹا پڑ گیا اور اگرچہ اِدھر برسوں سے میں نے پنسل سے کام نہیں کیا تو بھی وہ گٹا ابھی تک موجود ہے۔ منٹو کو اُردو میں ٹائپ کرتے دیکھ کر مجھے وہ طریقہ بہت پسند آیا اور مجھے خواہش ہوئی کہ ایک ٹائپ رائٹر میں بھی خرید لوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کرشن اور دوسرے دوست ٹائپ رائٹر پر ڈرامہ لکھا جانا دیکھ کر بڑے متاثر اور مرعوب ہوتے تھے۔ بارہا اس کی تعریف کرتے تھے۔ منٹو کو خود بھی اس بات کا زعم تھا کہ وہ جب چاہے، جس موضوع پر چاہے براہِ راست ٹائپ رائٹر پر کھٹا کھٹ ٹائپ کر سکتا ہے۔ عام طور پر وہ کرشن سے پوچھتا۔ "بولو بھئی کرشن! کس موضوع پہ ڈرامہ لکھا جائے؟" لیکن کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ کوئی ریڈیو آرٹسٹ ہی موضوع تجویز کر دیتا۔ ایک بار غلام محمد نے کہا۔ "منٹو صاحب! آپ رندھیر پر ڈرامہ لکھئے۔" اور منٹو نے فوراً ٹائپ رائٹر پر انگلیاں رکھیں اور کاغذ پر الفاظ بننے لگے۔ ۷۸۶، پھر عنوان — "رندھیر پہلوان" پھر:

[ڈھور ڈنگروں کے ہانکنے کی آواز —— گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ وغیرہ ——
ہانکنے کے ساتھ یہ آواز بھی آتی ہے، اے تجھے سانپ کاٹے —— تیری ٹانگ
ٹوٹ جائے .... ذیل کا گیت شروع ہو جس کے عقب میں گائے بیلوں کے
ڈکارنے اور ان کی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے]

پھر کسی نے ایک دن کہا۔ "منٹو صاحب! 'کبوتری' پر ڈرامہ لکھئے" اور منٹو نے فوراً ٹائپ رائٹر کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

[مرغ کی اذان —— پتھریلے زینے پر قدموں کی آواز —— پھر مرغ کی آواز
—— قدموں کی آواز —— دو لڑکیوں کے گنگنانے کی آوازیں، جیسے وہ
زیرِ لب پوجن کر رہی ہیں —— یہ گنگناہٹ چند لمحوں تک جاری رہے ——
اس کے بعد آرتی شروع —— آرتی ختم ہو جاتی ہے —— وقفہ —— گھنٹہ
ایک بار بجتا ہے —— وقفہ —— دوسری بار بجتا ہے —— پتھریلے زینے پر

قدموں کی آواز ـــــ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دونوں لڑکیاں مندر سے باہر نکل رہی ہیں]

یہ لمبے ڈیش اور وقفے ہومنٹو کے تمام ریڈیائی ڈراموں میں بکثرت موجود ہیں، اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ساتھ ساتھ سوچتا رہتا تھا۔ بہرحال ایک بار شروع کرکے ایک آدھ پیرا ٹائپ کرنے کے بعد وہ سگریٹ سلگا لیتا۔ کچھ لمحوں کے لئے پاؤں اوپر کرکے کرسی پر بیٹھ جاتا اور پھر لکھنا شروع کر دیتا۔ ایک بار منٹو نے مجھے بھی یہ گُر بتایا تھا کہ کچھ نہ سوجھے تو کوئی شعر یا گیت لکھ دو۔ اتنے میں اگلے ڈائیلاگ سوچ لو۔ اور کچھ نہ ہو تو نثر میں شاعری شروع کر دو۔

لیکن آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہونے سے پیشتر میں اپنے چند کامیاب ڈرامے جیسے ـــ لکشمی کا سواگت، حقوق کا محافظ، پاپی، سمجھوتہ، چھٹا بیٹا، وغیرہ لکھ چکا تھا اور ڈرامے کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ ڈرامہ وہی اچھا ہے جو کھیلا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں، ریڈیائی ڈرامے کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور اس کے سننے والوں کی تعداد اس وقت بھی سٹیج کا ناٹک دیکھنے والوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ دس برس پہلے تو یہ بُعد اور بھی زیادہ تھا، کیونکہ اب تو آزادی کے بعد لوگ سٹیج کانشس (STAGE CONSCIUS) ہوتے جا رہے ہیں اور سکولوں، کالجوں اور ایمیچر سٹیج پر ناٹک دھڑا دھڑ کھیلے جا رہے ہیں۔ اُس وقت شاذ ہی کبھی ناٹک کھیلا جاتا تھا۔ کبھی ہوتا بھی تھا تو کسی انگریزی ناٹک کا ترجمہ! لیکن چونکہ مجھے لڑکپن ہی سے سٹیج کے ساتھ دلبستگی تھی اس لئے میں اس کے احیاء کے لئے شروع سے کوشاں تھا اور میری یہ کوشش تھی کہ میں ایسے ڈرامے لکھوں جو آسانی سے کم خرچ پر کھیلے جا سکیں اور جب کوئی ایمیچر کلب یا سکول ڈرامہ کھیلنا چاہے تو انگریزی سے ترجمہ کرنے کے بجائے اسے ہندوستانی ڈرامہ مل سکے۔ میرا یہ خیال کتنا صحیح تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج میرے ناٹک کشمیر سے ترویندرم اور پنجاب سے بنگال تک کھیلے جاتے ہیں، پڑھے جاتے ہیں، پڑھائے جاتے ہیں اور میرے ڈراموں کے مجموعے افسانوں اور ناولوں سے زیادہ بکتے ہیں۔

منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا مجھ پر کچھ بھی رعب نہیں پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک ریڈیائی ڈرامے کا تعلق ہے، منٹو نے تکنیک کے نئے اور کامیاب تجربے کئے اور ریڈیو تکنیک کے امکانات کا پورا پورا فائدہ اٹھایا، لیکن منٹو کے کچھ ڈرامے دیکھنے اور سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سٹیج ناٹک کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد ریڈیو ناٹک میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور وہ وقت، جگہ اور ایکشن کی وجہ سے ریڈیو کے سننے والوں کے لئے محض ریڈیائی ناٹکوں کے مقابلے میں اگر زیادہ نہیں تو کم دلچسپ بھی ثابت نہ ہوگا۔ اس طرح ہم دونوں کے ناٹکوں کی تکنیک مختلف تھی۔ کرشن منٹو کے ڈراموں کا قائل تھا۔ لیکن انصار ناصری کو میرے اور بیدی کے ناٹک پسند تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں منٹو نے اور میں نے چند بہت اچھے ناٹک لکھے ـــ 'پھوارے' اور 'ادھی راستے' کے بیشتر ڈرامے اسی دور میں لکھے گئے۔

منٹو کے ڈراموں سے میں مرعوب نہیں ہوا لیکن یہ خواہش ضرور ہوئی کہ ایک دو ناٹک براہِ راست ٹائپ رائٹر پر لکھوں اور کرشن کو دکھلا دوں کہ اس طرح کے ریڈیائی فیچر لکھنا مشکل ہیں نہ انہیں براہِ راست ٹائپ کرنا۔ اور میں نے ایک دن منٹو کے سامنے ٹائپ رائٹر خریدنے کا ذکر کیا۔ منٹو نے اپنا ٹائپ رائٹر قسطوں سے خریدا تھا۔ شاید ایجنٹ اس کا واقف تھا ـــ یوں بھی منٹو کا گھر ریڈنگٹن روڈ کمپنی کشمیری گیٹ کے نزدیک ہی تھا۔ ایک دن ایجنٹ دفتر میں آیا۔ میں نے کانٹریکٹ بھر دیا۔ وہ کانٹریکٹ اب بھی میرے پاس موجود ہے اور اس پر گواہ کے طور پر منٹو کے دستخط ہیں۔ منٹو یہ چاہتا تھا کہ میں بھی اسی کی طرح قسطوں پر ٹائپ رائٹر لوں میں نے کانٹریکٹ کیا بھی تھا لیکن قسطوں پر لینے میں ۲۲۳ روپے کے ٹائپ رائٹر کے تین سا نہیں سو روپے مجھے دینے پڑتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سال ڈیڑھ سال کا عرصہ اور چھوٹی قسط تھی لیکن مجھے اتنی تھوڑی رقم کا ۷۵ روپے سود بہت زیادہ معلوم ہوا۔ اس لئے جب ایجنٹ پہلی قسط لینے آیا تو میں نے اسے سارے کا سارا روپیہ دے دیا اور یوں دوستوں کے دل میں اپنے لئے نفرت کا ایک اور جواز پیدا کر لیا۔ منٹو ہو، کرشن ہو یا راشد ـــ تینوں پیسہ جوڑنے کے سخت خلاف تھے۔ جو آیا اُڑا دیا، بلکہ اگر قرض مل گیا

تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ میں ڈھائی سو روپیہ ٹائپ رائٹر کے لئے یک مشت دے سکتا ہوں، جبکہ وہ قسطوں پر مل جاتا ہے۔ یہ بات منٹو کو اچھی نہ لگی۔ پیسہ دراصل میں کبھی نہ جوڑتا تھا لیکن پہلی بیوی کی مرت کے بعد ساٹھ روپے کی حقیر رقم کے لئے (جو میں نے ایک عزیز سے اُدھار لی تھی) مجھے خاصا ذلیل ہونا پڑا تھا اور میں نے طے کیا تھا کہ میں کبھی کسی سے اُدھار نہ لوں گا اور جس طرح بھی ہو کچھ نہ کچھ پس انداز کروں گا۔ جب میں نے ریڈیو کی ملازمت کی تو میرے پاس ڈیڑھ ہزار روپے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس طرح ٹائپ رائٹر پر منٹو کے ڈرامہ لکھنے پر دوست مجھے چڑایا کرتے تھے اسی طرح میرے یکمشت روپیہ دے دینے پر انہوں نے منٹو کو چڑایا۔ اور جب ایک آدھ ماہ ٹائپ رائٹر پر پریکٹس کرنے کے بعد مجھے زیادہ وقت پیش نہیں آئی کیونکہ انگریزی ٹائپ کرنا مجھے آتا تھا) میں نے براہِ راست ٹائپ رائٹر پر ایک فیچر ٹائپ کر کے کرشن چندر کو دیا تو دوستوں نے منٹو سے کہا۔ "لو بھئی منٹو! تمہارا اجارہ ختم ہوا۔"

لیکن چونکہ اس وقت تک میں اُردو میں بھی برابر لکھتا تھا اور ڈرامے ہندی رسم الخط میں کم اور اُردو میں زیادہ لکھنا تھا اس لئے میں نے کئی دوستوں سے کہہ رکھا تھا کہ رمنگٹن کے پاس تو اس وقت اُردو کا ٹائپ رائٹر نہیں لیکن اگر کسی دوست کے پاس اُردو ٹائپ رائٹر برائے فروخت ہو تو مجھے پتہ دیں۔ ان دوستوں میں ایک جرنلسٹ دوست بھی تھے جو آج آل انڈیا ریڈیو کے بڑے عہدے پر فائز ہیں لیکن اس وقت ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے ہاں پبلسٹی افسر تھے۔ ان کے کسی دوست کے پاس ایک ٹائپ رائٹر تھا۔ انہوں نے منٹو سے کہا کہ بھئی اشک کو ضرورت ہے۔ ایک سو دس روپے میں وہ دینے کو تیار ہیں، تم اشک کو لے دو۔ ان صاحب نے شوق میں ٹائپ رائٹر لے لیا تھا لیکن اسے استعمال نہ کر سکے تھے اور اس میں زنگ لگ گیا تھا۔ منٹو ٹائپ رائٹر گھر لے گیا۔ وہ مشین کو کھولنا اور صاف کرنا جانتا تھا۔ اس نے اس مشین کو بھی اچھی طرح صاف کیا۔ پٹرول کی ایک پوری بوتل اس پر صرف کر دی اور دوسرے دن مجھے لا کر مشین دکھائی کہ اس کے ایک دوست کی ہے، بالکل چلی نہیں۔ تم چاہو تو خرید لو۔

میں نے مشین کو چلا کر دیکھا تو مجھے وہ بہت پسند آئی۔ میری ہندی والی مشین نئی ہونے کے باوجود بہت بھاری تھی اور یہ اُردو والی مشین پرانی تھی لیکن بڑی رواں تھی۔ میں نے منٹو سے دام پوچھے۔ اس نے کہا۔ "میرے دوست نے تو تین سو میں خریدی تھی لیکن وہ ڈیڑھ سو میں دے دے گا۔"

میں نے چپراسی کے ہاتھ چیک بک منگائی لیکن جب میں چیک کاٹنے لگا تو منٹو نے کہا۔ "تم ابھی ایک سو دس کا چیک کاٹ دو۔ چالیس روپے نقد اگلے ماہ دے دینا۔"

مجھے یہ بات عجیب تو معلوم ہوئی لیکن میں نے اس وقت ایک سو دس روپے کا ایک چیک کاٹ دیا اور دوسرے مہینے تنخواہ کے دن منٹو کو چالیس روپے نقد دے دیئے۔

کئی ماہ بعد اچانک وہ جرنلسٹ دوست مجھ سے دفتر میں ملنے آئے۔ میں نے اُردو مشین کا کوئی ذکر نہ کیا چنانچہ انہوں نے خود ہی کہا۔ "وہ مشین ایک سو دس روپے میں میں نے بھجوائی تھی۔"

"کون سی مشین؟"

"اُردو مشین جو تم نے مانگی تھی۔"

"لیکن وہ تو منٹو نے اپنے دوست سے خرید کر دی تھی۔"

"میرے دوست کے پاس تھی۔ وہ تو ڈیڑھ سو مانگ رہا تھا لیکن میں نے ایک سو دس میں فیصلہ کرا دیا تھا۔"

"مگر منٹو نے تو مجھ سے ڈیڑھ سو روپے لے لئے۔"

دوست کو بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا "میں باہر جا رہا تھا اور منٹو سے کہہ گیا تھا کہ اشک نے ایک بار مشین کا ذکر کیا تھا یہ اسے دلا دو۔ اور بات ایک سو دس کی ہوئی تھی۔"

ان کے جانے کے بعد میں نیچے گیا تو میں نے منٹو سے کہا "تم نے مجھ سے ٹھیک بات کیوں نہیں کہی؟ چالیس روپے کے لئے جھوٹ کیوں بولا؟"

"میں نے کہا یہ اشک سب سے سودا کرتا ہے، ہم بھی اس سے ایک سودا کر لیں" منٹو نے آنکھیں نکال کر کہا۔ لیکن اس کے چہرے پر اچانک آجانے والے کھسیانہ پن کو اس کی وہ آنکھیں نہ چھپا سکیں۔

"یہ تم نے اس وقت کیوں نہ کہا" میں بولا "اگر تم کہتے، دیکھو بھائی، یہ مشین خواہ میں نے مفت لی ہو لیکن تمہیں اس کے ڈیڑھ سو روپے دینے ہوں گے تو میں اس صورت میں بھی مشین لے لیتا۔ لیکن تم چالیس روپے کے لئے جھوٹ بولے اس کا مجھے رنج ہے۔"

چونکہ اس وقت منٹو کے میرے تعلقات کافی بگڑ گئے تھے۔ اس لئے اس سے زیادہ بات نہ ہوئی۔

بہر حال اُردو کا ٹائپ رائٹر آگیا تو میں دونوں ٹائپ رائٹر لے کر دفتر آنے لگا اور دوست منٹو کو چڑانے لگے۔ مجھے ایک شام یاد ہے جب ہم دونوں دفتر سے ایک ساتھ باہر نکلے۔ منٹو کے دائیں ہاتھ میں ٹائپ رائٹر اور بائیں ہاتھ میں نفیس چمڑے کا بیگ تھا میرے دونوں ہاتھوں میں ٹائپ رائٹر تھے (ہم لوگ ایکسچینج بلڈنگ تک پیدل آتے تھے اور وہاں سے تانگہ لیتے تھے) اس شام دوستوں نے منٹو کو اتنا چڑایا کہ وہ جھلا کر بولا۔ "میں یہ ٹائپ رائٹر سالا بیچ دوں گا اور پن سے لکھا کروں گا۔"

لیکن منٹو نے ڈرامہ کبھی پن سے نہیں لکھا اور نہ اپنا اُردو کا ٹائپ رائٹر فروخت کیا۔ حالانکہ 'نئے ادب کے معمار' کے سلسلے میں کرشن چندر نے ایسا لکھا ہے۔ منٹو جب تک دلی کے ریڈیو سٹیشن پر رہا ڈرامہ ہمیشہ ٹائپ کرتا رہا۔ جب میں اس کی دعوت پر بمبئی گیا اور اسی کے گھر ٹھہرا اس وقت ٹائپ رائٹر اس کے پاس تھا حالانکہ منٹو نے اسے ایک برس سے استعمال نہیں کیا تھا۔ فلمستان کے سٹوڈیو میں میں نے کبھی اسے ٹائپ رائٹر لاتے نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ریڈیو سٹیشن پر منٹو ہفتے میں ایک ڈرامہ دیتا تھا۔ خاصی جلدی میں اسے ڈرامے لکھنے پڑتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنی جلدی ڈرامہ لکھنا ہو۔ اس میں سٹیج کی ضروریات کو ملحوظ نہ رکھنا ہو تو ٹائپ رائٹر سے بہتر کوئی دوسری چیز نہیں۔ بمبئی میں ایسی کوئی جلدی نہ تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ سین ہوتا تھا اور اس کے لئے میلوں میل سے ٹائپ رائٹر اٹھا کے لانا بالکل بے معنی تھا۔

ٹائپ رائٹروں کی یاد آتے ہی کیمس لیدر کے بڑے سے سفید ٹکڑے اور برش کی یاد آتی ہے جو منٹو ہمیشہ اپنے ٹائپ رائٹر کے اندر رکھتا تھا۔ صبح آتے ہی میٹنگ کے بعد وہ جب اپنی میز پر کیس سے ٹائپ رائٹر نکال کر رکھتا تو پہلے برش سے ٹائپ کے حروف صاف کرتا، پھر لیدر کے اس ٹکڑے سے صاف کر کے اسے چمکا دیتا اور پھر اپنے چمڑے کے خوبصورت بیگ سے کاغذوں کی فائل نکالتا اور ڈرامہ ٹائپ کرنے بیٹھتا۔ منٹو میں سعادت تھی یا نہیں، یہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن نفاست ضرور تھی اور اس لحاظ سے ستیارتھی نے اپنی کہانی 'نئے دیوتا' میں اس کا نام نفاست حسن ٹھیک ہی رکھا تھا منٹو گندے غلیظ ہوٹلوں یا ریسٹورانوں میں شراب پی لیتا تھا، میں نے خود دو بار اسے خاصے گندے ہوٹلوں میں شراب پیتے دیکھا لیکن اس کے گھر کی ہر چیز میں اس کی نفاست پسندی عیاں تھی۔ اس کی بیوی باہر گئی ہو تو اسے خود گھر کی صفائی کرنے میں عار نہ ہوتا۔ جس صبر سے وہ اپنی مشین صاف کرتا تھا اسی طرح وقت پڑنے پر اپنا گھر بھی خود ہی صاف کر لیتا تھا۔ ایک بار دہلی کی ملازمت کے اوائل میں میں کرشن چندر کے ساتھ اس کے گھر نمبر ۹ حسن بلڈنگز نکلسن روڈ دہلی گیا تو اسے ہاتھ میں جھاڑو لئے ہوئے کمرے

صاف کرتے پایا ——— کھادی کا کرتا پاجامہ دھول سے قدرے میلا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کے چھوٹے کمرے کو صاف کر کے مٹی دہلیز سے باہر نکال رہا تھا۔ غالباً کچھ تھک بھی گیا تھا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گڑھوں سے ایک دم باہر نکالتے ہوئے اس نے ہماری طرف دیکھا اور اشارہ کیا کہ بیٹھک میں چلو۔ اس کی وہ باہر کو نکلی ہوئی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ میں آج تک اس کی یاد فراموش نہ کر سکا۔

حسن بلڈنگز میں دو منزلیں ہیں اور پندرہ بیس ایک سیسے فلیٹ ہیں۔ پہلی منزل میں آنگن آدھا چھپا اور کشادہ ہے۔ اوپر کی منزل میں آنگن اتنا ہی ہے جتنا کہ نیچے چھپا ہوا۔ منٹو پہلی منزل میں رہتا تھا۔ دو بڑے اور ایک چھوٹا کمرہ، کچن الگ، منٹو نے ایک ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ ایک سونے کا کمرہ، چھوٹا کمرہ غالباً سامان کا تھا۔ کھانے کی میز باہر چھت کے نیچے ایک طرف لگی رہتی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر منٹو آگیا۔ کرشن کو شاید نئے ڈرامے کا مسودہ درکار تھا۔ منٹو نے ایک دراز سے بڑی خوبصورت فائلیں نکالیں جن میں پیتل کے چمچماتے پیپر کلپ لگے تھے۔ دراصل ریڈیو سے جو فائلیں ملتی تھیں منٹو انہیں درمیان سے کاٹ کر ان کے دونوں صفحے الگ الگ کر لیتا تھا، پھر مسودہ دونوں صفحوں میں رکھ کر فائل کے دائیں طرف اوپر، درمیان میں اور نیچے پیتل کے تین پیپر کلپ لگا لیتا تھا۔ ہر ناٹک اس نے اسی طرح سنوار کر پیلی، نیلی یا گلابی فائل میں لگا رکھا تھا۔ میں منٹو کی کسی اور چیز سے مرعوب ہوا یا نہیں لیکن اس نفاست پسندی اور باقاعدگی سے ضرور مرعوب ہو گیا۔ اپنے مسودوں کو یوں سنبھال کر رکھنا مجھے بہت بھایا اور گھر آ کر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ بازار گیا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کہیں سے سو پیپر کلپ لایا اور دفتر کی فائلوں کو دو حصوں میں منقسم کر کے اوپر کے صفحے پہ ٹائپ رائٹر سے کہانی یا ناٹک کا نام لکھ کر منٹو ہی کی طرح میں نے اپنے مسودے پیتل کے چمکتے ہوئے پیپر کلپوں سے باندھ دیئے۔ اس طرح نہ صرف کاربن اور پنسل سے لکھ کر تین تین کاپیاں کرنے سے نجات ملی بلکہ رسالے کو پھاڑ کر افسانے کی کاپی رکھنے اور یوں کتاب مرتب کرنے کی کوفت سے چھٹکارا پایا۔

منٹو نے اپنی کہانی کا کیا معاوضہ لیا، اپنی کتابوں کی کیا رائلٹی لی، اس کا مجھے کچھ زیادہ علم نہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ جو بھی مل جائے، لے کر افسانہ، ڈرامہ یا ان کے مجموعے ناشر کو دے سکتا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس نے اپنے بیس اکیس افسانوں کے پہلے مجموعے کا دائمی حق اشاعت دو تین سو روپے میں ناشر کو دے دیا تھا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ بغیر کچھ معاوضہ لئے وہ افسانہ دینے کے خلاف تھا۔ اس کے برعکس کرشن نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی۔ اب کی بات میں نہیں جانتا، اس وقت وہ بغیر پہلے کچھ لئے افسانہ دے دیتا تھا۔ (ایک افسانے کی بات دُور رہی، اس نے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'طلسم خیال' بغیر کچھ لئے دے دیا تھا) اور چونکہ وہ اپنے افسانے کے لئے معاوضہ نہ لیتا تھا اس لئے رسالوں کے ایڈیٹر اس کی تعریف میں نوٹ چھاپتے تھے، اس کی تصویریں شائع کرتے تھے۔ کرشن کا معاوضہ لینے کا طریقہ مختلف تھا۔ وہ چیز دیتے وقت کچھ نہ طلب کرتا تھا بلکہ بعد میں کسی نہ کسی اشد ضرورت کے پیش نظر کچھ نہ کچھ لے لیتا تھا۔ اس طرح ایڈیٹر کو اپنے اوپر احسان کرنے کا موقع دے دیتا تھا۔ میرا طریقہ دونوں سے مختلف تھا۔ میں نے آج تک کبھی افسانہ مفت نہیں دیا۔ کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ افسانہ شروع میں چھپتا ہے یا آخر میں، حتی الامکان میں نے اس کی پوری قیمت وصول کی۔ بہرحال منٹو میں اور مجھ میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ بھی افسانہ دیتے وقت معاوضہ (کم یا زیادہ) چاہتا تھا اور میں بھی۔ اسی سلسلے میں دہلی کا ایک دلچسپ واقعہ مجھے یاد ہے۔ دہلی میں ایک صاحب تھے آغا سرخوش، اپنے مرحوم والد کی یاد میں جو مشہور شاعر تھے، ایک رسالہ نکالتے تھے۔ نام بھول رہا ہوں شاید 'چمنستان' تھا۔ ان کی چھوٹی بہن ریڈیو میں کبھی کبھی ڈراموں میں کام کیا کرتی تھیں اور بعد میں مستقل آرٹسٹ ہو گئی تھیں۔ نام بھلا سا تھا، حجاب یا سحاب قزلباش۔ سرخوش صاحب نے چمنستان میں کرشن کی افسانہ نگاری پر کوئی مضمون شائع کیا تھا۔ کرشن کے افسانے بھی شائع کئے تھے، ایک مجموعہ بھی شائع کیا اور جب کرشن دہلی سے چلا گیا تو کرشن کے خلاف (کرشن نے راشد کی 'ماورا' پر جو دیباچہ لکھا تھا اس میں کسی مغربی شاعر کے تنقیدی مضمون سے لفظ بہ لفظ پیرے چرا لئے تھے، اس سلسلے میں) ایک مضمون

بھی شائع کیا تھا۔ بہر حال آغا سرخوش صاحب ایک دن دفتر میں آئے۔ پست قد کے نوجوان تھے اور مغت خورے ایڈیٹروں کی بات چیت میں جو مسکینی اور جھجک ہوتی ہے، وہ ان کے ہاں بھی تھی۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ انگریزی پروگرام کے انچارج مسٹر نوبل کلارک حالانکہ پہلے درجہ کے پھکڑ آدمی تھے ، لیکن تھے تو انگریز اور ان دنوں انگریز کا دبدبہ تھا۔ سرخوش صاحب جھجکتے جھجکتے اجازت لے کر اندر آگئے اور انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ میں ان کو جانتا تھا۔ کرشن کے کمرے میں چوروں کی طرح آتے اور اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتے میں نے انہیں دیکھا تھا۔ بہر حال میں نے کرسی پیش کی۔ وہ بیٹھے نہیں، کھڑے کھڑے ہی انہوں نے کہا کہ دہلی کے مشہور شاعر اور اپنے والد بزرگوار کی یاد میں وہ 'چمنستان' کا آغا شاعر قزلباش نمبر نکالنا چاہ رہے ہیں۔ کرشن نے ایک افسانہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں بھی ایک افسانہ انہیں عنایت کروں۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو بغیر پیشگی معاوضہ لئے افسانہ دیتا نہیں، لیکن چونکہ آپ بڑے کارِ خیر کے سلسلے میں نمبر نکال رہے ہیں اس لئے اگر منٹو بھی اس میں افسانہ دینے کو تیار ہو تو میں بھی دے دوں گا۔ کرشن تو کبھی پیسے لیتا نہیں اس لئے اس کے افسانہ دینے کی سند نہیں۔

سرخوش صاحب نے کہا ——— "میں نے منٹو صاحب سے پوچھا نہیں، لیکن میں ان سے ضرور عرض کروں گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنا افسانہ مرحمت فرما دیں گے۔"

"ٹھیک!" میں نے کہا "وہ مرحمت فرمائیں گے تو میں بھی فرما دوں گا۔"

آغا سرخوش کیا کہتے۔ چپ چاپ آداب کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہ ایک طرف سے گئے، میں دوسری طرف سے نیچے پہنچا۔ میوزک روم میں اس سے اُس سے باتیں کرتا اس بات کی تاک میں رہا کہ کب وہ منٹو کے کمرے میں جاتے ہیں، لیکن وہ کرشن کے کمرے میں ایسے داخل ہوئے کہ نکلنے ہی میں نہ آئے۔ تب میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ کوئی ڈرامہ ٹائپ کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اس نے سر اٹھایا۔

"آغا سرخوش نہیں آئے؟"

"سرخوش؟"

"چمنستان کے ایڈیٹر، آغا شاعر قزلباش کے فرزندِ ارجمند! کرشن عموماً ان کے رسالے کے لئے کہانیاں لکھا کرتا ہے، لیکن اس بار وہ اپنے والدِ بزرگوار کی یاد میں رسالے کا خاص نمبر نکال رہے ہیں۔ میرے پاس افسانے کے لئے آئے تھے۔ میں تو بغیر معاوضہ لئے افسانہ دیتا نہیں، سو میں نے کہا کہ تم دو تو میں بھی دے دوں۔"

میں نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ آغا صاحب جھجکتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے اپنے آنے کی غرض وغایت بیان کی۔

"کتنے روپے دیں گے؟" منٹو نے کہا "افسانہ آج ہی لکھ دوں گا۔"

اس پر آغا صاحب نے کھیسیں نکال دیں "یہ نمبر تو منٹو صاحب میں نے اپنے مرحوم والد صاحب کی یاد میں نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ دہلی کے مشہور شاعر......"

لیکن منٹو نے انہیں بات ختم نہیں کرنے دی "صاحب! آپ اپنے والد کی یاد میں نمبر نکال رہے ہیں، مجھے بھی کچھ پیسے چاہئیں کہ میں اپنے والد کی قبر پر کچھ پھول چڑھاؤں، اور نمبر نہیں نکال سکتا تو ایک آدھ پھلدار درخت ہی لگاؤں۔" اور منٹو نے کچھ اس طرح آنکھیں نکال کر ان کی طرف دیکھا کہ وہ لحظہ بھر کو بھی وہاں نہیں رُکے۔

میں اگرچہ ان کے ساتھ ہی باہر آیا، لیکن پھر انہیں مجھ سے افسانہ لینے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

میں اور منٹو ہمیشہ لڑتے ہی نہیں رہے، ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا بھی موقع ملا۔ دہلی میں تو خیر پہلی ہی بات ٹھیک ہے لیکن بمبئی میں

جب منٹو نے مجھے فلمستان میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے بُلایا تو میں آٹھ دس دن اسی کے یہاں رہا اور بعد میں جب میں نے اس بات کا انتظام کر لیا کہ منٹو اور میں ایک یونٹ میں کام نہ کریں، ہم دونوں کئی بار اکٹھے بھی بیٹھے، اکٹھے ہم نے ککرجی کو شعر اور لطیفے سُنائے، راجہ مہدی علی خاں کی گپیں سُنیں اور اگرچہ میں نے تو منٹو کو کبھی اپنی کوئی چیز نہیں سُنائی لیکن میں نے اس کی دو تین کہانیاں اس کے منہ سے سُنیں اور "سوراج کے لئے" تو اس نے میرے سامنے ہی لکھی۔ نصف لکھ کر منٹو نے اسے چھوڑ دیا اور پھر جب دو تین ماہ بعد اسے ختم کیا تو اس نے ساری کہانی مجھے نئے سرے سے سنائی۔

منٹو کلیر روڈ پر رہتا تھا۔ دوسرے مالے پر اس کا فلیٹ تھا۔ مکان پُرانی طرز کا تھا اس لئے اس میں کیڈل روڈ یا چوپاٹی یا میرین ڈرائیو جیسے فلیٹ نہ تھے۔ ایک کافی بڑا کمرہ تھا جو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کا کام دیتا تھا۔ ایک دوسرا اندر چھوٹا کمرہ تھا جس میں ایک پارٹیشن تھی۔ اس کے ایک طرف پلنگ بچھا تھا اور دوسری طرف باورچی خانہ تھا۔ چولہے پر تو بمبئی میں بہت کم کھانا پکتا ہے۔ لکڑی کی انگیٹھی پر سب کام ہوتا ہے۔

سونے کے کمرے میں سجاوٹ کی اتنی گنجائش نہ تھی۔ حالانکہ پلنگ اور ڈریسنگ ٹیبل خوبصورت تھی لیکن باہر کا بڑا کمرہ، صوفہ سیٹ، میز اور کرسیوں سے خوب سجا تھا۔ اُدھر کونے میں چھوٹی سی کھانے کی میز تھی جس کے اردگرد چار یا چھ کرسیاں تھیں۔ اس کونے میں الماری تھی جس میں منٹو کے کپڑے اور جوتے رہتے۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر ہر چیز قرینے سے سجی تھی۔

منٹو مجھے سٹیشن پر لینے آیا تھا۔ بمبئی سنٹرل پہ فرنٹیئر میل رُکی۔ منٹو سیکنڈ کلاس کے آگے ہی کھڑا تھا۔ اُترتے ہی اس نے مجھے بغل میں لے لیا۔ کوشلیا کو چونکہ 'ایڈمرل ہاؤس' جانا تھا اس لئے اس نے وہاں فون کر کے ایک پک اپ منگانے کے لئے کہا۔ یہ جان کر منٹو کو کچھ جھلاہٹ ہوئی لیکن اس نے اس کا انتظام کر دیا۔ کوشلیا 'ایڈمرل ہاؤس' چلی گئی اور میں منٹو کے ساتھ کلیر روڈ پہنچا۔ میں اس کے بعد دہلی نہیں گیا۔ پہلے آٹھ دس دن منٹو کے ہاں رہا۔ پھر کیڈل کورٹ کیڈل روڈ پر ایک رشتہ دار کے ہاں اُٹھ گیا۔

ان آٹھ دس دنوں کی پہلی یاد بمبئی کے مچھر، منٹو کے فلیٹ کے باہر کا شور اور منٹو کا صبح چار بجے اُٹھ کر پانی بھرنا ہے۔

پہلی رات منٹو نے میرا بستر بڑے کمرے میں لگا دیا۔ چارپائیاں اور پلنگ بمبئی میں زیادہ نہیں ہوتے۔ لوگ زمین پر سوتے ہیں یا فولڈنگ چارپائی پر۔ ایک فولڈنگ بیڈ منٹو نے میرے لئے بچھا دیا تھا۔ حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا تو بھی اندر کمرے میں گرمی تھی۔ مجھے بمبئی کی آب و ہوا کا علم نہ تھا۔ دلی میں سخت سردی تھی، میں بھاری بستر ساتھ لے گیا تھا۔ نئی جگہ، گرم لحاف، فولڈنگ بیڈ اور پھر مچھر۔ بڑی رات تک مجھے نیند نہ آئی۔ اس وقت جب مجھے محسوس ہوا کہ ابھی آنکھ لگی ہے کہ اندر کمرے میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ میں جاگ گیا۔ سوچتا رہا کہ کیا بات ہے کہیں منٹو کو یا بھابی کو کوئی تکلیف تو نہیں؟ ایک بار اُٹھ کر اندر کے دروازے تک گیا۔ پھر واپس آ گیا۔ تقریباً آدھ ایک گھنٹے تک یہ آواز آتی رہی۔ میں اتنا پریشان ہوا کہ دوسرے دن جب منٹو نے فولڈنگ بیڈ بچھایا تو میں نے کہا "یار! مجھے نیند نہیں آتی، بیڈ بالکونی میں لگا دو"
اور منٹو نے بیڈ بالکونی میں لگا دیا۔

لیکن نیند مجھے تب بھی نہ آئی۔ اندر اگر گرمی کی وجہ سے بے چینی رہی تو بالکونی پر شور کی وجہ سے ——— منٹو کا مکان سڑک کے نزدیک تھا اور بمبئی میں اِدھر آدھی رات تک موٹریں، بسیں، ٹرامیں کھڑکھڑاتی رہتی ہیں اُدھر علی الصبح ان کا شور شروع ہو جاتا ہے۔ میری نیند خاصی کچی ہے۔ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ بھی اس میں خلل ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ میں رات کو کئی بار جاگا اور جب بھی میری آنکھ کھلی میں نے کسی نہ کسی بس، ٹرام یا موٹر کو رات کے سناٹے کو چیرتے پایا۔ پھر نہ جانے کس طرح آنکھ لگی۔ جب اُٹھا تو رات کا آخری پہر تھا، ہوا میں خنکی تھی۔ اندر کچن میں پھر پہلی رات کی طرح کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ سوچنے لگا کیا بات ہے، ضرور کسی کو کوئی تکلیف ہے لیکن تکلیف ہوتی تو اس کے آثار منٹو یا بھابی کے چہرے پر

دکھائی دیتے اس لئے اُٹھ کر استفسار کرنے کا ارادہ چھوڑ چپ چاپ لیٹا رہا۔ جب تک وہ آواز آتی رہی میں سو نہ سکا۔ پھر ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ شاید پہلی ٹرام کلیر روڈ کے باسیوں کو صبح کی آمد آمد کی اطلاع دیتی ہوئی کہیں نزدیک سے نکل گئی اور پھر سونا مشکل ہو گیا۔ صبح اٹھا تو محسوس ہوا جیسے جسم کو کسی نے اوکھلی میں رکھ کر کوٹ دیا ہے۔

ناشتے کے وقت میں نے منٹو سے پوچھا کہ صبح کیا بات تھی، کیا تم اُٹھے تھے؟ منٹو نے ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ "پانی صبح ہی آتا ہے۔ جب ہم لوگ اُٹھتے ہیں تو اوپر کی منزل ہونے کی وجہ سے اس کی بوند نہیں آتی۔ اس لئے میں صبح چار بجے اُٹھ کر دن بھر کی ضرورت کا پانی بھر لیتا ہوں" —— اور میں جتنے دن وہاں رہا اگرچہ ٹراموں اور بسوں کی آوازوں سے مانوس ہو گیا، لیکن جب منٹو صبح چار بجے اُٹھ کر پانی بھرتا تو ایک بار ضرور میری آنکھ کھل جاتی۔

ان دنوں کی یاد کے طور پر دوسری بات جو میرے دماغ میں محفوظ ہے وہ منٹو کا دسترخوان ہے —— دسترخوان کی جگہ یوں تو وہاں ڈائننگ ٹیبل تھا لیکن آداب قاعدہ اس کا دسترخوان ہی کا تھا۔ چھری کانٹے کا وہاں فقدان تھا۔ زمین پر بیٹھنے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور بس صفیہ بھابی کے ہاتھوں کے پکائے ہوئے مرغن پراٹھوں اور سالنوں کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی۔ منٹو بہت کم کھاتا تھا۔ زیادہ پینے کی وجہ سے شاید اس کی بھوک کم ہو گئی تھی۔ لیکن گھر میں ہو یا سٹوڈیو میں کھانا اس کے یہاں کا بہت پُرتکلف ہوتا تھا۔ اگرچہ میرا معدہ خراب نہیں لیکن ان دنوں مجھے وہم تھا کہ وہ خراب ہے اور میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ میں زیادہ نہ کھا جاؤں۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میں نے ہمیشہ زیادہ کھایا۔

ان دنوں کی تیسری یاد یہ ہے کہ گھر میں شاذ ہی منٹو کبھی ادب کے بارے میں بات کرتا تھا۔ دوسروں کا تجربہ کیا ہے میں یہ نہیں جانتا لیکن میں نے کبھی اسے صفیہ بھابی سے اپنی کسی کہانی یا ناٹک کی بات کرتے نہیں دیکھا۔ منٹو گھر میں خاموش رہتا ہو، یہ بات نہیں۔ ادھر اُدھر کی بیسیوں باتیں، مذاق، لطیفے، چٹکلے اس کی زبان سے جھڑتے رہتے، مذاق جن میں طنز ہوتا، باتیں جن سے اور باتیں نکلتیں اور جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا...... اور میں سوچا کرتا، اتنی فروعی اور سطحی باتیں کرنے والا کس طرح "نیا قانون" اور "ہتک" جیسے گہرے افسانے لکھ سکتا ہے۔ لیکن جس طرح چیخوف کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا لیکن اپنے ادب کی بات آنے پر ٹال جاتا تھا اسی طرح منٹو بھی اپنے ادب کی سنگینی کو اپنی بذلہ سنجی میں چھپائے رکھتا تھا —— اس سمندر کی طرح جس کے سینے میں بھیانک طوفان چھپے ہوں لیکن سطح پر ہلکی ہلکی لہروں کے تھپیڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا ہو۔

اور اسی طرح منٹو اپنی انسانیت اور انسان دوستی کو اپنی بے تکی، ٹیڑھی بینگی باتوں، سوقیانہ لطیفوں، گالیوں اور شراب نوشی میں چھپائے رکھتا تھا۔ مجھے منٹو سے ذاتی شکر رنجی کے باعث کئی بار نفرت ہوئی لیکن میں نے جب اس کے افسانے پڑھے میں ہمیشہ اس کی طرف کھنچا منٹو کو اپنے افسانوں کی تکنیک پر ناز تھا۔ کرشن نے لکھا ہے۔ "منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے، ان میں کہیں جھول نہیں آتا، کہیں کچے ٹانکے نہیں ہوتے —— استری شدہ، صاف ستھرے افسانے، زبان منجھی، سلیس اور سادہ ......" لیکن مجھے منٹو کے افسانے تکنیک کے اس کمال کی وجہ سے اچھے نہ لگتے تھے۔ کوئی زمانہ تھا جب موپساں کے افسانے پسند آتے تھے لیکن جوں جوں شعور پختہ ہوتا گیا معلوم ہوتا گیا کہ ان افسانوں کی تکنیک کے کمال ہی میں دراصل بناوٹ مضمر ہے اور جب ویسے دس بیس افسانے ایک ساتھ پڑھے تو وہ بناوٹ جو افسانے کے انجام میں نہاں رہتی ہے، گراں گزرنے لگی اور تب میں نے چیخوف کو پڑھا اور محسوس ہوا جیسے اس کے افسانے موپساں، مام یا او ہنری کی تکنیک سے یکسر محروم ہیں لیکن اس کے باوجود کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔ افسانہ ختم کرنے پر معلوم ہی

نہیں ہوتا کہ ہم نے افسانہ پڑھا ہے۔ میں نہیں جانتا منٹو پر چیخوف کا اثر تھا یا نہیں، لیکن ایک طرف گورکی، دوسری طرف ماپساں اور اس کی وساطت سے موپساں کا اثر اس پر ضرور تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تکنیک اس کی اپنی تھی۔ گورکی سے اس نے انسان دوستی اور پسماندہ لوگوں کی محبت اور ترقی پسند نقطۂ نظر لیا اور ماپساں یا موپساں سے تکنیک کا کمال۔ لیکن منٹو اگر زندہ رہے گا تو تکنیک کے اس کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس انسان دوستی کی وجہ سے جو اس کے افسانوں کے رگ و پے میں رچی ہوئی ہے۔ تکنیک کا وہ کمال جس کا اسے زعم تھا اور جس کا ذکر کرشن نے کیا ہے' اس کے افسانوں کو کمزور کر دیتا ہے —— مجھے اس کے افسانے 'ہتک'، 'سوراج کے لئے'، 'اور 'ننگی آوازیں' —— تینوں بہت اچھے لگے۔ تینوں کا نقطۂ نظر ترقی پسند ہے اور تینوں میں منٹو کی بے پناہ انسان دوستی نہاں ہے۔ لیکن تینوں کے انجام میں تصنع ہے۔

'ہتک' ہی کو لیجئے —— ہتک اس لئے عظیم نہیں کہ موپساں کے 'نکلس' کی طرح اس کا انجام عظیم ہے۔ 'نکلس' کی وہ آخری لائن کاٹ دیجئے' افسانہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جائے گا۔ لیکن ہتک میں یہ بات نہیں۔ جب سیٹھ سوگندھی کو ناپسند کر کے بیزاری کی ایک 'اونہہ' کرتا ہوا موٹر دوڑا کر لیجاتا ہے اور سوگندھی چونکتی ہے' اس کے اندر کی عورت چونکتی ہے —— عورت جو غیر ملوث رہی ہے' تو اس کے بعد افسانہ کہیں بھی ختم ہو سکتا ہے۔

اس لئے سوگندھی گھر آ کر جب مادھو کو دیکھتی ہے تو اس بے پناہ غصّہ کے بعد جسے منٹو نے چار صفحوں میں بیان کیا ہے' ایک سخت فقرہ' گالی یا 'اونہہ' جیسی کوئی ہتک آمیز بات کافی تھی۔ وہ اسے کمرے سے باہر کر کے اس کے منہ پر تھوک کر دروازہ بند کرتے ہوئے اسے اسی طرح محوِ حیرت چھوڑ سکتی تھی جیسے وہ سیٹھ اسے چھوڑ گیا تھا۔ یہ انجام ماپ یا موپساں کا ہوتا۔ لیکن منٹو ماپ یا موپساں نہیں۔ اسے ڈرامائی انجام پسند ہیں۔ سو وہ باری باری ایک ایک تصویر اتار کر نیچے بازار میں پھینکتی ہے (حالانکہ حقیقی زندگی میں پہلی تصویر ہی دو منزل اوپر سے کسی کے سر پر گر کر سارا معاملہ گڑبڑا کر سکتی تھی؛

سوگندھی کو معلوم نہیں کہ مادھو اس کے ہاں بیٹھا ہے۔ معلوم ہوتا تو وہ اس سے بدلہ لینے کی سکیم بناتی کہ وہ پہلے اس کے کیس کی بات پھینکے گی پھر اس کی تصویر باہر پھینکے گی' پھر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے باہر نکالے گی (منٹو نے یہ ساری اسکیم اپنے دماغ میں بنائی تھی' بالکل اسی طرح جیسے خوشیا میں) سوگندھی کے دماغ میں یہ سکیم نہ تھی لیکن وہ اسی طرح کرتی گئی' جیسے مصنف نے چاہا کہ وہ کرے۔ حقیقی زندگی میں غصّہ جب اپنے عروج پر ہوتا ہے' اس طرح پھیل کر نہیں نکلتا۔ پھیلنے اور سکیم بنانے کے لئے وقت چاہئے۔

لیکن انجام کی اس کمزوری کے باوجود 'ہتک' کی عظمت میں شک نہیں اور وہ عظمت اس کے کنٹنٹ (CONTENT) کی عظمت ہے دو تین سال پہلے الہ آباد کے ترقی پسند مصنفین کی ایک میٹنگ میں نقاد ممتاز حسین نے جب 'ہتک' کے خلاف یہ فتویٰ صادر کیا کہ یہ ترقی پسند افسانہ نہیں تو میں نے مخالفت کی تھی۔ 'ہتک' 'نئے زاویے' کی پہلی جلد میں شائع ہوا تھا اور ترقی پسند افسانوں میں ممتاز سمجھا گیا تھا۔ ایک وقت جو چیز ترقی پسند سمجھی جائے وہ دوسرے وقت رجعت پسند کیسے ہو سکتی ہے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی —— ممتاز حسین صاحب کے سمجھانے کے باوجود

...سوگندھی جب گھر کی طرف لوٹتی ہے تو سوچتی ہے ——

"اسے صرف میری شکل پسند نہیں آئی —— نہیں آئی تو کیا ہوا؟ —— مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی —— وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا' کتنی بری صورت تھی اس کی —— کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ —— کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی —— ٹھیک ہے' پر سوگندھی' تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا' تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا ——"

نہیں ٹھکرایا تھا، اس لئے کہ وہ ٹھکرا نہ سکتی تھی، وہ غلیظ سے غلیظ مرد کے ہاتھ بھی اپنا تن بیچنے کو مجبور تھی اور اسی لئے اسے نہ اپنے آپ پر غصہ تھا نہ رام لال پر بلکہ سیٹھ پر غصہ تھا، اور یہ غصہ وہی ہے جو مصنف کو ہے۔ مصنف سوگندھی اور رام لال کو اس جہاں جنی دور کا شکار سمجھتا ہے اس لئے انہیں بے بس اور مجبور سمجھتا ہے اور ان کے درد و غم سے تلملاتا ہے اور اس سیٹھ کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے کیونکہ اسے وہ اس تہذیب کا سمبل سمجھتا ہے)

'ہتک' کا یہ پیرا افسانے کو انسان کا زبردست المیہ بنا دیتا ہے، جب تک یہ نظام رہے گا جس میں عورت کی یوں ہتک ہوتی رہے گی وہ اپنا تن چند سکوں کے عوض غلیظ سے غلیظ شخص کے ہاتھ بیچنے پر مجبور رہے گی، ہتک کی ترقی پسندی قائم رہے گی۔ خام ترقی پسند نقادوں کے فتووں کے باوجود یہ نظام بدل جائے گا تو ہتک ایک تاریخی حیثیت حاصل کرلے گا، جسے آنے والی نسلیں بربریت اور بہیمیت کی یاد کے طور پہ پڑھا کریں گی۔

"سوراج کے لئے" کا بنیادی خیال بھی انسان کے غیر فطری عزائم اور اس کے ڈھونگ کے خلاف ایک طنز ہے۔ منٹو نے اس ڈھونگ کا پول نہایت چابکدستی سے کھولا ہے، اس کا ایک ایک پرت اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ لیکن اس افسانے کا انجام بھی کمزور ہے۔ یہ اشارہ کہ شہزادہ غلام علی ایک فطری فعل کو جس غیر فطری طریقے پر سرانجام دیتا رہا اس کے ردِ عمل کے طور پر اس نے ربڑ کی چیزیں نہ بیچنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اپنی جگہ کافی ہے، اور منٹو جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے وہ اچھی طرح اُجاگر ہو جاتی ہے۔ لیکن منٹو اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ جس طرح سوگندھی کو غصے میں اس نے سنکی بنا دیا، اسی طرح شہزادہ غلام علی کو نارمل انسان بناتے بناتے سنکی بنا دیتا ہے اور اس افسانے کا اختتام یوں کرتا ہے:

> "غلام علی اس کے آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ اس کا نوکر اندر داخل ہوا۔ اس کی گود میں شاید غلام علی کا
> دوسرا بچہ تھا، جس کے ہاتھ میں ایک خوش نما بیلون تھا۔ غلام علی دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹا ———
> پٹاخے کی سی آواز آئی ——— بیلون پھٹ گیا اور بچے کے ہاتھ میں دھاگے کے ساتھ ربڑ کا ایک چھوٹا سا
> ٹکڑا لٹکا رہ گیا ——— غلام علی نے دو انگلیوں سے اس ٹکڑے کو چھین کر یوں پھینکا جیسے وہ کوئی
> مکروہ چیز تھی۔"

اور یہ انجام افسانے کو مکروہ بنا دیتا ہے اور غیر ضروری ہے۔ غلام علی کو ربڑ کی جس چیز سے نفرت تھی اس کی طرف منٹو نے ناظر کا دھیان پہلے ہی اس بات کا ذکر کر کے دلا دیا ہے کہ وہ ربڑ کی چیزیں فروخت نہیں کرتا۔ ربڑ کے غبارے کو دیکھتے ہی اس پر اس کا جھپٹنا اسے سنکی بنا دیتا ہے اگر یہ واضح اشارہ دینا ضروری تھا تو پہلے اشارے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلے اشارے کے بعد یہ دوسرا اشارہ افسانے کو خام اور شہزادہ غلام علی کو سنکی بنا دیتا ہے۔

لیکن اس خامی کے باوجود یہ افسانہ منٹو کے افسانوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ بنیادی خیال کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ منٹو نے اس وقت کی سیاسی زندگی کی ایسی حقیقی تصویر کھینچی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شہزادہ غلام علی کوئی حقیقی کردار ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں یقینی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن منٹو نے جس دن یہ افسانہ لکھنا شروع کیا اس سے کچھ دن پہلے یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی تھی کہ مہاتما گاندھی نے اپنے آشرم میں ایک جوڑے کی شادی اپنے ہاتھوں سرانجام دی اور اس جوڑے نے شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہوگا وہ دوستوں کی طرح رہیں گے ——— مجھے یاد نہیں کہ منٹو نے اس خبر کو پڑھ کر کیا کہا تھا۔ وہ استہزاء سے مسکرایا تھا اور اس حیثیت میں اس نے کوئی گالی اس جوڑے کو دی تھی۔ اس کے کچھ دن بعد وہ یہ افسانہ لکھنے بیٹھا تھا۔

اس افسانے کے بنیادی خیال پر منٹو پہلے بھی ایک افسانہ 'پانچ دن' کے عنوان سے لکھ چکا تھا۔ پانچ دن میں پروفیسر کہتا ہے ——— پروفیسر

جو اپنی طالبات کو اپنی بچیاں سمجھتا تھا ـــــ

"میں ایک جھوٹ ہوں، بہت بڑا جھوٹ ـــــ میری ساری زندگی اپنے آپ سے جھوٹ بولنے اور پھر اسے سچ بنانے میں گزری ہے ـــــ اُف کتنا تکلیف دہ، غیر فطری اور غیر انسانی کام تھا میں نے ایک خواہش کو مارا تھا، لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس قتل کے بعد مجھے اور بہت سے خون کرنے پڑیں گے۔ میں سمجھتا تھا ایک مسام کو بند کر دینے سے کیا ہو گا۔ لیکن مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ مجھے اپنے جسم کے سارے دروازے بند کر دینے پڑیں گے۔"

اسی بنیادی خیال کو اور بھی اُبھار کر منٹو نے "سوراج کے لئے" میں بیان کیا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جب ان کے والد بیمار تھے، وہ اپنی نئی بیاہی بیوی کے ساتھ فرائضِ خاوندی سرانجام دے رہے تھے۔ حیرت ہے اس حقیقت کو جاننے کے باوجود انہوں نے کیوں دوسروں کے لئے فطری راستوں کو مسدود کرنا مناسب سمجھا۔ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو جو ان کے دوست کی بیٹی کو چاہتا تھا، حکم دیا کہ اگر تم پانچ سال بعد بھی اس لڑکی کو چاہو گے تو تمہاری شادی کر دی جائے گی اور انہوں نے اپنے بیٹے کو کسی دور دراز علاقے میں آزادی کی لڑائی لڑنے کے لئے بھیج دیا۔ ایک دوسرے آشرم واسی اور آشرم واسنی میں جب محبت ہوئی اور انہوں نے مہاتما گاندھی کا آشیرواد چاہا تو مہاتما گاندھی نے وہی پانچ سال کی قید لگا دی کہ آزادی کے یگیہ میں پانچ سال تک اپنے جذبات کی آہوتی دینے کے بعد بھی اگر تم ثابت قدم رہے تو میں اپنے ہاتھوں تمہاری شادی کر دوں گا۔

ان کے بیٹے پانچ برس تک ثابت قدم رہے اور مہاتما گاندھی نے ان کو اپنی محبوبہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ دوسرے بھگت یہ قید برداشت نہ کر سکے اور وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ بھاگ گئے۔

منٹو کو ان واقعات کا علم نہ تھا ورنہ مجھے یقین ہے کہ وہ ان پر بھی "سوراج کے لئے" جیسے طنزیہ افسانے لکھتا۔ جیسا کہ میں اسے جانتا ہوں پہلے افسانے میں مہاتما گاندھی (یا ان کے بدل کے طور پر کسی روحانی یا سیاسی گرو) کے اس فیصلے کے بعد وہ دکھاتا کہ نوجوان پانچ سال اس لڑکی سے محبت کئے جاتا ہے کیونکہ محبت تشنگی میں پلتی ہے۔ لیکن چھٹے برس جب اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اس لڑکی کو رومانی آنکھوں سے نہیں حقیقی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو وہ اس سے سخت نفرت کرنے لگتا ہے ـــــ دوسرے قصے پر وہ شاید افسانہ لکھنا پسند نہ کرتا یا جوں کا توں اسے لکھ دیتا اور دونوں آشرم واسیوں کو بھگا دیتا کہ یہ فطرت کے عین مطابق تھا۔

نہ جانے مہاتما گاندھی میں یہ سادیت پسندی کیوں تھی۔ اپنی جوانی کی یاد کرتے وقت وہ دوسروں کی جوانی کی بات کیوں بھول جاتے تھے۔ لیکن وہ شاید عوام کی نفسیات کے بڑے بھاری عالم تھے اور ہندوستانی عوام کے دلوں کو کس طرح جیتا جا سکتا تھا اسے بخوبی جانتے تھے ـــــ لیکن منٹو سیاستدان نہیں تھا اور وہ جہاں کہیں انسان کے فطری جذبوں کا خون ہوتے دیکھتا تھا تلملا جاتا تھا۔ "سوراج کے لئے" میں اس کی تلملاہٹ دیکھئے۔ شہزادہ غلام علی کے منہ سے وہ کہلواتا ہے:

"دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں ان کی تعلیم کو لوگ بھول چکے ہیں لیکن صلیبیں، دھاگے، داڑھیاں کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں ـــــ ایک ہزار برس پہلے جو لوگ یہاں بستے تھے ہم ان سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آج کے مصلح کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ انسان کی شکل مسخ کر رہے ہیں۔ جی میں کئی دفعہ آتا ہے بلند آواز میں چلانا شروع کر دوں ـــــ خدا کے لئے انسان کو انسان رہنے دو۔ اس کی صورت تم بگاڑ چکے ہو، ٹھیک ہے ـــــ اب

اس کے حال پر رحم کرو ـــــ تم اس کو خدا بنانے کی کوشش کرتے ہو، لیکن وہ غریب اپنی انسانیت
بھی کھو رہا ہے ...... نفس ہزاروں میں ایک دو آدمی ماریں گے۔ سب نے اپنا نفس مار لیا تو میں
پوچھتا ہوں یہ کشتہ کس کام آئے گا؟"

اور جوں ہی انسان کے ان اساسی جذبات کو منٹو اپنے اس افسانے میں اجاگر کرتا ہے، افسانہ عظمت حاصل کر لیتا ہے۔

"ننگی آوازیں" کا اختتام بھی "ہتک" اور "سوراج کے لئے" کے اختتام سے مختلف نہیں۔ افسانہ کا بنیادی خیال بھی ہتک کی طرح انسان کا ایک دوسرا المیہ بیان کرتا ہے۔ ایک لمبی چھت پر مہاجرین اپنی اپنی چارپائیوں کے گرد ٹاٹ باندھ کر یعنی اپنی طرف سے پردہ کر کے سوتے ہیں۔ لیکن ان کے دائیں بائیں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لوگوں کے سونے سے ان کنواروں پر کیا گزرتی ہے جو اس طرح سونے پر مجبور ہیں۔ اسی کا خاکہ منٹو نے اس افسانے میں کھینچا ہے۔ "ننگی آوازیں" کا بھولو بھی خوشیا کی طرح حساس ہے۔ کیونکہ وہ حساس نہ ہوتا تو اسے اس ماحول میں اپنی نئی بیاہی بیوی کے ساتھ سونے میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ نہ ہوتی (ظاہر ہے خوشیا کی طرح بھولو کے قالب میں بھی منٹو نے اپنی حساس طبیع کو ڈھال دیا ہے)؛ لیکن افسانہ وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں کہ بھولو کی بھاوج اپنے دیور کی تکلیف کی اصل ماہیت کو نہ سمجھ کر اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ وہ فرائض خاوندی سرانجام دینے سے قاصر ہے۔ افسانہ کا المیہ وہاں مکمل ہو جاتا ہے۔ مو پاساں اس کے بعد ایک لفظ بھی لکھنا گناہ خیال کرتا لیکن منٹو مو پاساں نہیں۔ وہ اپنا غصہ اس طرح قابو میں نہیں رکھ سکتا اور اس لئے جہاں اس نے سوگندھی اور شہزادہ غلام علی کو غصہ میں نیم دیوانہ دکھایا تھا وہاں بھولو کو بالکل دیوانہ بنا چھوڑا ہے ـــــ جو غصہ کی اس انتہا پر پہنچ کر کوٹھے پر لگے ہوئے ٹاٹوں کو اکھاڑنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ سر پر کلن کے بانس کی ضرب کھا کر بالکل پاگل ہو جاتا ہے، اور منٹو اس افسانے کو یوں ختم کرتا ہے:

"اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے۔ کہیں ٹاٹ لٹکتا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے
کر دیتا ہے۔"

لیکن اختتام کی اس خامی کے باوجود اس کہانی کا درد منٹو کی ایک دوسری کہانی "شریفن" کی طرح ناقابل فراموش ہے۔ منٹو کو غصہ ہے بے پناہ غصہ کہ انسان جو احساس کی دولت سے مالا مال ہیں، کیوں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اور جب منٹو کو غصہ آئے تو قابو میں رکھنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے اور اسی غصہ میں وہ بارہا کہانی کے فن کو بھول کر سنکی ہو جاتا ہے ـــــ "ہتک"، "سوراج کے لئے" اور "ننگی آوازیں" سب ایک جیسے اختتام اس کے اسی بے پناہ غصہ کی چغلی کھاتے ہیں؛ لیکن شاید اسی غصہ کی وجہ سے ان کہانیوں میں دردمندی آگئی ہے جو انہیں زندہ جاوید بناتی ہے۔

منٹو اپنے غصہ میں ہمیشہ تکنیک کو فراموش کر دیتا ہو، یہ بات نہیں۔ "شریفن" میں اس کا غصہ اور دردمندی وہی ہے اور تکنیک سر سے پیر تک درست ہے۔ پنجاب کے فسادات اور بربریت کو دیکھ کر ہر کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ کیسے مہذب لوگ، ایک دوسرے کو چاہنے والے، ایک دوسرے کو پیار کرنے والے، ایک ساتھ کھانا کھانے والے اور رہنے والے اس قدر وحشی ہو گئے کہ جنہیں وہ اپنی مائیں اور بہنیں سمجھتے تھے انہی کی عصمت دری پر اتر آئے؟ منٹو نے "شریفن" میں اس کا جواب دیا ہے اور افسانہ کی آخری لائن لوہے کی گرم سلاخ کی طرح دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے ایک نشان بنا دیتی ہے۔

میں منٹو کی کہانیوں کو ہمیشہ پسند کرتا رہا ہوں۔ اس کے غصہ اور جھنجھلاہٹ کے لئے میرے دل میں ہمیشہ ہمدردی رہی ہے۔ حالانکہ انسان کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر سے مجھے اتفاق نہیں رہا۔ منٹو مہاتما گاندھی، بدھ یا عیسیٰ مسیح پر طنز کر سکتا ہے؛ میں اس کے طنز کو پسند بھی

کرسکتا ہوں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ خود بھی وہ طنز کرنا پسند کروں۔ جب منٹو انسان کے اساسی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ کوئی غلط بات نہیں کرتا۔ کیونکہ ہماری حیوانیت، خام انسانیت، ہمارے پروورشنز اور ہمارے کردار کی خامیوں کو بتانا غلط نہیں لیکن جب وہ ان کا جواز دیتا ہوا ان پروورشنز کو رکھیں کہیں، جائز سمجھتا ہے اور انسان کے بنیادی جذبات پر کسی طرح کی قید پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اس کے بنیادی جذبوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ دینا ہی اسے انسان بنائے رکھنا ہے (منٹو کی کئی کہانیاں —— ممی، پڑھیئے کلمہ وغیرہ اس بات کی نظیر ہیں) تو میری رائے میں وہ غلطی پر ہے۔ انسان کے بنیادی جذبے وہی ہیں جو اس کے جدِ امجد کے —— بنیادی طور پر وہ حیوان ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب تہذیب و تمدن کی قیود اس کے ان بنیادی جذبوں کے اوپر سے ہٹ جاتی ہیں تو وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آجاتا ہے —— خود غرض، خود پرست، کمینہ لالچی، غصہ ور، نفس پرست، حیوان —— اپنے ان بنیادی جذبوں کو دبا کر یا انہیں سُدھار کر وہ انسان بنا دیتا ہے۔ جس چیز کو آج ہم انسانیت کہتے ہیں —— جو بربریت کی متضاد ہے —— اسے اس حیوان نے (جسے ہم آج انسان کہتے ہیں) صدیوں کی محنت سے حاصل کیا ہے اور اس کے حصول میں ان بے شمار پیغمبروں، مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کا ہاتھ ہے جنہوں نے اپنے بنیادی جذبات کے باوجود فکر و عمل کی وہ راہیں نکالیں جن پر چل کر وہ حیوان انسان بنا —— منٹو انسانیت پرست ہے، اس لئے جب وہ انسانوں کو حیوانوں جیسے فعل کرتے دیکھتا ہے تو تلملا اٹھتا ہے۔ لیکن انسان کیوں ایسا کرتے ہیں، اسے کس پر غصہ کرنا چاہئے، کس پر اپنے قلم کا وار کرنا چاہئے، اسے معلوم نہیں۔ علی سردار جعفری نے "چغد" کے دیباچے میں منٹو کے کرداروں پر لکھتے ہوئے اس غصے کا خوب تجزیہ کیا ہے:

"یہ (منٹو نے جن کرداروں کا خاکہ اپنی کہانیوں میں کھینچا ہے) کبھی انسان تھے یا ان میں انسان بننے کی صلاحیت تھی۔ لیکن اس سماج نے جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے، ان سب کو جانور بنا دیا۔ وہ جانور جن کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں، لیکن جو پھر بھی انسان نہیں ہیں۔ منٹو جھلا جاتا ہے۔ وہ ان کی روح کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے سینوں کے اندر انسانی دل دھڑک رہے ہیں۔

لیکن اسی سماج نے انسانی کردار بھی پیدا کئے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ ان کے چہرے بھی انسانوں کے سے ہیں، ان کی رُوح بھی انسانوں کی سی ہے اور ان کے دل بھی۔ جد و جہد نے انہیں ان کی دولت واپس دے دی ہے، لیکن منٹو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی دہشت پسندی پر اتر آتا ہے اور اگر اس کا بس چلے تو وہ سیاسی دہشت پسندی پر بھی آمادہ ہو جائے 'منٹو کے افسانے' کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے:

"جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں دھڑکا نہ رہے گا کہ یہ خود بخود چل جائے گا تو میں اسے لہراتا ہوا نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا یا خود چھلنی ہو جاؤں گا۔ اس موت پر جب میرا کوئی نقاد کہے گا کہ پاگل تھا تو میری رُوح ان لفظوں کو ہی سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھا لے گی اور اپنے سر پہ آویزاں کر لے گی۔"

لیکن منٹو کو یہ معلوم نہیں کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود انسان یعنی اس کے حیوانی جذبے ہیں، جنہوں نے بظاہر اس دور میں سرمایہ داری کی شکل لے لی ہے۔ لیکن جو در حقیقت ہمیشہ اس کے اندر سے باہر نکلنے کو کلبلی مچاتے رہتے ہیں۔ انسان کو اپنے اجداد کی طرح ہمیشہ نبرد آزما رہنا ہے

ایک شخص کے سینے میں پستول کی ساری گولیاں ختم کرنے سے اس دشمن کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ لڑائی ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ انسان نظام کے بعد نظام بدلتا رہے گا اور آخر کار یا تو اپنے حیوانی جذبوں کو ختم کر کے دیوتا بن جائے گا یا ختم ہو جائے گا —— لیکن جب تک دونوں میں سے ایک چیز نہیں ہو جاتی، وہ انسان بننے کی کوشش کرتا رہے گا۔ یہ مسلّم ہے۔ علی سردار جعفری نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

> "منٹو اپنے اصلی دشمن کو نہیں پہچانتا اور خالی ہوا میں وار کرتا ہے، جس کی چوٹ کسی پر نہیں پڑتی۔ اس لئے
> اس کی دہشت پسندی اپنے آخری تجزیے میں خود انسان کے خلاف دہشت پسندی بن جاتی ہے
> جس سے منٹو کو بے انتہا محبت تھی۔"

لیکن منٹو کے بہترین افسانوں میں اس کی انسان دوستی، انسان پرستی اور دردمندی اپنے عروج پر ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر اس نے کہا ہوگا۔ "سردار مسخرہ ہے۔ انسانی دل کی ان تاریکیوں کا اسے علم نہیں جن کا پتہ میں نے مدت ہوئی پا لیا ہے۔"

فلمستان کی دو سال کی ملازمت میں چودہ پندرہ ہزار روپیہ میں نے اکٹھا کر لیا تھا۔ ارادہ تھا ہندی اُردو دونوں میں پبلشنگ شروع کروں گا۔ منٹو اور میں دونوں فلمستان سے الگ ہو رہے تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا "میں ہندی میں پبلشنگ شروع کروں گا تو تمہاری تیس بہترین کہانیاں چھاپونگا۔ کتنے فیصدی رائلٹی لوگے؟"

"رائلٹی وائلٹی چھوڑو۔" منٹو نے کہا۔ "تم پانچ سو نقد آج مجھے دو۔ پھر چاہے قیامت تک افسانے شائع کرتے رہو۔"

میں منٹو کے افسانے ضرور شائع کرتا لیکن کچھ ہی دن بعد میں بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دیا اور میں لاہور جانے کے بجائے پنچ گنی BEL AIR سینی ٹوریم میں چلا گیا۔ گذشتہ پانچ سال سے میں اس کوشش میں ہوں کہ منٹو سے اپنا وعدہ پورا کروں۔ لیکن ابھی تک ممکن نہیں ہوا حالانکہ افسانے ترجمہ کرائے پڑے ہیں۔ منٹو اتنی جلدی رفاقت یا عداوت چھوڑ کر چل دے گا، یہ معلوم نہ تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اپنی کتابیں چھوڑ کر پہلے اس کے نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہندی میں شائع کر دیتا۔

منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "بچپن اور لڑکپن میں میں نے جو کچھ چاہا وہ پورا نہ ہونے دیا گیا۔ یوں کہو کہ میری خواہشات کچھ اس طرح پوری کی گئیں کہ ان کی تکمیل میرے آنسوؤں اور میری ہچکیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں شروع ہی سے جلد باز اور زود رنج رہا ہوں۔ اگر میرا جی کسی مٹھائی کھانے کو چاہا ہے اور یہ چاہ عین وقت پر پوری نہیں ہوئی تو میرے لئے اس خاص مٹھائی میں کوئی لذت نہیں رہی۔ ان امور کی وجہ سے میں نے ہمیشہ اپنے حلق میں ایک تلخی سی محسوس کی ہے اور اس تلخی کی شدت بڑھانے میں اس افسوسناک حقیقت کا ہاتھ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی، جس کو اپنے دل میں جگہ دی اس نے نہ صرف میرے جذبات کو مجروح کیا بلکہ میری اس کمزوری (محبت) سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔
>
> "جب اس ضمن میں مجھے ہر طرف سے ناامیدی ہوئی —— یعنی جس کو میں نے دل سے چاہا" تو میری طبیعت بجھ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ میں ریگستان میں ایک بھونرے کی مانند ہوں جسے رس چوسنے کیلئے حدِ نظر تک کوئی پھول نظر نہیں آسکتا، لیکن اس کے باوجود محبت کرنے سے باز نہ رہا اور حسبِ معمول کسی نے بھی میرے اس جذبے کی قدر نہ کی۔ جب پانی سر سے گذر گیا اور مجھے میرے نام نہاد دوستوں کی بے وفائیاں اور سرد مہریاں یاد آنے لگیں تو میرے سینے کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ میرے جذباتی، سرمدی اور ناطق وجود

میں ایک جنگ سی چھڑ گئی۔ ناطق وجود ان لوگوں کو ملعون و مطعون گردانتے ہوئے اور گزشتہ واقعات کی افسوسناک تصویر دکھاتے ہوئے اس بات کا طالب تھا کہ میں آئندہ سے اپنا دل پتھر کا بنا لوں اور محبت کو ہمیشہ کے لئے باہر نکال پھینکوں لیکن جذباتی وجود ان افسوسناک واقعات کو دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مجھے فخر کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ میں نے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں محبت کئے جاؤں کہ یہی کائنات کی روح رواں ہے۔

" یہ جنگ خدا جانے کس نامبارک روز شروع ہوئی کہ اب میری زندگی کا ایک جزو بن کر رہ گئی۔ دن ہو یا رات جب کبھی مجھے فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہیں، میرا ناطق اور جذباتی وجود ہتھیار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان لمحوں میں اگر میرے ساتھ کوئی ہمکلام ہو تو میرا لہجہ یقیناً کچھ اور قسم کا ہوتا ہے۔ میرے حلق میں ایک ناقابلِ بیان تلخی گھل رہی ہوتی ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ اپنے لہجے کو درشت نہ ہونے دوں اور بعض اوقات اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ لیکن اگر میرے کانوں کو کوئی ناگوار خبر سنائی دے یا میں کوئی ایسی چیز محسوس کروں جو میری طبیعت کے یکسر خلاف ہو تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے سینے کی گہرائیوں سے جو کچھ بھی اٹھے، زبان کے راستے باہر نکل جاتا ہے۔ ان کی تلخی اور درشتی کا احساس مجھے اس وقت کبھی نہیں ہوا اس لئے کہ میں اپنے اخلاص سے ہمیشہ اور ہر وقت باخبر رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں نے اپنے ملنے والوں میں سے یا کسی دوست کو ناخوش کیا ہے تو اس کا باعث میں نہیں ہوں بلکہ یہ خاص لمحات ہیں جب میں ولیلانے سے کم نہیں ہوتا ..... "

منٹو کی یہ کہانی جس کا عنوان "ایک خط" ہے، پڑھتے پڑھتے جب یہ سطریں میری نظر سے گزریں تو مجھے افسوس ہوا کہ میں منٹو سے اس وقت کیوں نہ ملا جب اس کا ناطق وجود سویا ہوا تھا، اور وہ دوستوں کی بیوفائیوں اور سرد مہریوں سے ناآشنا تھا کیونکہ دوستوں کی بیوفائیوں اور سرد مہریوں کا گلہ اسے ہی نہیں مجھے بھی ہے۔ ان سطروں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ منٹو اپنے بارے میں نہیں میرے بارے میں یہ لکھ رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے ناطق وجود نے مجھے کبھی اس طرح پریشان نہیں کیا۔ کسی دیرینہ دوست نے بیوفائی کی، بے مہری کا سلوک کیا تو خواہ تکلیف کتنی بھی کیوں نہ ہوئی، لہجے میں تلخی نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ جانے کہیں پڑھ کر یا اپنے والد کے اور اپنے تجربوں سے میں نے بہت پہلے دوستی اور محبت کے بارے میں ایک طرزِ عمل اپنا لیا تھا اور وہ یہ کہ دوستی اور محبت یکسر یک طرفہ چیز ہے۔ میں جسے اپنے دوست کے طور پر چاہتا ہوں جس کی قربت سے مجھے تسکین ملتا ہے، اس سے دوستی بنائے رکھنا، اس سے محبت کرنا میرا کام ہے۔ جب اس سے محبت کرتے کرتے اس بات کی آرزو ہونے لگتی ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے "اسی طرح جیسے کہ میں اس سے کرتا ہوں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو بڑی تکلیف ہوتی ہے پہلے یہ تکلیف بڑی شدت سے ہوتی تھی لیکن اب نہیں ہوتی۔ میں اس سے بدستور دل میں محبت کرتا رہتا ہوں لیکن بظاہر خاموش ہو جاتا ہوں اور چونکہ بغیر محبت کئے رہا نہیں جاتا اس لئے دوستی نبھانے کے لئے کوئی دوسرا چن لیتا ہوں اور میں اپنے آپ کو ایسے پھول سا پاتا ہوں جو رس اور گندھ سے بھرا ہے۔ اسے کوئی بھونرا اچھا لگتا ہے تو اپنی خوشبو سے اسے بلا لیتا ہے۔ رس اور خوشبو پلاتا ہے، خوش ہوتا ہے لیکن بھونرا چلا جاتا ہے۔ وہ اس کی یاد دل میں رکھتا ہے اور کسی دوسرے کو بلا لیتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو بے حد تنہا اور اداس پاتا ہے لیکن اس تسکین کی یاد اس کے دل کی اداسی کو دور کر دیتی ہے جو اس نے محبت کا رس اور خوشبو لٹانے میں پائی تھی۔

منٹو نے یہ سطریں بڑے احساس کے ساتھ لکھی ہیں، اور چونکہ میں نے منٹو کو قریب سے دیکھا ہے اس لئے ان کی حقیقت سے مجھے انکار نہیں۔

یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں منٹو سے اس وقت ملا جب اس کا ناطق وجود اس کے حلق کو تلخ اور لہجے کو درشت کر چکا تھا۔

منٹو ٹھیک کہتا ہے، وہ دانستہ کسی کو تکلیف نہ پہنچانا چاہتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب دو بار اس نے مجھے غصہ کی شدت میں گالی دی تو فوراً اس پر افسوس کا اظہار کر دیا...... دونوں بار مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہو سکتے ہیں، لیکن ہم بہت دیر میں ملے تھے۔ جوانی کے شروع میں ملے ہوتے تو یقیناً بہت اچھے دوست ہوتے۔

بمبئی سے آنے کے بعد منٹو کی زیادہ خبر نہیں ملی۔ اس کا ایک خط لاہور سے آیا تھا کہ وہ محمد حسن عسکری کے ساتھ مل کر ایک پرچہ نکال رہا ہے اور میں اس کے لئے افسانہ لکھوں۔ میں ان دنوں بیمار تھا۔ جن دوستوں کے بھروسے الٰہ آباد آیا تھا انہوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور سخت ذہنی و جسمانی کشمکش میں مبتلا تھا۔ لیکن میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ میں افسانہ ضرور لکھوں گا۔ پھر نہ جانے وہ پرچہ نکلا یا نہیں، نکلا تو مجھ تک نہیں پہنچا۔ اتنا یقین ہے کہ اس کے دو ایک نمبر آتے تو میں جیسے بھی ہوتا اس کے لئے ضرور افسانہ لکھتا۔

بس اس خط کے علاوہ بمبئی کی فلمی زندگی کے بعد منٹو سے کسی قسم کی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ ہاں جب بھی اس کا کوئی نیا افسانہ آتا اس کا ذکر گھر میں ہوتا۔ وہ ایک دن میں اور کوشلیا اس کی باتیں کرتے اور پھر زندگی کے تقاضے دوسری باتوں میں الجھا دیتے۔ پھر اچانک اسی جنوری میں سُنا کہ منٹو رحلت کر گیا۔ یقین نہیں آیا۔ میرے دوست اور پڑوسی بھیرو پرساد گپت نے مجھے یہ خبر دی۔ وہ منٹو کے بڑے بھگت ہیں۔ دس برس ہندی کے سب سے کثیر الاشاعت پرچہ 'مایا' کی ادارت کر کے اب 'کہانی' میں آگئے ہیں۔ وہ 'مایا' میں منٹو کے متعدد افسانوں کے ترجمے شائع کر چکے ہیں اور ابھی کچھ ہی دن پہلے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' "کہانی" کے سالنامے میں شائع کیا تھا جس نے منٹو کا سکہ ہندی کے قارئین کے دلوں پر جما دیا۔

مجھے اچانک بھیرو کی بات کا یقین نہیں آیا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ 'امرت پتریکا' میں خبر چھپی ہے اور ریڈیو سے براڈکاسٹ بھی ہوئی ہے۔ میں نے ریڈیو کے اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر گوپال داس کو فون کیا کہ آیا واقعی ایسی کوئی خبر نشر ہوئی ہے؟ ان کی لڑکی سخت بیمار تھی، انہوں نے خبر نہیں سُنی تھی۔ تب میں نے اسٹوڈیو فون کیا۔ وہاں ڈیوٹی پر منیر صاحب رہتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں ضرور معلوم ہوگا لیکن ابھی ٹرانسمیشن شروع نہ ہوئی تھی اور منیر صاحب آئے نہ تھے، مگر مجھے چین نہ آیا۔ چراغ جلے میں نے پھر انہیں فون کیا۔ انہوں نے اس خبر کی تصدیق کر دی بلکہ انہوں نے کہا کہ پاکستان ریڈیو سے آدھ گھنٹے کا پروگرام بھی نشر ہوا ہے۔

تب میں نے آکر کوشلیا کو بتایا کہ یہ خبر ٹھیک ہے۔ وہ بے ساختہ آنکھیں بھر لائی۔ میرے ہاں ان دنوں ہندی کی مشہور ادیبہ اور افسانہ نگار کماری کرشنا سوبتی آئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھانے کو بالکل جی نہ چاہتا تھا لیکن کچھ بچوں اور کچھ مہمان کے خیال سے کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ لیکن میں کھانا کھانے کے بجائے انہیں منٹو کے بارے میں بتاتا رہا۔

الٰہ آباد میں منٹو کے جاننے والوں میں میں اور محمود احمد ہنر تھے۔ کچھ لوگوں نے اس کا نام سُنا تھا اور کچھ نے اس کے افسانے پڑھے تھے۔ بہر حال بھیرو پرساد گپت اور ہنر نے مل کر طے کیا کہ منٹو کی اس بے وقت موت پر اظہار افسوس کے لئے اُردو ہندی ادیبوں کی ایک میٹنگ کی جائے۔

اگرچہ گذشتہ غلط روش کی وجہ سے ترقی پسند ادیبوں میں خاصا انتشار ہے لیکن الٰہ آباد میں بارہا ترقی پسند کافی تعداد میں مل بیٹھتے ہیں اور خاصے اچھے جلسے ہو جاتے ہیں۔ علی سردار جعفری، احتشام حسین اور راجندر سنگھ بیدی کی آمد کے سلسلے میں جو جلسے ہوئے ان میں خاصے لوگ شامل ہوئے لیکن منٹو کی وفات کے سلسلے میں جو میٹنگ ہوئی وہ کچھ ایسی بے تکی ہوئی کہ اس کی تلخ یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

پہلے میٹنگ میرے یا فراق صاحب کے ہاں کرنے کا ارادہ تھا لیکن پھر نہ جانے کیسے جب اس کا اعلان ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ میٹنگ چوک کے

ایک ایسے پبلشر کے ہاں ہو رہی ہے جو ہندی کے کئی جاسوسی پرچے ایک ساتھ نکالتے تھے اور اب سال بھر سے اُردو میں ایک جاسوسی پرچہ نکال رہے ہیں۔ پڑھے لکھے تو خاک نہیں ہیں لیکن ادھر جب سے ان کے پاس پیسہ ہو گیا ہے ان کی بڑی خواہش رہتی ہے کہ وہ ایک ادیب ان کی صحبت میں رہیں۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ کبھی اس کو یا کبھی اس کو کافی ہاؤس میں، جو کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ جب بِل آتا ہے تو جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر طشتری میں رکھتے ہیں۔

ان دنوں ہنرؔ صاحب غالباً ان کے ہاں کام کرتے تھے اس لئے میٹنگ وہیں کرنے کا فیصلہ ہو گیا لیکن بدقسمتی سے صبح سے مطلع ابر آلود ہو گیا اور دس گیارہ بجے سے بارش شروع ہونے لگی۔ جنوری کا مہینہ اور بارش۔۔ شام ہوتے ہوتے خوب سردی ہو گئی۔ چھاتے برساتیاں تانے رکشوں میں بیٹھ کر میں، کوشلیا، کماری کرشنا سوبتی اور رکماری دیشنی سیٹھ ان پبلشر صاحب کے یہاں پہنچے۔ سائیکلوں پر ہندی کے دو نوجوان افسانہ نگار کملیشور اور دشینت بھی بھیگتے ہوئے ساتھ ہو لئے۔

دوسری منزل پر ان کا دفتر اور جائے رہائش ہے۔ بارجے میں ٹاٹ کے پردے لگا کر انہوں نے دفتر لگا رکھا ہے۔ پردوں کے باوجود سخت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ تین عورتوں کا ساتھ، میں کچھ دیر سے پہنچا تھا لیکن یہ جان کر تسلی ہوئی کہ ابھی بہت سے لوگ نہیں آئے۔ صرف دینا ہند کے مجیب آئے تھے اور یہ جان کر کہ بارش کے باعث لوگ دیر سے آئیں گے، چلے گئے۔

دفتر کی میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم اندر کے بڑے کمرے میں آئے جس میں کچھ جگہ تو چھت تک لگی کتابوں نے گھیر رکھی تھی باقی حصہ میں قالین بچھا تھا اور صوفے پڑے تھے جن کی پشت کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ دائیں طرف ایک میز پر ریڈیو پڑا تھا جسے بجانے کے لئے پبلشر صاحب بے چین نظر آتے تھے۔ درمیان میں ایک گول میز لگی تھی۔ کمرے کی ہر چیز زبانِ حال سے پکار پکار کر صاحبِ خانہ کی کور ذوقی کا اعلان کر رہی تھی۔ لیکن باہر کی سردی کے مقابلے میں کمرہ گرم تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے باوجود ایک بھی اور ادیب نہ پہنچا اور بارش اور بھی زور سے ہونے لگی تو میٹنگ شروع ہوئی۔ میرا نام صدارت کے لئے پیش کیا گیا۔ موقعہ کی سنگینی کے باوجود میں دل ہی دل میں ہنسا اس میٹنگ میں ہم کیا کہیں گے جو اپنے گھر میں نہ کہہ چکے تھے۔ کیونکہ صاحب خانہ اور ان کے صاحبزادے کو چھوڑ کر آٹھ میں سے سات تو میرے ہی ہاں سے آئے تھے۔

لیکن میٹنگ شروع ہوئی۔ ہنرؔ نے منٹو کے ایک مجموعہ 'یزید' کا آخری مضمون "جیب کفن" پڑھنا شروع کیا جو منٹو نے پاکستان میں اپنی ادبی کاوشوں اور وہاں کی ادبی زندگی کے بارے میں لکھا تھا:

> "ملک کے بٹوارے سے جو انقلاب برپا ہوا اس سے میں ایک عرصہ تک باغی رہا اور اب بھی ہوں۔
> لیکن بعد میں اس خوفناک حقیقت کو میں نے تسلیم کر لیا۔
> "میں نے اس خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں سے بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا، عرقِ انفعال کے، مشقت کے، جو اس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی۔
> ان آنسوؤں کے جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ انسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کیوں ختم نہیں کر سکے۔ ....'

ہنرؔ پڑھتے جا رہے تھے اور میری آنکھوں میں "سیاہ حاشیے" کے کئی موتی چمک اٹھے تھے۔ اپنے شوق کی سرگرمی میں کسی ترقی پسند نقاد نے ان کا مذاق یوں اڑایا تھا کہ سیاہ حاشیے میں منٹو نے لاشوں کی جیبوں سے سگریٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی چیزیں نکال کر جمع کی ہیں۔
میں محسوس کر سکتا ہوں کہ منٹو کو اس تنقید سے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ یقیناً اس نقادِ نے منٹو کی اس روحانی تکلیف کو نہیں سمجھا جس کے زیرِ اثر اس نے

وہ سب 'لطیفے' لکھے۔ اس میں شک نہیں کہ سیاہ حاشیے کے بیشتر موتی آبدار نہیں، ان میں آنسوؤں کی نمی نہیں، شک پرستی کی بے آبی ہے۔ لیکن یہ 'نیت'، 'جوتا'، 'کسرِ نفسی'، اور 'صفائی پسندی'، منٹو کی جھنجھلاہٹ، غصے، دردمندی اور انسان دوستی کے شاہد ہیں۔ یوں کرامات، مناسب کارروائی، 'رعایت' اس کے 'کا طنز بھی ناقابلِ فراموش ہے۔

"...... میں انسان ہوں، مجھے غصہ آیا؟" ہنس پڑھ رہے تھے۔" مجھے غصہ آیا میں نے اس عالم میں اس کیچڑ کے جواب میں ایسی کیچڑ تیار کی جو بہت دیر تک میرے نام نہاد نقادوں کے چہروں پر جمی رہتی۔ لیکن میں نے سوچا اور محسوس کیا کہ ایسا کرنا غلطی ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا انسان کی خصلت ہے، اس میں کوئی شک نہیں لیکن خاموش رہنا اس کی دانش مندی ہے، اس کا تحمل ہے، اس کی بردباری ہے......"

اور مجھے راشد کے مذاق کے جواب میں منٹو کا گالیاں دینا اور میری تنقید کے جواب میں اس کی تلملاہٹ یاد آئی۔ اس وقت وہ انسان تھا— اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والا۔ لیکن زندگی کے تجربوں نے غالباً اسے بردبار اور متحمل مزاج بنا دیا۔ منٹو کی یہ جھانکی میرے لئے نئی تھی۔ کاش ایسے میں اس سے میری ملاقات ہوتی ہوتی۔

اس مضمون کے بعد میں نے ریڈیو اور فلمی زندگی کے سلسلے میں اور منٹو کی کہانیوں کے بارے میں وہی سب کچھ کہا جو میں ہمیشہ کہا کرتا تھا اور جسے سب نے سُن رکھا تھا۔ حالانکہ کوشلیا وہ سب باتیں کئی بار سُن چکی تھی لیکن نہ جانے کیوں پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں پُرنم ہیں اور ناک کچھ زیادہ لمبی لمبی لگ رہی ہے۔ اگر پرمٹ کا جھگڑا نہ ہوتا اور ہم لاہور سے اتنی دُور نہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ کوشلیا اپنی خواہش کے مطابق اس موقع پر صفیہ بھابی کے پاس لاہور جا پہنچتی۔

وقت زیادہ ہونے لگا تھا۔ میں اٹھا کہ صاحبِ خانہ کھیمیں نکالتے ہوئے ایک ہاتھ میں چائے کا پیالہ اور دوسرے میں مٹھائی کی طشتری لئے ہوئے آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے صاحبزادے اور نوکر چائے کا پیالہ اور ناشتہ کی طشتری لئے ہوئے تھے۔

طشتری انہوں نے میرے سامنے رکھی۔

"مجھے خواہش نہیں۔"

اور وہ چائے کا پیالہ لئے کوشلیا کی طرف بڑھے۔

غصے سے کوشلیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ رونے کی وجہ سے لال آنکھیں غصہ سے تمتا رہی تھیں۔ "یہ کوئی موقع ہے چائے پینے کا۔" اس نے کہا اور باہر کی طرف بڑھی۔

"آپ پہلی بار آئے تو کیا منہ بھی میٹھا نہ کیجئے گا......" ہیں، ہیں کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

اور میں سوچنے لگا کہ منٹو ایسے موقع پر ہوتا تو ایسے پرخچے اڑاتا کہ طبیعت صاف ہو جاتی۔ لیکن میں نے ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے سمجھایا کہ پھر کبھی میٹنگ رکھئے گا تو ڈٹ کر کھائیں گے۔

اور ہم سب چلے آئے۔ پانی کہ جیسے اسی روز برسنا تھا۔ ایسا پڑ رہا تھا جیسے پھر کبھی موقع نہ ملے گا۔

اس میٹنگ کے تین چار دن بعد کی بات ہے۔ صبح میں اپنی میز پر آکر بیٹھا تو ۱۲ر جنوری کا 'آئینہ' میری میز پر پڑا تھا۔ صفحے پلٹتے ہوئے اچانک سیاہ حاشیوں سے گھرے کرشن چندر کے مضمون پر پڑ گئی—— سعادت حسن منٹو—— خالی بوتل، بھرا ہوا دل —— ایک ہی نظر میں سارا مضمون پڑھ گیا۔ بڑے احساس کے ساتھ کرشن نے مضمون لکھا ہے۔ اگر اس کا انجام افسانوی نہ ہوتا تو اور بھی اچھا لگتا۔ کرشن کی یہ عادت ہے

اور اس کے لئے اس کا بے پناہ تخیل ذمہ دار ہے کہ وہ حقیقت کے ساتھ افسانہ ملا دیتا ہے۔ لیکن اس خامی کے باوجود مضمون بہت پسند آیا۔ او دیبی نے جا کر کوشلیا سے کہا: "کرشن نے منٹو پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔" کوشلیا کرشنا سوبتی کے ساتھ باہر باغیچے میں بیٹھی دھوپ سے رہی تھی۔ اس نے فرمائش کی کہ میں مضمون اسے سُنا دوں۔

میں اندر سے 'آئینہ' اٹھا لایا اور چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر مضمون سُنانے لگا۔ اچانک جب آدھا مضمون ختم کر کے میں ان سطروں پر پہنچا ——— "منٹو ۴۲ سال کی عمر میں مر گیا۔ ابھی اس کے کھیلنے اور کُھلنے کے دن تھے۔ ابھی ابھی زندگی کے تلخ تجربوں نے 'سماج کی بیڑیوں' نے، مروجہ نظامِ زندگی کے تضاد نے اس کی بے تحاشا انفرادیت اور ناطرفداری ختم کر کے اس سے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' جیسی کہانی لکھوائی تھی۔ غم منٹو کی موت کا نہیں ——— موت ناگزیر ہے، غم ان ناتخلیق کردہ شہپاروں کا ہے جو صرف منٹو ہی لکھ سکتا تھا...... " تو میرے گلے میں کچھ عجیب سی بھراہٹ پیدا ہوئی اور پڑھنا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ دراصل یہ بھراہٹ اسی وقت پیدا ہو گئی تھی جہاں کرشن نے لکھا ہے: "آل انڈیا ریڈیو بھی کھلا ہے، 'میڈن ہوٹل کا بار' بھی، 'اُردو بازار' بھی۔ کیونکہ منٹو ایک بہت معمولی آدمی تھا۔ وہ ایک غریب ادیب تھا۔ وہ وزیر نہ تھا کہ کہیں کوئی جھنڈا اس کے لئے سرنگوں ہوتا...... وہ ایک ستائی ہوئی زبان کا غریب اور ستایا ہوا ادیب تھا...... " لیکن میں بڑی کوشش سے اس بھراہٹ کو روک کر مضمون سُناتے جا رہا تھا۔ مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے اچانک پڑھنا مشکل ہو گیا۔ میں پڑھ رہا تھا ——— "اُردو ادب میں اچھے اچھے افسانہ نگار پیدا ہوئے لیکن منٹو دوبارہ پیدا نہیں ہوگا اور کوئی اس کی جگہ لینے نہیں آئے گا۔ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور راجندر سنگھ بیدی بھی، عصمت چغتائی بھی، خواجہ احمد عباس بھی اور اوپندر ناتھ اشک بھی...... " اور آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے ——— کچھ اور سطریں اسی حالت میں میں نے پڑھیں۔ "ہم سب لوگ اس کے رقیب، اس کے چاہنے والے، اس سے جھگڑا کرنے والے، اسے پیار کرنے والے، اس سے نفرت کرنے والے، اس سے محبت کرنے والے، رفیق اور ہم سفر تھے۔ اور آج جب وہ ہم میں نہیں ہے، ہم میں سے ہر ایک نے موت کے تھپیڑ کو اپنے شانے پر محسوس کیا ہے...... " آنسوؤں نے بینائی کو ڈھک لیا۔ اخبار کو وہیں پھینک کر میں اندر اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر شام تک باہر نہیں آیا۔

آج میں اس دن کو یاد کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ میرے والد نے میرے دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند کی تھیں، میں نہ رویا تھا۔ والد سے خیر مجھے محبت نہ تھی، لیکن میری ماں جب مریں تو بھی آنسو میری آنکھوں میں نہ آئے۔ اور اب اس مضمون کو پڑھتے ہوئے، جسے میں خام سمجھتا تھا، بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ——— اور منٹو میرا رشتہ دار نہ تھا، بھائی نہ تھا، دوست نہ تھا ——— میرا دشمن تھا!

ہرے رنگ کی گڑیا

دیویندر ستیارتھی

میں نے اُسے پہلے پہل ایک سرکاری دفتر میں دیکھا۔ وہ سبز رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔ میں اپنے پُرانے دوست متّو سے ملنے کے لئے ٹھیک گیارہ بجے پہنچا۔ وہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ متّو نے اُس سے میرا تعارف کرایا۔ جب یہ پتہ چلا کہ وہ مصوّری میں دلچسپی رکھتی ہے اور اس فن میں اُسے بڑی شہرت حاصل ہے تو مجھے بڑی مسرّت ہوئی۔ میری درخواست پر اُس نے اپنے ہاؤس بوٹ کا پتہ لکھ دیا۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ ہماری یہ ملاقات محض رسمی ملاقات نہیں ہے۔ اُس نے زور دے کر کہا: "تھوڑا وقت نکال کر میرے ہاں آئیے۔ میری کچھ نئی تصویریں دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب رہی ہوں۔"

"ہم ضرور حاضر ہوں گے" متّو نے سرکاری فائل سے ایک لمحہ کے لئے چھٹّی لیتے ہوئے وعدہ کیا۔

"مجھے بھی لیتے چلئے" متّو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے کہا "نئی تصویریں دیکھنے کا مجھے بھی بیحد شوق ہے۔"

"میں انتظار کروں گی!" وہ مسکرائی۔ مسکراہٹ سے ہنسی، ہنسی سے قہقہہ، اور پھر اُس کی شخصیت شانتی اور سکون کے تاثر میں کھو گئی۔ متّو سرکاری فائل پر جھک گیا۔ جیسے وہ بھول کر بھی یہ نہ سوچ سکتا ہو کہ سرکاری فائل کا کام تھوڑی دیر کے بعد نمٹایا جا سکتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ بھی غنیمت ہوا کہ میں پہنچ گیا ورنہ صوفیا کو میرے دوست کی یہ بے رُخی بہت بُری طرح اکھرتی۔

وہاں بیٹھے بیٹھے صوفیا سے اتنی باتیں ہو گئیں کہ اب ہمارے بیچ میں کسی طرح کی دوری کا تصور مٹ گیا۔ اُس نے بتایا کہ سبز رنگ کا لباس اُسے بے حد پسند ہے۔ اور جس روز وہ سب سے زیادہ خوش ہوتی ہے یہ ناممکن ہے کہ وہ سبز رنگ کے لباس کے سوا کوئی دوسرا لباس پہنے۔ بچپن سے ہی اُسے چاکلیٹ پسند تھیں اور یہ ناممکن ہے کہ اُس کی جیب میں دو چار چاکلیٹ نہ رہیں۔ پھولوں کی موجودگی اُس کی روح میں لطافت پیدا کرتی ہے۔ موسیقی اور رقص کی فضاؤں میں سانس لینے کی بات وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دلیس دلیس کی سیر، ہر روز نئے چہرے دیکھنے کی جستجو، زندگی کے محور پر گھومتی ہوئی مصوّری ——— ایسی ایسی بہت سی باتیں جیسے صوفیا ایک ہی سانس میں

تھا گئی تھی۔

"کبھی کبھی نئی تصویر بناتے ہوئے مجھے آنے والے زمانہ کی جھنکار سنائی دینے لگتی ہے" وہ مسکرائی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ اگر یہ صحیح ہے تو صوفیا کی تصویروں کے رنگ زندگی کی کشمکش کے رنگ ہوں گے۔ اُن میں کسی طرح کا ڈیڈ لاک نہ ہوگا۔

"شاعری کی طرح مصوری بھی سچائی چاہتی ہے!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

منٹو کو جیسے ہماری گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ سرکاری فائل سے سر اٹھا کر اُس نے چپراسی کو گھنٹی دے کر بلایا اور چائے لانے کا حکم دیا۔ "تھوڑا نمکین ضرور لانا، تھوڑی مٹھائی بھی۔"

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں صوفیا سے کہا کہ چلئے یہی کیا کم ہے، آخر ہمارے دوست کو ہمارا تھوڑا بہت خیال تو ہے۔ صوفیا نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا "میں اس لئے حاضر ہوئی تھی کہ آپ کا محکمہ میری تصویروں کے فوٹو لینے کا انتظام کر دے۔"

"یہ کام میں ضرور کر دوں گا۔" منٹو نے وعدہ کیا۔

"تو کب تک اُمید رکھوں؟" صوفیا نے کسی قدر رنجاجت سے کہا "میں بہت جلد باہر جا رہی ہوں۔"

"آپ جائیں گی بھی تو اگلے ہفتے!" میں نے بڑھاوا دیا۔

"اس ہفتے تو میں جانے سے رہی۔"

"تو میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔"

"ضرور آئیے۔"

صوفیا کے چہرے سے معصومیت برستی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تپاک اور ہمدردی کی جھلک نمایاں تھی۔ کبھی کبھی اُس کی آنکھوں میں سوچ کا رنگ اُبھرتا جیسے تعارف کے بعد ہونٹوں پر مسکراہٹ تھرکنے لگتی ہے۔ سچ کہتا ہوں مجھے صوفیا کی یہ کمزوری بہت ناگوار گزری کہ پبلسٹی والوں سے اُسے خود یہ درخواست کرنی پڑے کہ وہ اُس کی تصویروں کے فوٹو لے کر مختلف اخباروں کو بھیجنے کا انتظام کریں۔ پبلسٹی والوں کو سو بار غرض ہوتی تو صوفیا کا ہاؤس بوٹ پوچھ کر اُس کے ہاں پہنچتے اور محکمہ کے ڈائرکٹر کی چٹھی میں صاف صاف لکھا ہوتا کہ اگر مادام صوفیا اپنی کچھ تصویروں کے فوٹو لینے کی اجازت دے سکے تو محکمہ کشمیر ٹورسٹ پبلسٹی بے حد ممنون ہوگا۔ صوفیا کو تھوڑا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ پبلسٹی والے بھاگے بھاگے اُس کے ہاں محکمہ پبلسٹی کی یہ درخواست لے کر آتے۔ خیر اب تو صوفیا خود ہی محکمہ پبلسٹی میں چلی آئی تھی۔ جیسے اپنی اس حرکت کے ذریعہ اُس نے سب کے سب مصوروں کی ہتک کر دی ہو۔

"حافظ نے لکھا ہے کہ اپنا وطن بہشت ہوتا ہے!" میں نے صوفیا کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت بڑی بات کہہ دی حافظ نے۔" وہ پہلے مسکرائی، پھر ہنستی رہی۔

اُس نے بتایا کہ کشمیر اُسے بے حد پسند ہے۔ اسی لئے نیپال کے سفر میں بھی اُسے کشمیر کی یاد کبھی بھولی نہ تھی۔ وہاں اُس نے گنتی کے دن بڑی مشکل سے کاٹے۔ ہر وقت وہ یہی سوچا کرتی کہ وہ دن کب آئے گا جب اُس کے پاؤں پھر سے کشمیر کی دھرتی کو چوم رہے ہوں گے۔ بڑے مؤثر انداز میں اُس نے بتایا کہ نیپال سے کشمیر پہنچ کر اُس نے خوشی سے جھوم کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ اور اب جبکہ وہ دو ہفتوں کے لئے بمبئی جا رہی تھی اُسے ڈر تھا کہ بمبئی جا کر بھی اُس کی وہی حالت نہ ہو جائے جو نیپال پہنچنے پر کھٹمنڈو میں ہوئی تھی ——

"کشمیر مجھے پسند ہے، کوئی اسے بہشت سمجھے چاہے نہ سمجھے" صوفیا نے جیسے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "میری بہترین

تصویریں کشمیر کی تصویریں ہیں۔ ایک بات اور بھی تو ہے۔ فنکار کو اپنا وطن تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اب چونکہ مجھے کشمیر ہی میں گھر کا احساس ہوتا ہے، یہی میرا وطن بن گیا ہے۔ کشمیر کی فضا میں سانس لئے بنا جیسے میرا فن مرجائے گا۔"

" تو یہ کہیئے کہ آپ مصوری کو جغرافیائی اور سیاسی دیواروں سے گھیر کر رکھنے کی قائل ہیں!" منٹو نے فائل سے سر اٹھا کر ہماری گفتگو میں شامل ہونے کا دم بھرا۔

" چائے کا کب تک انتظار کرنا ہوگا؟" میں نے صورتِ حال کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے کہا۔

" ابھی آیا چاہتی ہے چلئے۔"

" ابھی کا مطلب دس منٹ بھی ہو سکتا ہے!"

" شاید!"

صوفیا میٹھی مسکراتی رہی۔ جیسے اس کی مسکراہٹ کشمیر کی دہلیز پہ کھڑی عورت کی طرح نئے زمانے کا استقبال کر رہی ہو۔ بولی "بہشت کی حور ہے آزادی۔ کیا وہ گھر گھر جائے گی؟ اب تو کسی کسی گھر میں آزادی ناچ رہی ہے۔ لیکن یقین کیجئے کہ ایک دن کشمیر کی دکھ بھری کہانی کا انت ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ میری تصویروں میں اس نئی سماج کی روح دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے —— آخر یہ کیسے ممکن ہو سکا کہ مادام صوفیا نے اپنی تصویروں میں آج سے دس برس پہلے وہی بات اجاگر کی جس کی ضرورت ہمیں اتنے دنوں بعد محسوس ہوئی؟"

" اب آپ کی تصویروں کے فوٹو لینے کا انتظام زیادہ سے زیادہ دو روز لے گا۔" منٹو نے سرکاری فائل سے سر اٹھا کر تسلی دی۔

چائے آگئی۔ میں نے ٹرے کو صوفیا کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ "اب اپنا کام کیجئے۔"

صوفیا نے پہلا پیالہ منٹو کی طرف بڑھایا، دوسرا پیالہ میری طرف۔ تیسرا پیالہ اپنے ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ منٹو لاکھ بے رُخی دکھائے۔ آخر وہ اچھا آدمی ہے اور یہ اس کی ایمانداری ہے کہ دوستوں کی موجودگی میں بھی سرکاری فائلوں کو نبٹانے کی بات اسے اہم معلوم ہوتی ہے۔

چائے کے بعد صوفیا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھ سے پوچھا —— اس وقت کدھر چلنے کا ارادہ ہے؟ بولی: "اب میں چلوں گی۔"

" آرٹسٹ لوگ محکمہ پبلسٹی پہ اتنے مہربان ہیں" منٹو نے پیشانی کھجاتے ہوئے کہا "وہ خود ہی اِدھر چلے آتے ہیں یہ اُن کی عین عنایت ہے۔"

" مجھے ابھی رُکنا ہوگا۔" میں نے کہا "آپ چلئے۔"

صوفیا چلی گئی۔ منٹو بولا "کہیئے کیا ارشاد ہے، قبلہ؟"

" اپنی اب تک کی چھپی ہوئی ہر پبلیکیشن کا ایک ایک نسخہ دلا سکیں تو عنایت ہوگی۔"

" ابھی لیجئے۔ پہلے بتایا ہوتا تو اب تک یہ چیزیں آپ کے سامنے پہنچ چکی ہوتیں۔"

" خیر اب نکلوا دیجئے۔"

منٹو نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور کاغذ کے پرزے پر نوٹ لکھ کر کہا "اسے سومناتھ کے پاس لے جاؤ۔ بولو یہ کتابیں اور پمفلٹ دس منٹ کے اندر اندر مل جانے چاہئیں۔"

دفعتاً منٹو زور زور سے ہنسنے لگا۔ "مجھے صوفیا سے ایک ہی شکایت ہے ۔۔۔"

"ہم بھی سنیں"

"اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی ایک تصویر مجھے ضرور دے گی، اِسی اُمید پر ہم نے اُس کی بے حد پبلسٹی کی۔ مانا کہ وہ کشمیر کو اپنی تصویروں میں پیش کرتی ہے اور اس طرح کشمیر کی ٹورسٹ پبلسٹی میں ہماری مددگار ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ڈھول پیٹنے سے جب بھی اُس کی تصویریں اچھے داموں پر بکتی ہیں، سب کا سب روپیہ اُسی کی جیب میں جاتا ہے"

"وہ اپنی کوئی تصویر تحفہ کے طور پر ضرور پیش کرے گی"

"چلیے اور انتظار کر لیتے ہیں۔ آخر دُنیا اُمید پر قائم ہے"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ منٹو کے ہونٹوں پر کوئی گونگا خیال تھرک اُٹھا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بولا "بہت سے آرٹسٹ تو کاغذ پر رنگ تھوپ دیتے ہیں اور سوچتے ہیں تصویر تیار ہو گئی۔ لیکن صوفیا بہت محنت کرتی ہے۔ اپنی تصویروں میں اُس نے کشمیر کو کچھ اِس انداز میں پیش کیا ہے کہ رنگ ہم آہنگ ترنم کے ساتھ کشمیر کی خوبصورتی کا دم بھرتے چلے جاتے ہیں۔ اس پبلسٹی کے لئے ہم صوفیا کے بے حد ممنون ہیں۔ لیکن ۔۔۔"

"لیکن صوفیا کو اپنا وعدہ یاد رکھنا چاہیئے" میں نے ہنس کر بڑھاوا دیا۔ "اور اگر صوفیا صحیح قسم کی آرٹسٹ ہے تو وہ اپنی کوئی تصویر اگلی بار آپ کے لئے ضرور لیتی آئے گی"

منٹو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے کہا ۔۔۔ تمہارے منہ میں گھی شکر۔ تمہاری زبان مبارک! اُس وقت اُس کا ذہن ویران نہ تھا۔ سنبھل کر اُس نے کہا "ہم تو زندگی کے علمبردار ہیں۔ اگر سچائی کا دم بھرنا ہے تو ہم سچ مچ گنہگار ہیں۔ صوفیا جانتی ہے کہ مجھ پر اس کا رعب ہے۔ میں ہمیشہ اُس کے لئے، اُس کے فن کے لئے ڈھنڈورا پیٹتا رہا ہوں۔ آپ یہ مت سمجھیے کہ میں ایک تصویر کی شکل میں اپنی خدمات کا صلہ چاہتا ہوں۔ میں چاہوں تو اُس کی ایک تصویر خرید سکتا ہوں۔ لیکن ۔۔۔"

"لیکن جو مزہ تحفہ میں ملی ہوئی تصویر کا ہوتا ہے" میں نے ہنس کر کہا "وہ مزہ خریدی ہوئی تصویر کا نہیں ہوتا!"

"آپ نے تو میری زبان سے یہ الفاظ چھین لئے"

"داد دیجیے"

ہماری آنکھیں کچھ لمحوں کے لئے ایک دوسرے کو داد دیتی رہیں۔ اس بیچ میں میرے لئے ضروری لٹریچر آ گیا تھا۔ اس کے لئے میں نے منٹو صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ جذبۂ خودداری کو میں نے سنبھال کر تھام رکھا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ابھی ہفتہ دس دن اور ہوں کشمیر میں اور دِلّی جانے سے پیشتر ایک بار آپ کا نیاز ضرور حاصل کروں گا۔

کئی روز دوسری ہی کشمکش میں گزر گئے۔ صوفیا کے ہاؤس بوٹ میں جانے کے لئے وقت نہ نکالا جا سکا۔ کئی بار مجھے اپنے ذہن میں گُدگُدی سی محسوس ہونے لگتی۔ صوفیا کی یاد میں زندگی کا ایک نیا موڑ نظر آنے لگتا۔ صوفیا نے پہلی ہی ملاقات میں دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ اُس نے کسی اور کا افسانہ نہیں سُنایا تھا، اپنی تصویروں کا افسانہ سُنایا تھا۔ یہ تصویریں مجھے بلا رہی تھیں جیسے پوچھ رہی ہوں ۔۔۔ تم کب آ رہے ہو؟

ایک روز میرے ایک ساتھی نے، جو نہ صرف بیحد ہنس مکھ واقع ہُوا تھا بلکہ جسے ڈوگری لوک گیتوں کی کچھ پُرانی دُھنیں بڑی باریکی سے پیش کرنے کی اہلیت حاصل تھی، نہ جانے کیا سوچ کر پوچھا "آپ صوفیا کو جانتے ہیں؟"

"کیوں کیا بات ہے؟" میں نے کچھ اس سادگی سے پوچھا۔ جیسے صوفیا کے بارے میں مجھے کوئی علم ہی نہ ہو۔

"صوفیا کی تصویریں خوب بک رہی ہیں آج کل" میرے ساتھی نے شکایت کی "یہاں کے آرٹسٹ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ بڑے بڑے فریم میکروں کے ہاں صوفیا نے اپنی تصویریں رکھ چھوڑی ہیں۔ اُس کی دیکھا دیکھی یہاں کے آرٹسٹ بھی ان فریم میکروں کے ہاں اپنی تصویریں بکنے کے لئے رکھ جاتے ہیں۔ دکاندار کو تو کمیشن چاہیئے۔ اُس کی بلا سے صوفیا کی تصویر بکے چاہے یہاں کے کسی آرٹسٹ کی۔ لیکن ہوتا یہی ہے کہ صوفیا کی تصویریں بکتی ہیں۔ اور یہاں کے آرٹسٹ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر صوفیا کا نام لے لے کر اُسے سو سو صلواتیں سناتے ہیں۔ کہتے ہیں اُسے فن کی بہت زیادہ تمیز نہیں ہے۔ اُس کی تصویریں غلیظ ہیں۔ کوئی کہتا ہے اُسے انگریز اور امریکن ٹورسٹوں کو ٹھگنے کا ڈھنگ آگیا ہے۔ کلب میں وہ اُن سے ملتی ہے اور ہونٹوں پر جھوٹی سچی مسکراہٹیں بکھیر کر اُن کا دل موہ لیتی ہے اور پھر اپنی تصویروں کا پراپیگنڈہ کرتی ہے، فریم میکروں کے پتے بتا دیتی ہے جن کے ہاں اُس کی تصویریں نمائش اور بکری کے لئے پڑی رہتی ہیں۔"

"اپنی تصویروں کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا تو بہت بڑی زیادتی نہیں ہے۔" میں نے صوفیا کی طرفداری کی ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ "میں نے سنا ہے کہ صوفیا کی تصویریں بہت گمبھیر ہوتی ہیں۔ وہ محض کاغذ پر رنگ تھوپنے تک ہی اکتفا نہیں کرتی۔ اب تم سے چھپانے سے کیا حاصل؟ ابھی اگلے ہی روز صوفیا سے میری ملاقات ہوگئی۔"

"کہاں؟"

"مٹو صاحب کے دفتر میں۔"

"کون مٹو صاحب؟"

"وہی پبلسٹی والے مٹو صاحب۔"

"تو یہ کہیئے کہ صوفیا کے ہاں چلنے کا ارادہ ہے۔"

"آپ بھی چلئے۔"

ہم بازار سے بنڈ کی طرف ہولئے۔ اور دس منٹ تک پیدل چلنے کے بعد اُس ہاؤس بوٹ کے سامنے جا پہنچے جہاں صوفیا رہتی تھی۔ لکھا تھا — کتوں سے خبردار رہیئے۔ میرا ساتھی گھبرایا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ یہاں کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔ "میں نے صوفیا کو نزدیک سے نہیں دیکھا" وہ کہہ رہا تھا "صرف اُس کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں سُنی ہیں۔ شاید صوفیا اتنی خراب نہ ہو جتنی کہ بتایا جاتا ہے۔"

میں نے سنبھل کر کہا۔ "صوفیا عورت ہے۔ شاید یہی اُس کا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

جذبات کی رَو میں بہہ کر میرے ساتھی نے کہا۔ "اگر لوگ صوفیا کو صرف اِسی لئے بُرا بھلا کہتے ہیں تو میں یقیناً اُن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

ہاؤس بوٹ کے اندر ہم نے اپنا کارڈ بھیجدیا تھا۔ ہم اس انتظار میں کھڑے تھے کہ ہاؤس بوٹ سے نکل کر ہاؤس بوٹ کے مالک کا نوکر ہمیں بتائے کہ ہم اندر جا سکتے ہیں۔ آخر وہ لمحہ بھی آگیا جب ہاؤس بوٹ کے نوکر نے اطلاع دی کہ ہمیں اندر بلایا جا رہا ہے۔ جس وقت ہم ہاؤس بوٹ میں پہنچے صوفیا نے آگے بڑھ کر ہمارا سواگت کیا۔ وہ بہت مختصر سے لباس میں تھی۔ بہت حد تک یہ وہی لباس تھا جو تیرتے وقت آجکل کی جدید لڑکیاں پہنتی ہیں۔ رنگ وہی سبز۔ "اس لباس کا رنگ تو نیلا ہونا چاہیئے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

اُس کی آنکھوں میں کوئی گستاخی نہ تھی۔ وہ جھٹ اندر چلی گئی۔ کہتی گئی کہ اُسے ایک کام یاد آ گیا۔ لباس کا ڈھنگ وہی تھا لیکن اب کے وہ واپس آئی تو سبز رنگ کی بجائے نیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس وقت وہ کوئی کبل پری ہی تو معلوم ہو رہی تھی۔ بولی۔ "ادھر تین دن سے تو ہاؤس بوٹ کی مرمت ہو رہی ہے۔ بڑی مصیبت ہے۔ ہر وقت ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں۔"

"اب ایک نہ ایک مصیبت تو لگی ہی رہتی ہے مادام۔" میں نے ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک سے اُبھرتے ہوئے کہا۔

صوفیا نے سامنے کی میز پر کہنیاں ٹیک کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے کہا —— آکاش بدل جاتا ہے۔ دھرتی بدل جاتی ہے۔ لیکن انسان کا چہرہ وہی رہتا ہے۔ میں نے اُس کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے پوچھا یہ تمہاری سب سے پیاری تصویر کونسی ہے؟"

"اب یہ فیصلہ میرے بس کا روگ نہیں" اُس نے سوچتے سوچتے اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے یہ سوال کاروباری انداز میں نہیں کیا۔"

"یہ میں خوب سمجھتی ہوں۔" یہ کہہ کر صوفیا خاموش ہو گئی۔ پھر مسکراہٹ اُبھری، پھر ہنسی کا فوارہ سا اُچھلا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اُس کی آنکھوں کی نیگوں جھیلوں میں ایک سوال اُبھرا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔ "آپ ایسے وقت آئے جبکہ ہاؤس بوٹ میں مرمت ہو رہی ہے۔ پھر بھی آپ میری کچھ تصویریں تو ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے پیاری تصویر کونسی ہے یہ فیصلہ خود کیجئے۔"

میرا ساتھی گمبھیر آنکھوں سے صوفیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ وہی صوفیا ہے جس کے بارے میں لوگ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر اُلٹی سیدھی باتیں کرتے تھے۔

اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "انھیں ڈوگری لوک گیتوں کی بہت سی پرانی دُھنیں یاد ہیں۔ آج ان کے ایک دوست کے ہاں گئے تھے جس سے بہت سے لداخی گیت حاصل کئے۔ معلوم نہیں آپ نے کبھی محسوس کیا یا نہیں کہ کشمیری لوک گیتوں کی دُھنیں بے حد یاس انگیز ہوتی ہیں۔ جیسے صدیوں کی غلامی کے نیچے دبی ہوئی جنتا گا نہ سکتی ہو محض رو سکتی ہو ——"

"لیکن اب تو صورتِ حال کچھ بدل چکی ہے۔" اُس نے میز پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ جادو کے اثر سے کشمیری لوک گیتوں کی دُھنیں ہی بدل جائیں، جیسے جیسے حالات بہتر ہو گئے ان میں وہی چمک آتی جائے گی جو اکثر پہاڑی گیتوں کا خاصہ ہے۔"

"یہ تو سچ ہے۔ لیکن آج نہیں تو کل کشمیری گیتوں کی دُھنیں بدل کر رہیں گی"

میری درخواست پر میرے ساتھی نے ایک گیت گا کر سنایا جس میں ایک عورت نے شکایت کی تھی کہ اُسے اتنی بھی تو آزادی نہیں کہ وہ اپنے محبوب کے پاس جا سکے۔

صوفیا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ یوں محسوس ہوا کہ یہ نیلے لباس والی جدید جل پری ہاؤس بوٹ کی کسی کھڑکی سے نیچے جہلم میں کود پڑے گی اور تیرتی تیرتی اپنے محبوب کے پاس جا پہنچے گی۔ لیکن میں نے موقع پا کر فرمائش کی کہ ہم اُس کی تصویریں دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہے ہیں۔

پہلے اُس نے وہ بکس کھولا جس میں نیپال کی تصویریں رکھی تھیں۔ نیپال کے مندروں، بازاروں اور اُن بازاروں میں چلتے پھرتے لوگوں کو اُس نے نہایت ایمانداری سے پیش کیا تھا۔ ایک تصویر میں ایک نیپالی کنبہ دکھایا گیا تھا جس میں ایک بڑھیا کے

چہرے پر کم وبیش وہی جذبات پیش کئے گئے تھے جو گورکی کا ناول "ماں" پڑھتے وقت ماں کے چہرے پر اُبھرتے نظر آتے تھے جب روس کی یہ عورت انقلاب کی روح بن کر رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ نیپال کے پورے سٹ میں یہی تصویر سب سے پیاری تصویر تھی۔ میں نے اِسے اُٹھا کر ایک کونے میں تپائی پر رکھ دیا تاکہ ہم کچھ دیر کے لئے اِسے دیکھ سکیں۔

"کسی تصویر سے پورا تعارف کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ تھوڑی دیر ہماری آنکھوں کے سامنے رہے" میں نے صوفیا کے فن کی داد دیتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میری کرسی کے بازو پہ آ بیٹھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تصویر اسی جدید قسم کی جل پری نے بنائی ہے۔ جیسا کہ صوفیا نے بتایا، اُس کی ماں ایک یہودی عورت تھی اور اُس کا باپ تھا ایک فرانسیسی۔ ان دونوں نسلوں کے امتزاج سے صوفیا کا جنم ہوا تھا۔ اُس کا باپ بھی اچھا خاصا مصوّر تھا۔ کھٹمنڈو میں صوفیا پیدا ہوئی تھی کوئی تیس برس پیشتر جبکہ اُس کا باپ نیپال کے وزیر اعظم کی پورٹریٹ بنانے کے لئے انڈونیشیا سے نیپال پہنچا تھا۔ صوفیا نے بتایا کہ جب وہ چھوٹی سی تھی تو ایک انڈونیشیائی آیا اُسے انڈونیشیائی لوک گیت گا کر سُنایا کرتی تھی۔ جب وہ سات برس کی تھی اُس کے باپ کو دوبارہ نیپال دربار کی طرف سے دعوت ملی۔ اُس کے باپ کو نیپال دربار کے لئے بہت سی پورٹریٹ بنانے کا کنٹریکٹ ملا تھا۔ ان دنوں صوفیا کو نیپالی لوک گیت سننے کا موقع ملا۔ اُس نے بتایا کہ اب کے جب وہ نیپال گئی تو اُسے وہ دن یاد آ گئے جب نیپال پر راناؤں کے دربار کا رعب غالب تھا۔ اور اب جبکہ نیپال کی جنتا نے جمہوریت کی نئی راہوں پہ چلنا شروع کر دیا تھا، نیپال کا چہرہ جلدی جلدی بدل رہا تھا۔

میرے ساتھی نے اس شرط پہ ایک ڈوگری لوک گیت پیش کرنا منظور کیا کہ صوفیا ایک انڈونیشیائی لوری سُنائے اور ایک نیپالی لوک گیت جس میں نیپال کی روح بول رہی ہو۔

"ہاں ہاں منظور ہے" صوفیا نے وعدہ کیا۔

میرے ساتھی نے وہ گیت سُنایا جس میں کوئی بھگت اپنے بھگوان سے شکایت کرتا ہے ـــــ

ہریا! ہَیں کَہیاں کری جیاں تیرے نامے؟
گھراں جورو بنائی لیندی کامے!
ڈنگرے گی چھڈی آیاں دھارا
مُنّو آں کھڈایاں
نہوئی دھوئی لگیاں رسوئی
اج آؤناں مُنّوئے دے مامے!
ہَریا! ہیں کِہیاں کراں جیاں تیرے نامے!

ہے ہری! میں کس طرح تیرا نام جپوں؟ گھر میں جورو مجھے غلام بنائے رکھتی ہے۔ ڈھور ڈنگروں کو سامنے والی پہاڑی چھوڑ آ (اب جورو کہتی ہے) مُنّے کو کھلاؤ۔ نہا دھو کر رسوئی کا کام شروع کر دو۔ آج مُنّے کے ماموں نے ہمارے ہاں آنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ہے ہری! میں تمہارا نام کیسے جپوں؟ . . . . . . گیت کا مفہوم بتایا گیا تو صوفیا دیر تک کھلکھلا کر ہنستی رہی۔ میں نے سوچا کہ نیلے لباس والی یہ جدید قسم کی جل پری جب بیاہ کرائے گی تو شاید اپنے شوہر کو اتنا غلام نہیں بنائے گی جتنا کہ ڈوگری گیت میں ایک شوہر کی تصویر پیش

کرتے وقت کسی لوک کو یہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔

انڈونیشیائی لوری کو صوفیا نے کچھ اس طرح پیش کیا جیسے سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر کہہ رہی ہوں —— اب سو جاؤ! کل صبح زندگی کی جدوجہد شروع ہو گی۔ اور نیپالی لوک گیت میں ایک لڑکی نے اپنے باپ سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ اپنے سات جوڑے کبوتروں میں سے ایک جوڑا کبوتر اپنی بیٹی کو جہیز میں دے دے۔ باپ انکار کر دیتا ہے۔ کہتا ہے گائے کا جہیز لے لو، ہاتھی کا جہیز لے لو، لیکن کبوتر کا جوڑا جہیز میں مت مانگو۔ لڑکی نہیں مانتی۔ آخر ہار کر باپ کہتا ہے —— چلو تمہاری مرضی ہی سہی۔ تم ایک جوڑا کبوتر لے جاؤ۔

انڈونیشیائی، نیپالی اور ڈوگری لوک گیتوں کی دھنیں بہت کچھ گلے ملتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے موقع پا کر ایک لداخی گیت گا کر سنایا جس میں اپنے جنم استھان سے بہت دور پڑا ہوا کوئی نوجوان کہتا ہے —— پہاڑ پر درے کے سرے پہ پہنچتے ہی میں نے اپنی جنم بھومی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور گاؤں کو اپنے تخیل میں ہو بہو سانس لیتے دیکھ لیا۔ دیکھنے ہی سے تو جی نہیں بھرتا۔ کیونکہ وہاں پہنچنا تو کٹھن ہے! . . . . . صوفیا کا انگ انگ تھرک رہا تھا۔ جیسے آج اُس نے کسی جدید عمر خیام کے لئے ساقی کے فرائض سرانجام دینے کے لئے تیاری کرنی ہو۔ معاً وہ میری کرسی کے بازو سے اُچھل کر اندر چلی گئی۔ اور ایک تصویر اُٹھا لائی جس میں ایک نیپالی لڑکی نے کبوتر کے جوڑے کو سینے سے بھینچ رکھا تھا۔ بولی "تم مانو نہ مانو، میں کہتی ہوں اُس لداخی گاؤں میں بھی کوئی ایسی لڑکی ضرور ہو گی جس نے کبوتر کے جوڑے کو سینے سے بھینچ رکھا ہو گا۔ کیوں میں کچھ جھوٹ کہتی ہوں!

"اور سب جھوٹ ہو سکتا ہے" "لیکن یہ بات جھوٹ نہیں ہو سکتی" میں نے کہا۔

"صوفیا جی! یہ کبوتروں والی تصویر تو بین الاقوامی فن کی بیش قیمت تصویر ہے" میرے ساتھی نے لجاجت سے کہا۔

صوفیا کے اُبھرے ہوئے گالوں کی ہڈیاں اُبھر کر میرے ساتھی کی داد کا جواب دے رہی تھیں۔

پھر اُس نے کشمیری تصویروں والا بکس کھولا اور ایک ایک کر کے بہت سی تصویریں دکھائیں۔ میرے ساتھی نے اُس تصویر پہ ہاتھ رکھ دیا جس میں ایک کشمیری دوشیزہ نے اپنے ہاتھ میں بادام کے پھولوں کی ٹہنی تھام رکھی تھی "یہ بہترین تصویر ہے!" اُس نے اپنی جگہ سے اُچھل کر کہا۔

"یقیناً!" میں نے تصدیق کی "بادام کے پھول بہار کے پہلے پھول ہیں"

"آپ غلطی کر رہے ہیں،" میرے ساتھی نے سمجھایا "بادام کے پھول کھلنے سے پہلے تو کشمیر میں نرگس اپنی آنکھیں کھولتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی تصویر میں صوفیا جی نرگس کے پھولوں سے بھی بہت بڑے سمبل کا کام لیں گی!"

صوفیا خوش تھی۔ شاید اس سے پہلے کسی نے اُس کے ہاں آ کر اُس کی تصویروں کو اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ پھر سے میری کرسی کے بازو پر آ کر بیٹھتے ہوئے صوفیا نے کہا "میں سوچ رہی ہوں ——"

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"یہی کہ آپ کی ایک پورٹریٹ بناؤں!"

"لیکن میری پورٹریٹ سے کیا ہو گا؟"

صوفیا نے اُٹھ کر پورٹریٹ بنانے کے لئے جگہ ٹھیک کی، ایک طرف سے کھڑکی کا پردہ کھول دیا۔ باقی سب پردے بند کر دیئے۔ میرا ساتھی اُس ڈوگری لوک گیت کے سُر گنگنا رہا تھا جس میں کوئی دُلہن کہتی ہے ——

"وھاریں دھوراں پئیاں!
میں کلّی آ گھر کنیّاں رہنا!"

پہاڑوں پر دھول چھا گئی۔ میں اکیلی گھر کیسے رہوں؟

"وھاریں دا سنجوگ دھوریں کنیں دکھی کری
مناں چل تی آں سوہے دیاں بھاراں!
میں کلّی آ گھر کنیّاں رہنا؟"

پہاڑوں کو دھول کے ساتھ سنجوگ دیکھ کر، ہے میرے من! گرمی کی بہار نے وداع لی۔

"پائی کے پیچیباں پھراں انگن پساری آ
سجنے دا راہ دِکھاں کھل میں دوا آری آ
سارا سارا دن آ ونڈی کھی لے بچ اکھی آں بچھائی کری
مناں اساں ہاری ہٹی جاناں!
میں کلّی آ گھر کنیّاں رہنا!"

پازیب پہن کر کبھی میں آنگن میں جاتی ہوں، کبھی دالان میں۔ کبھی اپنی کھڑکی پر کھڑی ہو کر اپنے ساجن کا راہ دیکھتی ہوں۔ سارا سارا دن اُن کے انتظار میں راہ پر آنکھیں بچھائے ہوئے، ہے من! ہم تھک جائیں گے، ہار جائیں گے۔ میں اکیلی گھر میں کیسے رہوں؟

.. میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ اُس وقت کا گیت ہے جب گرمی کے بعد نیا موسم شروع ہوتا ہے۔ اور برہن ساجن کی جدائی سہہ نہیں سکتی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ سبز رنگ کا مختصر سا لباس پہنے صوفیا پورٹریٹ بنا رہی تھی۔ ایک آدھی بار میں نے آنکھ بچا کر صوفیا کی طرف دیکھ لیا۔ مجھے اس کے باپ کا دھیان آیا جو نیپال کے وزیرِ اعظم کا پورٹریٹ بنانے کے لئے کھٹمنڈو پہنچا تھا آج سے تیس برس پیشتر جب کھٹمنڈو میں صوفیا کا جنم ہوا تھا ___ لیکن میں ___ میں تو صرف لوک گیت جمع کرنے والا ایک ادیب تھا۔

میرا ساتھی برابر لوک گیت کی دھن گنگنائے جا رہا تھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو ___ کیا کبھی تمہارے دل میں بھی ساجن کے لئے اسی طرح ہوک اُٹھتی ہے؟

معاً باہر سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ہاؤس بوٹ کا نوکر دوڑ کر باہر گیا۔ اور کچھ لمحوں کے بعد مٹو صاحب داخل ہوئے۔ آتے ہی وہ سیدھے صوفیا کی بغل میں چلے گئے۔ صوفیا نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مٹو صاحب کا استقبال کیا۔ اور پھر وہ میری پورٹریٹ بنانے میں جُٹ گئی۔

تھوڑی دیر مٹو صاحب چُپ بیٹھے رہے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے "تو یہ شاہد ہیں؟ اب سمجھا کہ آپ اُس روز میرے کمرے میں صوفیا کی اتنی تعریف کیوں کر رہے تھے"! صوفیا ذرا سا مسکرائی۔ اور پھر اُس کا ہاتھ تیزی سے رنگ اُٹھا اُٹھا کر کینوس پر چلنے لگا۔ اب میری نگاہ تو کینوس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ چور آنکھوں سے صوفیا کی طرف دیکھنے کی جرأت بھی اب مجھ میں کہاں تھی۔

مٹو سمجھ گیا کہ صوفیا فرصت میں نہیں ہے۔

"اچھا تو اجازت!" مٹو بولا "کبھی پھر سہی۔"

صوفیا خاموش رہی۔

منٹو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھ کر صوفیا کی طرف سے بھی معذرت کر دی۔ دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے منٹو نے کہا "تو پھر کب ملاقات ہو گی؟"

صوفیا خاموش رہی۔

جب منٹو چلا گیا تو صوفیا خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

میں نے حوصلہ کر کے پوچھ لیا۔

"کیوں منٹو صاحب سے ان دنوں کچھ ناراضی ہے؟"

"وہ مجھے آج تک نہیں سمجھ سکا۔ وہ مجھے باہر سے دیکھتا ہے۔ محض باہر سے۔ باہر سے دیکھنے سے تو میں زیادہ سے زیادہ ہرے رنگ کی گڑیا ہی نظر آ سکتی ہوں۔ لیکن میں پوچھتی ہوں کیا میں بس یہی کچھ ہوں جو باہر سے نظر آتی ہوں۔ مجھے تو اُس انسان کی تلاش ہے جو مجھے اندر سے پہچانے۔ ایسا انسان صرف میرے کینوس پر اُبھرتا ہے۔" اور وہ تیز تیز جنبش کے ساتھ رنگ اُٹھا اُٹھا کر کینوس پر جماتی رہی۔ میرے دوست نے ایک دو بار میری آنکھوں میں جھانک کر بتانا چاہا کہ خوب مزے میں ہو میرے یار! لیکن میرا ہی دل جانتا تھا کہ مجھ پر کیسی گذر رہی تھی۔

واقعی ہرے رنگ کی گڑیا نے مجھے قید کر لیا تھا۔

مدظلہٗ

شوکت تھانوی

ذکر ہے مولانا عبدالماجد دریا بادی کا اور شروع ہو رہا ہے جناب نیاز فتحپوری کے نام سے۔ لاکھ چاہا کہ اس اجتماعِ ضدین سے کترا کر نکل جاؤں مگر مقطع میں سخن گسترانہ بات یہ آ پڑی ہے اور مقصود اس سے نہ کہ محبت مولانا عبدالماجد سے ہے نہ نیاز صاحب سے کہ میرے لئے مولانا عبدالماجد دریا بادی شروع ہی ہوتے ہیں نیاز صاحب سے۔ ممکن ہے اس ابتدا کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی یہ فرمائیں کہ :-

"بسم اللہ ہی غلط ہے"

مگر میں کیا کروں کہ واقعہ یہی ہے۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب نیاز صاحب کے رسالہ نگار کی بیباک تحریروں سے تنگ آ کر مولانا عبدالماجد جہاد فی سبیل اللہ پر تل گئے تھے اور بڑے زور کا رن پڑا تھا بمقام لکھنؤ۔ مولانا عبدالماجد کا مورچہ تھا فرنگی محل میں اور نیاز صاحب کا گڑھ تھا خود ان کا گھر یا دفتر جو اس زمانے میں امین الدولہ پارک میں تھا۔ مولانا عبدالماجد کی فوجِ ظفر موج میں بڑے بڑے جنگ آزمودہ سالار تھے۔ خود فرنگی محل کی کمک ہی کیا کم تھی کہ اس پر طرّہ علامہ سید سلیمان ندوی بھی آپ ہی کے ساتھ تھے۔ کسی دستے کی کمان مولوی عبدالرؤف عباسی کے ہاتھ میں تھی۔ کسی ٹکڑی کی قیادت مولوی صبغۃ اللہ شہید فرما رہے تھے۔ ادھر نیاز صاحب کی فوج میں زیادہ تعداد رنگروٹوں کی تھی اور رنگروٹوں سے زیادہ اناڑی رضا کار۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اس فوج کے سب سے بڑے جرنیل فیلڈ مارشل حافظ نظر الملک علوی تھے جو اس زمانے میں عتیق پر اور تخلص فرماتے تھے ایک کرنیل تھے امین سلونوی جو اپنی مونچھوں پر کرنیلی کے اسٹار لگائے پھرتے تھے اور دوسرے کرنیل تھے نسیم انہونوی جو اس زمانے میں ایک زنانہ رسالہ نکال کر یہ ثابت کرتے پھرتے تھے کہ جی ہاں ایک مرد بھی ایک زنانہ رسالے کا ایڈیٹر ہو سکتا ہے رہ گیا یہ خاکسار تو اس کا شمار بھی سولجر سواروں میں تھا اور گویا نیاز صاحب کی فوج کا یہ بھی ایک نیازمند تھا۔

جنگ زوروں پر تھی۔ دونوں کیمپس میں ہر روز جلسے ہوتے نیا نقشہ جنگ بنتا کہ غنیم پر کس رُخ سے حملہ کیا جائے۔ کیونکر شب خون مارا جائے۔ کس حملے کا کیا جوابی حملہ ہو۔ یہاں تک کہ ایک دن نیاز صاحب کے کیمپ میں ایلچی خبر لایا کہ آپ کے سوشل بائیکاٹ کے منصوبے بندھ رہے ہیں اور زیر غور یہ مسئلہ بھی ہے کہ آپ پر دھوبی بہشتی۔ بھنگی سب بند کر دیئے جائیں۔ پھر جاسوس خبر لایا کہ آپ کے خلاف امین الدولہ پارک میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام ہونے والا ہے جس میں آپ کے خلاف بیزاری کی تجویز منظور ہوگی اور نگار کی الحادی تحریروں سے عوام کو آگاہ کیا جائے گا۔ اُس وقت اس نیاز مندنے رائے دی کہ ہم میں سے کچھ نیاز مندوں کو فرنگی محل کے اُن مشاورتی جلسوں میں جانا چاہیئے جن میں یہ منصوبے تیار ہوتے ہیں تاکہ ہم وہاں یہ بتا سکیں کہ اگر رواداری اور صلح جوئی سے کام لیا جائے تو ہم خود نیاز صاحب کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ نگار کو خالص ادبی رسالہ بنا کر مذہبیات کی حدوں میں قدم رنجہ نہ فرمائیں۔

یہ رائے سُن کر فیلڈ مارشل نظر الملک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجے :-

"یہ ناممکن ہے ہم غنیم سے امن کی بھیک نہیں مانگ سکتے"۔

کرنیل امین سلونوی نے مونچھوں سے پھنکارتے ہوئے کہا "یہ شرمناک اعترافِ شکست ہے"۔

میجر نسیم امہونوی نے بل کھا کر کہا "یہ تو پناہ کے لئے گڑگڑانا ہوا"۔

مگر آخر کار طے یہی پایا کہ معقولیت کا تقاضہ یہی ہے کہ اگر باعزت طور پر صلح ہوتی نظر آئے تو صلح صفائی کی کوشش ضرور کی جائے۔

میں اپنے چند رفقاء کے ساتھ جس وقت فرنگی محل کے اس مشاورتی جلسے میں پہنچا میں نے دیکھا کہ وہاں علمائے فرنگی محل کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادی بھی موجود تھے اور علامہ سید سلیمان ندوی بھی۔ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو دیکھ کر فرنگی محل کے ایک بزرگ نے جن کے لئے میں اجنبی نہ تھا نہایت تلخی کے ساتھ صدرِ جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "جناب صدر ہم کو اس وقت جلسے کی کارروائی ملتوی کر دینا چاہیئے جب تک شوکت صاحب اپنی پوزیشن واضح نہ کر دیں کہ وہ کس حیثیت سے اس جلسے میں تشریف لائے ہیں"۔

یہ سُن کر قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا مولانا عبدالماجد دریابادی نے گھمو سے کچھ کہا جسے میں سُن نہ سکا مولانا عبدالماجد تحریر اور تقریر دونوں میں نہایت باریکی سے کام لیتے ہیں۔ تحریر پڑھیئے تو اپنے دبدبوں کا زیاں اور بات سنیئے تو کانوں کی شامت۔ بہر حال میں نے اس وقت ان کی ہنستی ہوئی آنکھیں دیکھیں اور چہرے پر بھی وہ مشفقانہ نرمی تھی جس سے یہ اندازہ ہوا کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ کم سے کم ہمارے خلاف نہیں جاتا چنانچہ ان کے اس زیر لب ارشاد کے بعد ایک اور بزرگ نے فرمایا "بیشک مولانا درست فرماتے ہیں کہ ہم کو شوکت صاحب پر شک نہ کرنا چاہیئے دوسرے ہم کوئی بات ایسی بھی نہیں کر رہے ہیں جو کسی سے ڈھکی چھپی ہو"۔

یہ تھی مولانا عبدالماجد دریابادی سے پہلی ملاقات۔ پھر نیاز صاحب کے خلاف امین الدولہ پارک میں جلسۂ عام بھی ہوا۔ مولوی عبدالرؤف عباسی نے اسی جلسے میں للکار کر کہا کہ "قوم کے مجرم کو قوم کے سامنے آکر خود اپنی صفائی پیش کرنا چاہیئے۔ حافظ نظرالملک نے بھی نیاز مندی کا حق ادا کیا۔ یہ ہنگامہ ختم ہوا نگار کی روش عارضی طور پر بدل گئی۔ بہر حال مجھ کو اس معرکے سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں ذکر ہے صرف مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ معرکۂ نیاز و ماجد تو تقریبِ ملاقات کے طور پر زیر بحث آ گیا تھا۔

میں کچھ دن بعد مولوی عبدالرؤف عباسی کے روزنامہ 'حق' کے عملہ ادارت میں آ گیا اور چونکہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا اخبار 'صدق' بھی حق پریس میں چھپتا تھا لہذا مولانا سے اکثر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ مولانا جب کبھی دریاباد سے لکھنو تشریف لاتے 'حق'

کے دفتر ضرور آتے تھے۔ سر سے پیر تک کھدر، بغیر بٹن کھدر کا پاجامہ، کھدر ہی کا لمبا کرتہ اس پر کھدر ہی کا ایک جبہ اور سر پر کھدر کی اونچی دیوار والی گاندھی ٹوپی، شرمیلی مسکراتی ہوئی آنکھیں، کھچڑی داڑھی مگر اس کھچڑی میں اس وقت بھی چاول زیادہ تھے دال کم اب تو غالباً چاول ہی چاول رہ گئے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت میں کم سے کم میرے لئے بلا کی جاذبیت تھی۔ ان کے تشریف لاتے ہی میں زیادہ سے زیادہ ان کے قریب بیٹھتا تھا تاکہ سرگوشی کے انداز میں جب وہ کچھ ارشاد فرمائیں تو میں سُن سکوں وہ حق کا باقاعدہ مطالعہ فرماتے تھے اور جب تشریف لاتے تھے تو اس مطالعے کی روشنی میں تھوڑا بہت تبصرہ بھی فرماتے تھے جسے میں چاہتا تھا کہ گرہ میں باندھ لوں اور اُن کے مشوروں پر عمل کروں۔ حق و باطل کے عنوان سے جو مزاحیہ کالم میں لکھتا تھا مولانا اکثر اسی پر تبصرہ فرماتے تھے۔ تعریف فرمائی تو میں نے اس کو سند سمجھا۔ کسی لغزش پر اعتراض فرمایا تو میں نے اپنی اصلاح کر لی مگر ان میں سے ہر ملاقات کے موقع پر میں نے یہ اندازہ کیا کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی اس شعر کی صحیح تفسیر ہیں جو علامہ اقبال نے مردِ مومن کے متعلق فرمایا ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یوں نہایت میٹھی میٹھی شگفتہ باتیں کریں گے۔ طبیعت میں جو انکسار ہے وہ ہر بات سے ٹپکے گا۔ آنکھیں ہنس رہی ہیں۔ بات بات پر محبت اور شفقت کے پھول برس رہے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ اپنے خوردوں سے بھی آنکھ چار کر کے بات نہیں کرتے۔ ایک عجیب لجائی ہوئی سی ہنسی لبوں سے کھیل رہی ہے کہ اتفاق سے کوئی ذکر ایسا چھڑ گیا جس میں الحاد یا کسی قسم کی بے دینی کا ہلکا سا رنگ بھی ہے۔ بس مولانا ایک دم بدل گئے۔ چہرہ سُرخ ہو گیا تمام شگفتگی رخصت۔ آواز اب بھی کرخت نہ ہو گی مگر دیکھنے والا دیکھتے ہی تاڑ سکتا ہے کہ ایک بپھرا ہوا شیر بیٹھا ہے۔ یہ شرک یا بے دینی کی بات خواہ کسی نے کی ہو اُن کو جو تکلیف پہنچنا ہے پہنچ کر رہے گی اگر کسی عزیز قریب سے یہ لغزش ہوئی ہو تو یہ صدمہ بھی ان سے اتنا ہی قریب ہو گا اگر کسی غیر متعلق فرد سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے تو بھی مولانا اپنے کو غیر متعلق نہیں سمجھ سکتے وہ ایک شدید کرب میں مبتلا ہو کر رہ جائیں گے اور ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں سے شکایتیں برسنے لگیں گی اور پھر وہی شکایتیں طنز میں بجھے ہوئے زہریلے نشتروں کے ساتھ 'صدق' کے صفحات پر بکھر کر رہ جائیں گی۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ادارۂ حق ہی سے ایک ادبی ماہنامہ 'کائنات' کے نام سے میری ادارت میں نکلوا دیا تاکہ اس ادبی رسالے سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ کفر و الحاد کے بغیر بھی ادب کو رنگین بنایا جا سکتا ہے اس رسالے میں کوئی مذہبی پروپیگنڈا قطعی نہ ہوتا تھا کسی الحادی تحریر کا کوئی جواب بھی دینے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی بس صرف مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں حدِ ادب ملحوظ رہتا تھا اور مذہب سے کھیلنے کی جسارت سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ یہ خالص ادبی ماہنامہ تھا جس کا مذہبی امور سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اسی رسالے کے دفتر میں ایک بزمِ مشاعرہ منعقد کی گئی اور اس بزم کی صدارت مولانا عبدالماجد کو اس لئے قبول کرنا پڑی کہ میں مچل گیا تھا۔ مولانا نے ایک مختصر سا خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جو ان کے مضامین کے مجموعے مضامین عبدالماجد دریا بادی میں شریکِ اشاعت ہے۔ مولانا نصف شب تک پوری دلچسپی کے ساتھ اس مشاعرے میں شریک رہے اور میں خود بیٹھا صرف یہ اندازہ کرتا رہا کہ کیسا انوکھا طریقہ تھا ان کی داد کا۔ اچھا شعر سُن کر ان کی آنکھوں کی ہنسی کچھ اور مکمل کھیلتی تھی اور کمزور اشعار پر وہ اس طرح نگاہیں جھکا لیتے تھے کہ گویا چشم پوشی اسی کو کہتے ہیں۔ اس مشاعرے کی طرح مق۔ ۲۔

تم ہو جس کے ہے اُسی کی کائنات

لطف اُس وقت آیا جب ایک سٹھیائے ہوئے شاعر لالہ دشنکری بخش منطق نے اپنی طرحی غزل شروع کی ہے۔ یہ حضرت اپنی قسم کے ایک ہی شاعر گزرے ہیں، سنجیدہ سے سنجیدہ محفل میں ان کی باری آنے پر سنجیدگی اور متانت کو معطل کر دیا جاتا تھا اور ساری محفل میں ایک عجیب کھلبلی سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس مشاعرے میں بھی لالہ دشنکری بخش منطق نے طرحی غزل کا مطلع پڑھا جو ذہن میں اب تک محفوظ ہے ؎

ہیں پسِ چلمن جو بیٹھی بیگمات
تیلیوں سے ان کا جلوہ جگمگات

بھلا بتایئے کوئی کیونکر قابو میں رہ سکتا ہے۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ سامعین ہنسی کے مارے لوٹے جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی اپنا کھدر کا گلوبند منہ پر رکھے ہنس رہے ہیں اور قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے بار بار فرما رہے ہیں "اس جگمگات کا جواب نہیں"۔ منطق صاحب کی غزل کا ایک اور شعر حافظہ میں اُبھر رہا ہے فرماتے ہیں ؎

اپنا قصہ میں نے رو رو کر کہا
اور وہ سُن سُن کے بیٹھا مسکرات

ممکن ہے منطق صاحب کی طرف سے کسی کو یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ وہ مزاحیہ رنگ میں کہتے تھے۔ جی نہیں وہ اپنے نزدیک جو کچھ فرماتے تھے بڑی سنجیدگی سے فرماتے تھے اور آن کی یہی سنجیدگی قیامت بالائے قیامت تھی۔ بہرحال اس مشاعرے کی یہ غزل بھی مولانا عبدالماجد نے بڑی سنجیدگی سے سماعت فرمائی اور ہنستے ہیں اہلِ محفل کا پورا ساتھ دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ پورے مشاعرے میں کسی شاعر نے کوئی کفر آمیز یا الحاد انگیز شعر نہیں پڑھا ورنہ مولانا کو شکایت مجھ سے ہو جاتی اس لئے کہ بانیِ مشاعرہ میں ہی تھا۔

روزنامہ حق سے علیحدہ ہو کر میں نے خود اپنا روزنامہ طوفان کے نام سے نکالا مگر مولانا عبدالماجد دریابادی سے جس حد تک تعلقات پیدا ہو چکے تھے وہ بدستور قائم رہے اور اب پتہ چلا کہ یہ تعلقات صرف روزنامہ حق کی وجہ سے نہ تھے مولانا سے اب بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں میرے روزنامے کے سلسلے میں بھی مولانا کبھی کبھی خط لکھ کر یا جب ملیں تو زبانی ہدایتیں اور مشورے دیتے رہے۔

طوفان آیا اور گزر گیا اور اس طوفان کے بعد میں نے اپنے کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے عملے سے وابستہ پایا اور یہاں آکر یہ عقدہ کھلا کہ خود مولانا کے پاس دریاباد میں ریڈیو کا ایک بڑی سٹ ہے گانا سننے کے لئے نہیں صرف خبریں اور تقریریں وغیرہ سننے کے لئے اور خود مولانا بھی ریڈیو پر کبھی کبھی تقریر فرمانے تشریف لایا کرتے تھے۔ مولانا نے مجھ سے کبھی یہ نہ پوچھا کہ روزنامہ حق کی ملازمت کیوں ترک کی اپنا روزنامہ کیوں نکالا۔ نکالا تھا تو ڈیڑھ دو سال کے بعد بند کیوں کیا البتہ ان کے تیوروں سے یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے میری ریڈیو کی ملازمت کو کچھ زیادہ پسند نہیں فرمایا۔ غالباً وہ میرا صحیح مقام جرنلزم ہی میں سمجھتے تھے بہرحال وہ اس کو میری نجی مصلحت سمجھ کر خاموش تھے البتہ جب ریڈیو سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر میں نے پنچولی آرٹ پکچرس سے ملازمت کا معاہدہ کیا اور فلم کمپنی کی نوکری کر کے لاہور آ گیا تو مولانا کو میری اس نجی مصلحت میں بھی بولنا پڑا اور پہلے میرے ایک آدھ دوست سے اور پھر جب میں خود لکھنؤ گیا تو براہ راست مجھ سے شکایت کی "یہ تم نے کیا کیا" "نقالوں اور بھانڈوں" میں کہاں جا پھنسے"! لاکھ لاکھ میں نے عرض کیا کہ وہاں بھی قلم ہی کی مزدوری کرتا ہوں مگر مولانا کے انداز سے اندازہ ہوا کہ وہ مطمئن نہ تھے اور مطمئن اس وقت ہوئے جب میں سونگ پبلسٹی آفیسر ہو کر پھر لکھنؤ پہنچ گیا۔ ہرچند کہ یہ بھی گانے بجانے کے محکمے کی ملازمت تھی مگر اس کو مولانا فلم کمپنی سے غالباً غنیمت سمجھتے تھے۔ پھر بھی میں اس معاملے میں مولانا سے اس قدر ڈرتا تھا کہ ہرچند کہ دریاباد بھی میرے حلقے میں تھا اور مجھ کو وہاں بھی دورے پر جانا چاہیے تھا مگر محض مولانا کے

خیال سے اپنا طائفہ لے کر وہاں جانے کی جسارت میں نے کبھی نہ کی اور نہ اپنے ہیڈ کوارٹر پہ مولانا کو کبھی زحمت دی کہ وہ یہاں آ کر کیا تھوکیں گے میری اوقات پر۔

سونگ پبلسٹی کے بعد پھر مجھ کو پنچولی پکچرس آنا پڑا اور غالباً ایک مرتبہ پھر مولانا کو اس خبر نے رنج پہنچایا ہوگا مگر مولانا نے اس کی کوئی شکایت مجھ سے نہ کی۔

سونگ پبلسٹی ہی کے زمانے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا ایک اور کارنامہ میرے علم میں آیا۔ مولانا کے ایک دریا بادی عزیز اور میرے دریا بادی دوست جو مدت سے اپنی بیوی کی امانت میں خیانت فرما رہے تھے اور اپنا دل نخاس میں نیلام پہ چڑھائے بیٹھے تھے مولانا کی گرفت میں آ گئے۔ مگر مولانا نے اُن سے یہ نہیں فرمایا کہ وہ دل کے اس سودے سے باز آ جائیں یہ چوری اور ایرا پھیری ترک کر دیں بلکہ اُن کو مجبور کیا کہ وہ اس عاشقی کو قیدِ شریعت میں لے آئیں خواہ پھر جلوۂ کثرتِ اولاد ہی کیوں نہ دیکھنا پڑے۔ اب ان حضرت نے بغلیں جھانکنا شروع کیں اس لئے کہ باپ سے ڈرتے تھے اور ظاہر ہے کہ عام باپوں کی طرح ان حضرت کے باپ بھی ایک بیٹے کے سلسلے کی دو بہوئیں قبول کرنے کے قائل نہ ہوں گے مگر مولانا نے اپنے ان عزیز خورد کو سمجھایا کہ باپ کا تو اتنا ڈر اور خدا کا اتنا ڈر بھی نہیں۔ جب تمہارا مذہب تم کو اجازت دیتا ہے تو جرأت سے کام لے کر یا تو شاہ بن جاؤ ورنہ باپ سے ڈرتا ہے تو یہ چوری ہی چھوڑ دو۔ میرے ان دوست نے شاہ بھی نہیں بلکہ نوشاہ بننا گوارا کر لیا اور یہ عاشقی مولانا کی بر محل جد و جہد سے قیدِ شریعت میں آ گئی۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس قسم کے کئی کارِ ثواب مولانا نے فرمائے اور اکثر چوروں کی چوریاں پکڑ پکڑ کر ان کو شاہ بنایا۔ کاش میں خود اپنی کسی چوری کا دیدہ دلیری کے ساتھ مولانا سے اعتراف کر لیتا اور میری وہ چوری بھی اپنی عاقبت سنوار لیتی۔

پنچولی میں دوبارہ آنے کے بعد ہی قیامِ پاکستان کی نوبت آ گئی اور میں پنچولی سے ریڈیو پاکستان آ گیا۔ مولانا سے خط و کتابت ہوتی رہی کبھی میرا کوئی مضمون دیکھ کر ایک سطری کارڈ لکھ دیتے کبھی میری کسی کتاب کا تعارف دو لفظوں میں لکھ بھیجتے بہر حال خواہ میں ان سے غافل ہو گیا ہوں مگر وہ مجھ کو کبھی نہ بھولے بلکہ یاد دلاتے رہے کہ تقسیمِ ملک سے تعلقات تقسیم نہیں ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن مجھ کو مولانا کا ایک لفافہ ملا جس میں کچھ اخباروں کے تراشے تھے ان اخباروں نے اعلان کیا تھا کہ میں اداکاری کرنے والا ہوں اور گلنار نامی فلم میں ایکٹر کی حیثیت سے آ رہا ہوں۔ میں نے مولانا کو اپنی خاندانی غیرت کا حوالہ دے کر لکھ دیا کہ یہ غلط ہے چنانچہ مولانا نے اپنے اخبار صدق میں اس غلط خبر اور اس رسوا کن پروپیگنڈے کے خلاف میری حمایت میں ایک شذرہ لکھا جس میں میری شرافت کو بڑی محبت سے سراہا۔ بات دراصل یہ تھی کہ گلنار کہانی تھی سید امتیاز علی تاج کی اور مکالمے لکھے تھے میں نے۔ اس کہانی کا ماحول تھا لکھنوی اور اُسی ماحول کے مطابق میں نے مکالمے بھی لکھے تھے۔ کہانی کا ایک کردار نواب مرزا دلشاد کچھ ایسا سج گیا اور اس کے مکالمے کچھ اس آہنگ کے ساتھ میں نے لکھے کہ سید امتیاز علی تاج اور گلنار کے پروڈیوسر سید شوکت حسین رضوی اور میاں احسان سب میرے سر ہو گئے کہ یہ کردار میں خود ادا کر دوں۔ میں نے کانوں پہ ہاتھ رکھے اور صاف انکار کر دیا۔ مگر اُدھر سے یہ تشہیر شروع ہو گئی کہ یہ کردار میں ہی کرنے والا ہوں اور ہندوستانی اخبار یہ خبر لے اُڑے چنانچہ مولانا کے استفسار پہ میں نے صاف انکار لکھ بھیجا۔ اس انکار کے بعد اِدھر اصرار اس حد تک پہنچا کہ گویا اگر میں نے یہ رول نہ لیا تو اس تصویر کی ناکامی کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہو گی اور اس تصویر کی ناکامی کے معنے ہوں گے پاکستان کی فلم انڈسٹری کی تباہی کے اور نہ جانے کیا کیا۔ مجھے دلیری سے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ میں نہایت کمزور قسم کا دوست ہوں میں آخر مجبور کر لیا گیا اور میں نے یہ کردار ادا کیا جس وقت میں پہلی مرتبہ میک اپ روم میں بیٹھا تھا میرے ذہن میں وہی الفاظ گونج رہے تھے جو میں نے مولانا کو لکھے تھے کہ میں اداکاری کر کے تھانہ بھون کے نام پہ بٹہ نہ لگاؤں گا اور میں وہی بٹہ لگانے جا رہا تھا۔ میں نے اداکاری

کی گئی ان دعاؤں کے ساتھ کہ خداوندا جس طرح بہت سی تصویریں ادھوری بن کر رہ جاتی ہیں یہ تصویر بھی اگر تیری قدرت سے ایسی ہی رہ جائے تو کم سے کم میں مولانا عبدالماجد دریا بادی سے تو شرمندہ نہ ہوں گا۔ مگر چونکہ وہ شرمندگی میرا مقدر بن چکی تھی لہٰذا یہ تصویر بھی بنی اور نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ اس پر اخباروں نے تبصرے کئے اور وہ تبصرے دیکھ کر مولانا نے ایک شذرہ میرا اپنے اخبار صدق میں لکھا جس کے ہر لفظ سے اُن کی وہ تکلیف برس رہی تھی جو واقعی ان کو ہونا چاہیئے تھی۔ اپنے خلاف مولانا کا یہ شذرہ دیکھ کر ندامت سے میری گردن کچھ اور جھک گئی مگر میرا دل اُس وقت بھی پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اگر میرے والد موجود ہوتے تو یہی تکلیف اُن کو بھی پہنچتی۔ میں اس سلسلے میں کوئی تاویل پیش کرنا نہیں چاہتا کہ یہ آرٹ کی خدمت تھی یہ پاکستان کی ایک صنعت کی خدمت تھی اور اداکاری کا جہاں تک تعلق ہے کس نے نہیں کی حضرت خواجہ حسن نظامی تصویروں میں آچکے ہیں۔ خود سید امتیاز علی تاج اداکاری فرما چکے ہیں اور بے شمار دوسرے نام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ سب عذر لنگڑے ہوں گے اور سچی بات وہی ہے جو مولانا نے صدق میں لکھی اور وہی لکھ سکتے تھے اس لئے کہ ان کو واقعی مجھ سے یہ توقع نہ تھی میں ان کو کتنا ہی عزیز سہی مگر مشرقی غیرت اور اسلامی حمیت سے زیادہ عزیز نہیں ہو سکتا اور میں مولانا سے کیا کہوں جب کہ خود اپنی نظروں سے اپنے کو گرا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

اس حادثے کے بعد مولانا نے مجھ کو کبھی خط نہ لکھا اور نہ مجھ میں اتنی ہمت کہ میں اُن کو خط لکھتا لیکن مولانا مجھ کو اب بھی اتنے ہی عزیز ہیں ان کا احترام میرے دل میں آج بھی اتنا ہی ہے میں جانتا ہوں کہ ان کے اس رنج اور غصے میں بھی ایک خلوص ہے یہ اس بزرگ کا غصہ ہے جس نے خود کبھی اپنی تصویر تک نہیں کھنچوائی مصنفین کے ایک تذکرے میں جس میں ہر ایک کی تصویر تھی حد یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی بھی تصویر تھی جہاں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا ذکر آیا ہے وہاں ان کی تصویر کی جگہ چوکھٹے میں اُن ہی کے عکسِ تحریر میں یہ شعر لکھا ہے ؎

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامیِ فرہاد نہیں

وہ بھلا میری سوانگ بھری تصویر۔ چلتی پھرتی تصویر۔ باتیں کرتی تصویر کیسے گوارا کر لیتے۔ وہ فلم انڈسٹری کے شدید ترمخالف اور میں اس انڈسٹری کے عروج کے لئے اپنی روایات کو بھی نیلام پر چڑھائے ہوئے آخر وہ کیونکر برداشت کرتے۔

گو مولانا لاکھ دامن بچائیں وہ اپنے کو مجھ سے چھین نہیں سکتے۔ ان کی وہ مسکراتی ہوئی جُھکی جُھکی نظریں۔ ان کے وہ زیرِ لب میٹھے میٹھے بول۔ ان کی سادہ سادہ باتوں کی پرکاری ان کے تبحر کے باوجود وہ طالب علمانہ ادائیں۔ میرے سامنے اس وقت بھی ہیں اور میں اپنے کو ان کی طرف کھینچتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ میری کسی چوری کو پکڑ کر اس کو شرعی حدود میں کھینچ لائیں اس لئے بھی نہیں کہ وہ ایک سطری خط لکھ کر پھر مجھے پکاریں۔ بلکہ نہ جانے کیوں۔ اس بیساختگی کی کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ ان میں خلوص ہے اور خلوص میں ایسی ہی بے پناہ کشش ہوتی ہے۔

میں نے دانستہ مولانا کی علمی یا ادبی حیثیت پر روشنی ڈال کر سورج کو چراغ دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ حیثیت اظہرمن الشمس ہے۔ مجھ کو تو اپنی آنکھ سے ان کی شخصیت ہر ایک کو دکھانا تھی اب خدا جانے دیکھنے والے ان کو دیکھیں گے یا مجھے۔

کومل رانی

صدیقہ بیگم (سیوہاروی)

بابو لائن میں رہتے ہوئے مجھے تین سال ہو گئے تھے۔ یوں تو اس کا نام ریلوے کالونی تھا لیکن سب لوگ اسے بابو لائن ہی کہتے تھے۔ آخر یہ انگریزی قسم کا نام لینا کوئی آسان بھی تو نہ تھا اور پھر جب انگریزی حکمرانوں سے نفرت ہو تو ان کا رکھا ہوا نام استعمال کرنا ٹھیک بھی تو نہیں ہے۔ ہاں تو اس بابو لائن میں ریلوے کے تمام ملازمین رہتے تھے جن پر کسی نہ کسی شکل میں کلرک ہونے کا یا کلرک قسم کے انسان ہونے کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ بس ریلوے کے دو چار افسر ہی تھے جو دوسری جگہ اپنے اچھے اچھے بنگلوں میں رہتے تھے ورنہ ریلوے کے جملہ ملازمین تو اسی بابو لائن میں رہا کرتے تھے۔ یہ بابو لائن یوں تو بہت چھوٹی تھی جس میں مشکل سے سو گھر ہوں گے لیکن اس میں ہر قوم کے لوگ بستے تھے۔ مدراسی سے لے کر کشمیری تک سبھی لوگ۔ شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس کی بابو لائن میں نمائندگی نہ ہو سکتی ہو۔ لیکن یہ بابو لائن اس کے باوجود دلچسپ نہ ہوتی اگر وہاں کومل رانی کا وجود۔ ہوتا جس نے بابو لائن کو دائرہ بنا کر اپنے آپ کو اس کا مرکز بنا دیا تھا۔ گویا ساری بابو لائن اس کے ارد گرد حلقے بنائے کھڑی ہو۔

کون تھا جو بابو لائن میں کومل رانی کو نہ جانتا ہو۔ یوں بھی وہ ہر کوارٹر میں کچھ ایسی بے تکلفی سے چلی جاتی کہ کسی کی بھی ہمت نہ پڑتی کہ وہ اس سے اتنا بھی کہہ سکے کہ "بس تم ہمارے کوارٹر میں قدم مت رکھو۔ اس پر تو ایشور کی دیا ہی رہنے دو۔" اور وہ ہم سب عورتوں سے بڑی لجاجت سے باتیں کرتی کہ اگر ہم چاہیں بھی تو اس کی فطرت کی گہرائی میں نہ اتر سکیں۔ کومل رانی عبارت تھی مسکراہٹ اور شوخی سے۔ جس کے جسم میں شعلے بھرے تھے اور جس کی رگوں میں ہر لمحہ رنگ بدلتا ہوا خون دوڑا کرتا تھا اور جو اپنے عاشقوں کے سامنے اس طرح مچلتی کہ جیسے دو سالہ بچہ مچلتا ہے کہ بس ماں کی گود سے چھوٹا ہی تو پڑتا ہے۔ اور پھر اس کی ماں مضبوطی سے اپنے ننھے منے کو پکڑ لیتی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ سچ مچ یہ ننھا گر جاتا جو ــــــ" اور اس کی ماں پھر یہی سوچتی کہ اس کا بچہ ایک شیشہ ہے جو زمین پر گرتے ہی چکنا چور ہو جائے گا اور کومل رانی بھی ایسے ہی مچلتی جیسے وہ

اپنے عاشق کے ہاتھ سے چھوٹ ہی تو جائے گی مگر وہ تو پھسل کر رہ جاتی اور اس کے چاہنے والے کا دل دھک دھک کرنے لگتا مگر کومل رانی ہنستی ہی رہتی یا پھر کچھ اس طرح منہ بنا کر اپنے عاشق کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور اپنے چہرے پر دبیز شکنیں ڈال لیتی گویا وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو، کسی بڑے بھنور میں پھنسی ہو اور اس کے چکر سے نکلنا چاہتی ہو اور اپنے عاشق کے سامنے کچھ اس طرح کرتی کہ وہ سر جھکا لیتا اور وہ محسوس کرتا جیسے اس نے اپنی ماں کو ننگا دیکھ لیا ہو اور وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا، مگر پھر وہ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی آنکھوں میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ شوخیاں بھر لیتی اور پھر ایک فلک شگاف قہقہہ اور اس کا آنچل سینے سے ڈھلک آتا اور وہ بڑی ادا کے ساتھ اپنے ہونٹ اپنے عاشق کے پاس لے جاتی اور اس کا چاہنے والا ان پہ اپنے ہونٹ پیوست کر دیتا۔

اور یہ وقت ہوتا جب میں پٹ سے اپنی کھڑکی کا دروازہ بند کر دیتی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا اور تنفس تیز — لیکن پھر فوراً میں اپنی کھڑکی کھول لیتی اور کیوں نہ کھولتی یہ ہمارے اپنے گھر کی کھڑکی جو ٹھہری — آخر کومل رانی سامنے اب اپنی کھولی میں دکھائی دیتی لیکن اس کا عاشق اب الگ بیٹھا ہوتا اور کومل رانی اس بے بسی کو اس طرح بھول جاتی جیسے کوئی ماہ گیر کسی اپاہج، اندھے، ننگے فقیر کو دھیلا پھینک کر آگے بڑھ جائے اور وہ پیار بھرے لہجے میں پوچھتی

"کیا پاکٹ میں بھی کچھ ہے یا یوں ہی، آج صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں، چائے بھی نہیں پی، بس یہ انگیٹھی سلگائی ہے۔ یہ پکا کوئلہ ہے جو دو گھنٹے میں سلگتا ہے۔"

اور ہماری نظر انگیٹھی پہ پڑتی جو اپنے آپ سُلگتی، چاروں طرف دھواں ہی دھواں ہوتا۔

کومل رانی یہاں بہت دنوں سے رہتی چلی آئی تھی۔ مگر کوئی اس کو وہاں سے ان سب باتوں کے باوجود نہیں ہٹا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ جب کوئی بابو ناراض ہوتا تو دفتر کے بڑے بابو سے کہہ سُن کر اس کا کوارٹر بدلوا دیتا — بس یوں سمجھئے کہ وہ گیند کی طرح ادھر سے اُدھر چلی جاتی — مگر کوئی عذر نہ کرتی۔ لیکن جب بھی کسی سے کوئی جھگڑا ہوتا یہی کہتی "میں معمولی عورت نہیں ہوں جو بے بات کے دب جاؤں، بس بدلوا دو میرا کوارٹر — میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ جب تک ساری لائن کے ایک اک گھر میں نہ رہ لوں گی، چین سے نہ بیٹھوں گی۔" اب کوئی کیا کہے، البتہ کوئی منچلا یہ ضرور کہہ دیتا کہ "ٹھیک اور بدلواؤ، اس کو تو اسی میں مزا آنے لگا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔ مگر سب ہی اس سے نفرت کرتے تھے اور تھی بھی وہ نفرت کے لائق۔

کومل رانی رننگ روم کے خانساماں کی بیوی تھی — ٹیکا رام، جس کی عادت بالکل اس کے برعکس تھی۔ وہ عبارت تھا سنجیدگی اور متانت سے، اور کبھی کسی نے اُسے مسکراتے نہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ گہرا پردہ پڑا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں اُداسی تھی۔ گویا وہ ہمیشہ ہی تو خالی الذہن ہوتا ہے، یا پھر کسی گہری سوچ میں، جو عادت بن جائے۔ ریلوے لائن میں پرانے باورچیوں کی متفقہ رائے تھی کہ ان کی نوکری میں اس سے سیدھا اور شریف النفس آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی بیوی کی ان حرکتوں کے باوجود اس کی نوکری برقرار تھی اور کسی کو بھی کوئی شکایت نہ ہوتی۔ شکایت کی کتاب میں ٹیکا رام کا نام کہیں نظر نہ آیا تھا۔

ٹیکا رام معمولی سا باورچی تھا جس کو ایک قلیل سی رقم بطور تنخواہ کے ملتی تھی۔ اس کے گھر پہ ایک بیوہ ماں اور چار کنواری بہنیں تھیں اور ٹیکا رام اکیلا اُن کا خرچ برداشت کرتا تھا۔ اور بقول کومل رانی کے وہ صرف دس روپلے اپنے خرچ کے لئے روک

لیتا تھا اور باقی تنخواہ اپنی ماں اور بہنوں کو بھیج دیتا تھا۔ لیکن کومل رانی کی بات پر کون یقین کئے بیٹھا ہے۔ آخر اس گرانی کے زمانے میں کون دس روپے میں گزر کر سکتا ہے۔ اور اسی لئے میں نے بھی کومل رانی کی بات پر یقین نہیں کیا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ٹیکا رام زنگ روم کا باورچی تھا، جس کی ڈیوٹی کچھ اس قسم کی تھی کہ جب وہ دس بجے نکلتا تو رات ہی کو کہیں گھر میں داخل ہوتا۔ اور اگر رات کی ڈیوٹی ہوتی تو پھر سویرے ہی آتا اور آتے ہی اپنی کھولی میں چپکے سے سو جاتا۔ اور جب سو کر اٹھتا تو کھانا کھانے کے بعد بابو لوگوں کا سودا لینے چلا جاتا۔ اس درمیان میں اس نے کبھی یہ بھی جاننے کی کوشش نہ کی کہ اس کی بیوی کیا کرتی ہے۔ بس وہ تو گھر میں داخل ہوتا ہوا دکھائی دیتا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی کومل رانی اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیتی تھی اور اسی شرارت آمیز تبسم سے اسے پیار کرنے لگتی جیسے سچ مچ وہ اس کا شوہر نہیں، بلکہ عاشق ہے۔ جو اپنے عشق کی قیمت ادا کرنے کے بعد اُسے وصول کر رہا ہے۔ اور وہ اسی والہانہ پن سے اس سے محبت کرتی۔ یہ انداز دراصل اس کی فطرت کا جزو بن چکا تھا۔ اور اسی انداز کے ساتھ وہ کہتی۔

" کچھ جیب میں بھی ہے یا یوں ہی چلے آ رہے ہو۔ دیکھو آج میں نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ چائے بھی نہیں پی، بس انگیٹھی سلگائی ہے۔ یہ بکا کوئلہ میرا جو دو گھنٹے سے پہلے نہیں سلگتا۔"

اور میں انگیٹھی کی طرف دیکھتی جو اپنے آپ سلگتی ہوتی۔ اور پھر میں انگیٹھی سے اپنی نظر کو اٹھا کر اس دیوار پر ڈال دیتی جو دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھی۔ بالکل سیاہ۔ جس کی سیاہی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اسے ابھی اور کتنا کالا ہونا ہے۔

اور ٹیکا رام اس کا ہاتھ جھٹک کر جھولا اٹھا لیتا۔ " لا رانی —— راشن کارڈ دے دے، گرین شاپ سے راشن لے آؤں۔" " راشن شاپ " پر بھی وہ خاموش کھڑا رہتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں بھی وہ کسی سے تُو تُو میں میں نہ کرتا تھا۔ راشن لانے کے بعد وہ پانی بھرنے چلا جاتا اور گھنٹوں نل پر کھڑا رہتا مگر پہلے پانی بھرنے کے لئے جھگڑا نہ کرتا۔ جب سب لوگ چلے جاتے تو وہ پانی لے کر چپ چاپ چلا آتا۔ یہی وجہ ہے کہ کومل رانی سے نفرت کرنے کے باوجود کسی کی ہمت ٹیکا رام سے یہ کہنے کی نہ پڑتی کہ " ٹیکا رام! تم اپنی رنڈی کو کہیں اور لے کر رہو اور ریلوے کی کھولی خالی کر دو۔ یہاں ہمارے بال بچے رہتے ہیں! یا پھر اپنی بیوی کو سنبھال کر رکھو۔"

مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ٹیکا رام سے دو ٹوک بات کرے یا اس کو صرف اطلاع ہی دے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی رانی کیا کرتی ہے۔

مگر کومل رانی کا منہ کون بند کر سکتا تھا۔ ہماری لائن کے چوتھے کوارٹر میں ایک مرہٹی ٹکٹ چیکر رہتا تھا جس کی بیوی چار بچوں کی ماں تھی۔ اس کے بیاہ کو سات سال ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر اتنا کھنچاؤ بھی نہ رہا تھا بلکہ اس کی رنگت تک زرد ہو گئی تھی اور گالوں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ ہمیشہ میاں بیوی میں جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ آخر ایک دن سننے میں آیا کہ اس کی بیوی روز کی دانتا کلکل سے تنگ آ کر اپنے میکے چلی گئی۔ جب کئی روز کے بعد بابو آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا کوارٹر خالی ہے اور الگنی پر چند کپڑے بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ کھانا تیار رکھا ہے۔ اور بات کی بات میں یہ بات بابو لائن کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ گئی اور کومل رانی منہ میں پان دبائے بڑے ٹھسّے سے ہمارے کوارٹر میں چلی آئی۔

" بائی تم نے کچھ اور بھی سنا ہے، ٹکٹ بابو کی عورت بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔ بڑی چھنال تھی وہ —— " میں کومل رانی کی

طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی چمک رہی تھیں۔ جیسے وہ انتقام لے رہی ہو۔

"بائی ــــ وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں نے خود اُسے اسٹیشن پر دیکھا ہے۔ وہ میکے نہیں گئی، بابو نے بات بنائی ہے۔ تم کیا جانو وہ باتیں بنانا خوب جانتا ہے، میں بھی اُسے خوب جانتی ہوں۔ میرے پاس آتا جو ہے"

وہ کہتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے آج ہی تو اُسے موقع ملا ہے اور میری نظر اُچھل اُچھل کر اس کی کالی دیوار پر پڑ رہی تھی جو دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھی۔ بالکل سیاہ ــــ جس پر سیاہی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی ــــ پھر وہ چلی گئی، کسی دوسرے کوارٹر میں، کسی دوسرے کو یہ خبر سنانے۔

اور کچھ دنوں کے بعد میں نے ٹکٹ بابو کو کومل رانی کی کھولی میں دیکھا اور اب تو وہ ڈیوٹی کے بعد ہمیشہ ہی اُسی کھولی میں گھُسے رہنے لگے۔ ڈیوٹی کے بعد ان کا زیادہ تر وقت کومل رانی کے گھر پر ہی گزرتا۔ اور دیوالی کے دن تو میں نے دیکھا کہ سارے کوارٹر جگمگا رہے تھے مگر ٹکٹ بابو کا کوارٹر سونا تھا۔ وہاں صرف ایک تالا جھول رہا تھا اور انھوں نے خود کومل رانی کے یہاں دیئے جلائے تھے۔ کومل رانی کی کھولی دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گویا لکشمی دیوی بس اُسی کے گھر میں تو آنے والی ہے۔ اس نے اپنے گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزیں باہر گھورے پر پھینک دی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لکشمی دیوی اس کی غربت کو نہ دیکھ لیں۔ اس نے اپنی کھولی میں خود ہی سفیدی بھی کر لی تھی مگر اس سیاہ دیوار پر تو جیسے کوئی اثر بھی نہ ہُوا تھا، وہ بدستور سیاہ تھی۔

ٹیکا رام ریلیونگ ڈیوٹی پہ باہر گیا ہُوا تھا اس لئے وہ چار دن سے پہلے کہاں آ سکتا تھا۔ کومل رانی اور اس کے تمام عاشق مطمئن تھے۔ اس کے گھر میں صبح سے شام تک قہقہوں کی آوازیں آتیں اور کئی روز سے کومل رانی نے اپنی انگیٹھی کو باہر سلگانے کے لئے بھی نہیں رکھا تھا، اس لئے کہ اُس کے گھر میں انگیٹھی برابر جلتی رہتی تھی۔ اور کچھ نہ کچھ پکتا ہی رہتا تھا۔ اس کی شوخیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ وہ ٹیکا رام کے جانے کے بعد تو اور اطمینان سے جھکنے مٹکنے لگی تھی۔ بالولائن میں ایک سرے سے دوسرے تک اس کی نوگزی ساری کا آنچل لہرانے لگا تھا۔ وہ ہر کوارٹر میں اسی طرح گھستی رہی اور اس کے گھر میں بالولائن کے بابوؤں کا تانتا بندھا رہتا۔ اور رات بھر کومل رانی کی کھولی آباد رہتی۔ جو بھی باہر نکلتا وہ باہر اس طرح تھوکتا گویا وہ کوئی غلاظت باہر لے جانا نہیں چاہتا۔ وہ سب کچھ یہیں پھینک کر باہر جانا چاہتا ہے اور پھر اس کے علاوہ ایک اور مجبوری بھی تو تھی۔ اس لئے کہ کومل رانی کے دروازے کے سامنے ہی گھورا تھا جہاں بالولائن کا سارا کوڑا کرکٹ جمع ہوتا رہتا۔ اور کومل رانی کے گھر کی غلاظت بھی اسی گھورے میں اپنا مسکن تلاش کر چکی تھی۔

میں نے اپنے کوارٹر کی کھڑکی کھولی۔ کومل رانی کی کھولی کا دروازہ کھلا ہُوا تھا اور مجھے ٹکٹ بابو کی آواز سنائی دی جس کی کھولی میں اندھیرا تھا کیونکہ اس کی بیوی میکے چلی گئی تھی۔ یا پھر کومل رانی کے بیان کے مطابق اپنے چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ٹکٹ بابو دیوالی کی خوشی منانے کے لئے کومل رانی کی زلفوں سے کھیل رہے تھے۔ مجھے اس وقت کومل رانی کے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کے جسم سے شرارے نکل رہے ہوں اور اس کی آنچ مجھے دور ہی سے محسوس ہو رہی تھی۔ کومل رانی کی عیاشی سے ساری فضا مکدر ہو گئی تھی اور مختصر سی کوٹھڑی میں جہاں دو تین دیئے ٹمٹما رہے تھے کومل رانی اور ٹکٹ بابو کی آواز رینگ رہی تھی۔ جس سے فضا میں ہلکا ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کی کھولی کا یہ دروازہ بند ہو گیا، کھولی کے اندر روشنی ہو رہی تھی لیکن باہر اندھیرا تھا۔ لیکن اس اندھیرے کو کم کرنے کے لئے دیوالی کے یہ چراغ اپنی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر گھٹا ٹوپ اندھیرے کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ چراغ قطعاً ناکافی تھے۔ میں اس

اندھیرے کو دیکھ رہی تھی جس میں سایہ سا لہراتا ہوا دکھائی دیا جیسے وہ قدم اُٹھا اُٹھا کر چل رہا ہو، یوں تو آج چاند بھی نکلا تھا لیکن گہرے سیاہ بادلوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر کر بے بس کر دیا تھا۔ سایہ اس اندھیرے میں لہرا رہا تھا اور ذرا سی دیر میں جیسے کوئی کومل رانی کے گھر میں دستک دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے بعد ہی پٹ سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہی وہ بڑبڑا رہی تھی "ان کتوں نے اور ناک میں دم کر دیا۔ میرا گھر کیا دیکھ لیا ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتے اور ٹکٹ بابو کی آواز اس کے ساتھ ہی سنائی دی وہ کہہ رہے تھے "دروازہ تک بھگا کر آیا تھا!"

لیکن کھڑکی کے کھلتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کومل رانی کی جگہ پہ میں ہوں اور میرے سامنے میرا شوہر کھڑا ہوا ہے اور اس کے سامنے وہ ٹکٹ بابو جو ٹیکا رام کا رقیب تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ٹیکا رام کا ہاتھ کومل رانی کے منہ پہ پڑنے والا ہے۔ ایک زبردست چانٹا جس کی آواز ایک لمحے میں بابو لائن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سنائی دے گی۔ اور اس کے تھوڑی دیر کے بعد کومل رانی کی لاش زمین پہ تڑپے گی اور ٹیکا رام دیوانہ وار اس کو مار دیگا۔

میرے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی، میں کانپنے لگی اور اپنے گال رونے لگی، اپنے جسم کی ہڈی ہڈی میں درد محسوس کرنے لگی۔

لیکن پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ ٹیکا رام کا سر جھک گیا۔

"سوامی! مجھے معاف کرنا، سوامی!"

اور ٹیکا رام نے اپنے مخصوص انداز میں کہا جس میں سنجیدگی سے زیادہ صبر و تحمل نظر آ رہا تھا۔

رانی ——— میں ابھی ذرا سی دیر میں آؤں گا، کھانا تیار رکھنا، اور آج تو دیوالی کی رات ہے اچھا پکوان ہونا چاہیئے، بابو سے مت کہنا کہ میں آیا تھا۔ اور یہ کہہ کر ٹیکا رام ایک طرف کو چل دیا۔

میرے ذہن میں ٹیکا رام کا جملہ گونج رہا تھا اور میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ آواز ہمالہ کی بلندیوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھی۔ آخر ٹیکا رام اتنا بے حس اور مجبور کیوں ہے۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ٹیکا رام کفایت شعار جو ہے وہ اتنے دنوں سے محض دس روپے میں اپنے گھر کا خرچ چلا رہا ہے۔ اور میں نے اپنی کھڑکی بند کر لی، اس لئے کہ کومل رانی کی کھڑکی بند تھی۔

باہر بدستور اندھیرا تھا۔ چاند بادلوں کے نرغے میں پھنسا ہوا تھا لیکن دیوالی کا چراغ دیوار کے نیچے ٹمٹما رہا تھا اور دیوار پر سیاہی کی تہہ دیے کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ ہوا برابر چل رہی تھی، چراغ جھلملا رہا تھا لیکن اسی سرکشی کے ساتھ جل رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اس سیاہ دیوار پر طنز کر رہا تھا۔

بیاہ بُدھ

غلام علی چودھری

"اتنے آم، اتنی بوتلیں، تم میں، بیاہ بُدھ نہیں ہے بابو۔" وہ میز پر برف میں لگے ہوئے آموں اور لیمونیڈ کی بوتلوں کو دیکھ کر بولا اور ہنستے ہنستے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ارے یہ کیا کہا تو نے، کیا نہیں ہے مجھ میں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہی ہی ہی ہی ہا ہا ہا ہا ــــ" وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا اور میں اس کا منہ تک رہا تھا۔

"بالشت بھر داڑھی ہے تیرے منہ پر ملّاں، بہت نہیں تو انگشت بھر ہی شرم کر۔" میں نے کچھ تلخ ہو کر کہا۔

"تم میں چکل بھر بیاہ بُدھ نہیں ہے بابو۔" اس نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا اور پھر بالکل ہی لوٹ پوٹ ہو گیا۔

میرا جی چاہ رہا تھا بوتل کا ڈلا اس کے منہ پر دے ماروں۔

"یہ آج کیا شوشہ چھوڑا ہے تو نے؟" میں نے ترل گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ "جلدی بول کیا بلا ہے یہ بیاہ بُدھ؟"

"یہ بلا رہتی تھی لالہ چھجو مل میں۔" اس نے گلاس منہ سے لگا لیا اور ایک گھونٹ بھر کر بولا۔ "اور وہ رہتا تھا میرے ہمسائے میں۔"

"پھر تو تجھ پر بھی آسیب کا اثر ہوا ہو گا تھوڑا بہت۔" میں نے کہا۔

"تھوڑا نہیں بہت ہوا بابو۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "جب سے اس بلا کا پتہ چلا بیوی سے لڑائی چھوٹ گئی میری۔ پہلے وہ مجھے پھوہڑ لگتی تھی پھر اچانک سگھڑ دکھائی دینے لگی۔ پر چھجو مل اور رام پرتی والی بات کہاں؟ ان دونوں میں تو بڑا ہی پریم تھا بابو!"

"کیا کہنے ہیں تیرے ملّاں ـــ بیاہ بُدھ سے چلا اور پریم دوارے پہنچ گیا۔ ایک بلا تو تھی نہ تھی اور دوسری سر پر لا کھڑی کی تو نے ـــ کون کیا تھی یہ رام پرتی؟"

"ہا ہا ـــ ہتیا نہ کرو بابو۔ بڑی پتر دیوی تھی وہ تو۔" اس نے انگلی پھیرتے اور داڑھی ہلاتے ہوئے کہا اور پھر ایک لمبا گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔

"میں تیرا گلا کاٹ دوں گا ملّاں۔" میں نے آم کاٹتے ہوئے اسے چھری دکھائی۔ "بول یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟"

"میرا گلا تم ایک بار چھوڑ سو بار کاٹ دو بابو پر رام پرتی کو جرانہ کھو جڑی ہینا ہے یہ۔" وہ داڑھی پر سے آم کا رس پونچھتے ہوئے بولا۔

"کچھ بکنا بھی ہے تو رام پرتی کے بابو؟" میں نے جھلا کر کہا۔

"مجھے یہ کاٹ دو۔" اس نے دو نرم نرم آم چن کر میری طرف بڑھائے۔ "ابھی سارا بکھیڑا سُنا دیتا ہوں تمہیں۔"

"بس دو آموں کے بدلے۔" میں نے آم لیتے ہوئے کہا۔

"واہ بابو!" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "رام پرتی کی کہانی تو انمول ہے انمول۔ ججو نے اپنی عمر بھر کی کمائی اس پر لگائی پھر بھی کہتا تھا سستی پائی۔"

"یہ عمر بھر والی بات بھی خوب رہی ملّاں۔ پریم ان کا مرگھٹ میں چالو ہوا تھا کیا؟" میں ہنسی نہ روک سکا۔

"مرگھٹ میں تو نہیں مرگھٹ کنارے کہہ لو بابو۔ ججو پچاس برس کے لگ بھگ تھا اور پرتی چالیس سے کچھ اوپر کا ہے کو جوانوں کے بیاہ میں ایسا چاؤ اور لگن ہوگی بابو۔"

"ججو کام کیا کرتا تھا شریف؟" میں نے کٹے ہوئے آموں والی پلیٹ اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

"میرے احاطے کے بائیں ہاتھ وہ چھاپہ خانہ تو تم نے دیکھا ہی ہوگا؟" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کھوسلہ پریس؟"

"آ ——— شاباش ——— کھوسلہ پریس ——— وہاں چپڑاسی تھا ججو۔ مجھے پتہ نہیں وہ کب سے چھاپے خانے میں تھا۔ میرے ہوش سنبھالنے سے اس کا بیاہ ہونے تک میں نے اسے وہیں پریس کے نوکروں کے کوارٹروں میں ویسے ہی دیکھا۔"

شریف نے چار پانچ بار جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں۔ پھر سامنے دیوار پر ٹکٹکی باندھ لی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی یاد کے پردے سے بیتے دنوں کی گرد جھاڑ کر ججو کی تصویر دیکھنا چاہتا ہو۔

"لم تڑنگا سانولے رنگ بھدّے ناک نقشے کا بے ہنگم سا آدمی، چٹیل ٹنڈ کے بیچ مینڈنے کی سی چوٹی، منڈی ہوئی داڑھی اور پھیلی ہوئی گچھے دار مونچھیں۔ بس ایک اس کی چوٹی اور مونچھوں میں چٹے بال اتنے نہ تھے، جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا اور دوسرے اس کے کان ابھی دو ہی تھے۔" شریف نے آم کا چھلکا دانتوں میں سے کھینچ کر نکالتے ہوئے کہا۔

"تو بعد میں اس کے کان کیا چار ہو گئے تھے ملّاں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"چار نہیں پونے دو ہو گئے تھے بابو، اور اللہ کی قسم ججو کے کان نہ گھٹتے تو اس کا بیاہ نہ ہوتا۔" ملّاں ہنستے ہوئے بولا۔

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں آم کی قاش دانتوں میں رکھے رکھتے رُک گیا تھا۔

"تسلی سے آم کھاؤ بابو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کوئی اچنبھے کی بات نہیں یہ۔ گرمیوں کی ایک شام کو احاطے والے کنوئیں سے پانی کا گھڑا بھر رہا تھا کہ ججو بھاگا بھاگا آیا۔ کہنے لگا یہ پریس میں آگ لگ گئی ہے شریف جلدی پانی نکالو۔ کوئی بیس ایک بالٹیاں پانی میں نے نکالا اور اس نے ڈھویا اور آگ پر ڈالا۔ جانے کیا چیز جلتے جلتے ٹوٹی۔ پگھلی ہوئی دھات کا ایک ٹکڑا تیر کی طرح اسے لگا اور اس کے داہنے کان کا نچلا حصہ اُڑا کر لے گیا۔ ججو ہمت نہ کرتا تو سارا پریس جل کر راکھ ہو جاتا۔ کیونکہ آگ بجھانے والا انجن بہت دیر میں پہنچا تھا۔ بس ڈیڑھ دو ہزار روپے کا نقصان ہوا مالکوں نے ججو کی تنخواہ میں پانچ روپے ترقی کی اور پچاس روپے انعام کے الگ اسے دئے۔ تین چار دن بعد وہ ہسپتال سے آیا تو سیدھا میرے پاس پہنچا، روپے میرے سامنے رکھ کر بولا۔ 'شریف آدھے اٹھا لو۔' میں نے مسکرا کر کہا۔ 'کان تمہارا اُڑ گیا لالہ میرا کیا گیا، جاؤ مزے کرو۔' وہ ہنس کے بولا۔ 'کان اُڑنے کے مجھے پانچ روپے مہینہ ملے ہیں شریف ہمیشہ کا نقصان ہمیشہ کا انعام۔' میں نے بہت زور لگایا

پر وہ نہ مانا، ناچار میں نے کہا اچھا تو پھر آموں اور سوڈے کا شغل ہو جائے اس اتوار کو۔"

"تو آم اور سوڈے کا شوق پرانا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بابو اس گرمی میں اس سے بہتر کیا چیز ہوگی۔" اس نے جواب دیا۔

"میں سمجھا تھا شریف تو نے یوں ہی مجھ سے کہہ دیا آم اور سوڈے کا پروگرام بناؤ، مگر یہ سب کچھ تو ویسے ہی پڑا ہے۔" میں نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ خاک ہے تیرا شوق؟"

"نہیں بابو بہت کھا پی چکے ہیں ہم، اب میری بات سنو تم۔ تو میں اتوار کو چھجو کے کوارٹر میں گیا۔ ایک تھالی میں تھوڑے سے آم پڑے تھے اور تین بوتلیں سوڈے کی پاس دھری تھیں۔ میں نے کہا "بس لالہ؟" بولا "اور کیا شریف — ڈیڑھ سیر آم، سیر تمہارے آدھ سیر میرے۔ تین بوتلیں دو تمہاری ایک میری۔ تم کہتے ہو گے پچاس روپے لگا دوں گا اسی دھندے میں۔ ایشور جانے اس وقت تم چاہتے تو پچیس اٹھا لیتے چھجو تمہارا ہاتھ پکڑتا تو کھتری کا بچہ نہ ہوتا۔ تم اپنے چلن پر رہے میں اپنے چلن پر ہوں۔" میں نے کہا "مجھے تمہارے چلن کا پتہ ہوتا لالہ تو میرا چلن اور ہوتا۔" کہنے لگا "نہیں بھئی یوں نہیں ہوتا دوسرے کا چلن جانو نہ جانو اپنے چلن پر رہو، اپنا چلن تو اسی کو کہتے ہیں۔ میری طرف دیکھو گیارہ برس کا تھا جب ماتا پتا کو آگ دے کر گھر سے نکلا تھا۔" میں نے کہا "یہ کیا لالہ۔ تمہارے ماں باپ ایک ہی دن مرے تھے کیا؟" بولا "ہاں بھئی ہونی جیسے چاہے جیسے چاہے لے جائے۔ میرے پتا کی گاؤں کے سکول کے سامنے گلگلوں اور چٹنی کی دکان تھی اور ہم کسائے کی ایک کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ برسات کے دن تھے، چار دن متواتر مینہ برستا رہا تھا اور پھر کڑاکے کی دھوپ لگی تھی۔ رات کو ماتا پتا چھت پر سو رہے تھے اور میں ہمجولیوں کے ساتھ گلی میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اچانک ایک مکان کے گرنے کی آواز آئی۔ لوگ چاروں طرف سے بھاگے آئے۔ ہماری کوٹھڑی کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں، ماتا پتا ملبے کے نیچے دب گئے تھے۔ نکالا تو پرلوک سدھار چکے تھے۔ گلی والوں نے بہتیری ڈھارس بندھائی کہ تھوڑی بہت راس ہم لگا دیتے ہیں گلگلوں کی دکان کر لو پر میرا تو جی ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ چار پانچ سال ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھائیں، پھر اس شہر میں آ گیا۔ پہلے نرا چوکیدار تھا پھر چپڑاسی بھی ہو گیا۔ تین روپے مہینے پر لگا تھا۔ اب کان اُڑا تو پندرہ سے بیس روپے ہو گئے۔" پھر بائیں کان والی مُرکی ہاتھ میں پکڑ کر بولا "رام جانے بھئی شریف مجھے کان کے اُڑ جانے سے اتنا دکھ نہیں ہوا جتنا اس کے ساتھ ایسی مُرکی کھو جانے سے۔ مجھے یاد ہے یہ مُرکیاں میری ماتا نے میرے کانوں میں ڈالی تھیں۔" اس کی آواز بھرا سی گئی۔ کچھ دیر ٹھہر کر بولا "ہاں تو بھئی چالیس برس کے لگ بھگ یہاں بیت گئے اسی کمائی میں گزارا کیا، اسی میں سے بچایا۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا "تو تم بچت بھی کرتے ہو لالہ نہ پوت نہ دھی، نہ جانے جوڑتے کس کے لئے ہو؟" چھجو مسکرایا اور بولا "یہ سیڑھی کا پہلا ڈنڈا تو تم چھوڑ ہی گئے بھئی شریف، میں جوڑتا ہوں جورو کی خاطر۔" میں نے کہا "کون ہے تمہاری جورو لالہ؟ کہاں رہتی ہے وہ؟" تو وہ چپ ہو گیا۔ پھر بولا "یہیں کہیں بھگوان کی دھرتی پر پھرتی ہوگی بھئی۔" میں نے پوچھا "تو ناچاقی ہو گئی کوئی؟" چھجو نے ہنس کر کہا "بیاہ ہوا نہیں اور ناچاقی پہلے ہی ہو گئی۔" میں نے کہا "اچھا تو بڈھا گھوڑی چڑھنے کی دھن میں ہے۔" چھجو کھلکھلا کر ہنسا پھر بولا "یہ ٹھٹھے کی بات نہیں ہے شریف، پیسے پلے ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ چودہ سو روپیہ میں نے پہلے جوڑا تھا وہ گوراندتہ لے اڑا۔ ساتھ والے کوارٹر میں رہتا تھا، میرے ساتھ بڑا بھائی چارا ہو گیا اس کا۔ اس کو جانے کیسے پتہ چل گیا اس کا۔ وہاں زمین میں دبایا ہوا تھا۔ ایک صبح اٹھا تو مٹی کی ڈھیری لگی تھی اور گوراندتہ گم تھا۔ اب پھر تین چار ہزار کی پونجی بنائی ہے پر رکھی بینک میں ہے۔" میں نے کہا "چھجو مل تم ہندوؤں میں اتنے پیسے سے بیاہ کہاں ہوتا ہے؟" بولا "ٹھیک کہتے ہو بھئی۔ ہو سکتا تو اب تک ہو نہ جاتا۔ پر میرا دل بولتا ہے کہ میں ایسے نہ مروں گا شریف مجھے وشواش ہے میرے گھر میں استری آئے گی۔" میں نے کہا "کیوں بڑھاپے کے بل نکلوانا چاہتے ہو لالہ؟ اللہ کی قسم کوئی دن نہیں جاتا جب بیوی سے لڑائی نہ ہو میری۔" چھجو بولا "تم بڑے بے سمجھ ہو شریف۔ استری سے بڑھ کر سنسار میں کچھ نہیں۔ استری جیون ساتھی ہے اور اس سے لڑنا پاپ ہے

میں ہنس رہا تھا اور وہ کہتا جا رہا تھا "ایشور کی بڑی دیا ہے تم پر۔ کھتری بدھ ہو تو تم کیا کروگے وہ تو کھتری بچہ ہی کرے گا پر بیاہ بدھ تو تم کر سکتے ہو۔ جتنا چاہو کماؤ خرچ تھوڑا بچاؤ بہت اور جو بچاؤ وہ استری کے ہاتھ پر رکھ دو آپ دکھ اٹھاؤ پر استری کو سکھی رکھو۔ یہ ہے بیاہ بدھ بابو سمجھتے ہو بیاہ بدھ؟" شریف میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"واہ! کیا فلسفہ جھاڑا ہے تیرے چھجو مل نے ملاں!" میں نے ناک چڑھا کر کہا۔

"جھوٹے پر خدا کی مار بابو!" شریف نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا "میں نے چھجو کی بات پر کان دھرا تو گھر بھر نے چین پایا" پھر میز پر پڑے آموں اور بوتلوں کی طرف دیکھ کر بولا "میں اور تم کھانے والے اور اتنے آم! اتنی بوتلیں! بیاہ بدھ کرو بابو۔ نہ کیا تو تمہارا بیاہ نہیں ہوگا یا ہوگا تو نبھے گا نہیں۔"

"چھوڑ اس بکواس کو ملاں!" میں نے جھلا کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو بابو! ایسے کسی کی بات کون مانتا ہے میں نے بھی اس وقت تک نہیں مانا تھا جب تک چھجو مل رام پرتی کو بیاہ کر نہ لے آیا اور اس نے وہ نہ کر دکھایا جو اس نے کہا تھا۔"

"تو کیا سچ مچ چھجو کا بیاہ ہوا شریف؟"

"تو اور کیا جھوٹ موٹ — پر یہ پکی بات ہے بابو کہ اگر اس کے کان پونے دو نہ ہو جاتے تو اس کا بیاہ نہ ہوتا۔"

"وہ کس طرح ملاں؟"

"اس طرح بابو کہ نہ اسے انعام ملتا نہ وہ مجھے حصہ دینے آتا نہ آموں اور سوڈے کا شغل ہوتا نہ وہ اپنی آپ بیتی مجھ سے کہتا نہ میں اس کے بیاہ کا بندوبست کرتا۔"

"تو بیاہ تو نے کروایا اس کا ملاں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں میں نے" شریف نے ہنستے ہوئے کہا "اور اگر تم بیاہ بدھ کرنے لگو بابو تو اللہ کی قسم تمہیں بھی رام پرتی جیسی پوتر استری لا کے دوں۔"

"میں کبھی بیاہ بدھ نہیں کروں گا ملاں مجھے استری نہیں چاہیئے کوئی بل نہیں مجھ میں۔ تو یہ بتا چھجو کے لئے استری کس منڈی سے لے آیا تو؟"

"منڈی سے نہیں سڑک پر سے لایا تھا بابو۔"

"بس ایسے ہی پڑی تھی وہاں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"پڑی کہاں تھی بابو یوں کہو گڑی تھی بالکل سڑک والے تار کے اس کھمبے کی طرح جس کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھی تھی وہ۔ تم کیا جانو کیا کیا جتن کئے اس کے باہر کھینچنے میں اور سچ پوچھو تو پتہ مجھے بھی نہ تھا اتنی گہری جڑیں تھیں اس کی یہ تو چھجو کے جی کا وشواش تھا کہ بات بن گئی۔ اس کی باتوں پر پہلے تو مجھے ہنسی آتی تھی پھر جوں جوں اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بڑھا میرے دل میں اس کی عزت پیدا ہوتی گئی۔ اسی سال سردیوں میں ایک رات مہمانوں کو رخصت کر کے میں سٹیشن سے آ رہا تھا۔ کوئی دس بجے ہوں گے اور ہوا اگرچہ معمولی تھی اور میں کمبل اوڑھے ہوئے تھا پھر بھی میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ جب میں جین مندر کے قریب پہنچا —"

"جین مندر؟ وہ کہاں ہے شریف؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی وہی جو گندے نالے کے کنارے ہے اور جس کے سامنے بہت بڑا بڑ کا درخت ہے۔" شریف نے مجھے سمجھایا۔

"اچھا اچھا وہی جس کے پچھواڑے پوربیوں کی جھونپڑیاں ہیں۔" میں نے پھر کہا۔

"بس وہی بابو! خیر تو میں بڑ کے نیچے پہنچا۔ ایک جھونپڑے میں دیا جل رہا تھا۔ جھونپڑا بہت تنگ تھا۔ ایک چھوٹی سی چارپائی اس میں بچھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اسی چارپائی کے گرد تختوں کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں اور اوپر تختوں کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ باہر پاس ہی ایک عورت سگرٹ پان والا خوانچہ اٹھانے ہی والی تھی۔ جانے اسے دیکھ کر میرے قدم کیوں رُک گئے۔ کہنے لگی "یہ کیوں بھائی کیا پیسے ہگشت کھتم ہو گے پان بیڑی مل جاوے۔" میں نے کہا۔ "تم تو دکان بڑھا رہی ہو بی بی۔ اچھا تو ایک بنڈل بیڑیوں کا دے دو۔" میں نے بیڑی سُلگانے کے لئے ماچس مانگی تو اس نے ٹین کا ڈبہ میرے آگے کر دیا جس کے ڈھکنے کے بیچ والے سوراخ میں سے بڑی رسی کا سُلگتا ہوا سرا لٹک رہا تھا۔ میں نے بیڑی سُلگائی پیسے دے کر اٹھا اور کہا۔ "تیرا بھلا ہو بی بی۔" اس نے خوانچہ زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اپنی تو ایسے ہی گجر جاوے گی بھائی۔ بھلا ہووے تیرا۔" وہ اپنے جھونپڑے میں جا دبکی اور میں کمبل سنبھالتا ہوا گھر کو چلا۔ میں سوچتا آرہا تھا کہ یہ بے چاری اکیلی یہاں رہتی ہے پھر ایسے ہی چھجو کا خیال میرے دل میں آ گیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہو اور وہی گرمیوں کی اتوار والی بات دبی آواز سے میرے کانوں میں بار بار کہہ رہا ہو "میرا دل بولتا ہے شریف میں ایسے نہ مروں گا۔ مجھے وشواش ہے میرے گھر میں استری آئے گی۔" اس رات میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اس پنواڑن پر ہی چھجو کی قسمت آزمائی جائے۔ اگلی صبح چھجو احاطے کے کنوئیں پر آیا تو میں نے اسے رات والے بنڈل میں سے ایک بیڑی نکال کر دی۔ اس نے سُلگائی اور مزے سے پینے لگا۔ میں نے کہا۔ "لالہ! سچ کہو اس میں سے تمہیں اپنی استری کی خوشبو نہیں آتی؟" اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بیڑی کا سُلگتا ہوا سرا اپنی طرف پھیرا اور اس سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو سُونگھ کر بولا۔ "بھئی شریف تم ٹھیک کہتے ہو اس میں ہے تو سہی اس کی مہک۔" میں نے کہا۔ "واہ لالہ چھجو مل جی! استری تو تمہارے اپنے دماغ میں گھسی ہے اور اس کی مہک بتا رہے ہو بیڑی میں۔" کہنے لگا۔ "بھئی شریف آپ ہی تو تم نے پتہ دیا میں سیدھا آدمی ہوں تم نے جو کہا میں نے مان لیا اور پھر کون سی بُری بات تم نے کہہ دی۔" میں نے کہا۔ "بہت اچھا لالہ میں نے پتہ دیا ہے تو میں کچھ نہ کچھ کر کے رہوں گا۔" تو بس بابو میں نے اپنے دل میں بات پکی کر لی۔ دو ایک دن بعد میں جین مندر کی طرف گیا۔ لکڑی کی جھونپڑی تو ویسے ہی بڑ کے نیچے قائم تھی لیکن نہ وہ پنواڑن وہاں تھی نہ اس کی دکان۔ پھر میں نے سڑک کے اس پار دیکھا تو وہ تار کے کھمبے کا سہارا لئے بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا۔ "بی بی اب اِدھر دکان نہیں لگاتی؟" بولی۔ "ارے بھئی جاڑے میں جدھر دھوپ ہووے اُدھر بیٹھ جاویں۔" پھر مجھے غور سے دیکھ کر کہنے لگی "اس رات سگرٹ کھتم تھا آج بہت مل جاوے۔" میں نے سڑک کی پٹڑی پر بیٹھتے اور ہنستے ہوئے کہا۔ "تم تو بہت سیانی ہو بی بی تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "تم سا او کھا گاہک کب آوے بھائی جو جیج کھر یدے اور بھلا چاہوے بھکاری لگو تم تو۔" اور پھر وہ زور زور سے ہنسی اور اس کے سانولے ڈھلکے ہوئے چہرے کی جھرّیاں ہنسی کی لہروں میں ڈوب گئیں۔ میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا پتہ بی بی میں تم سے بھیک بھی مانگ لوں۔" میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے سوچا اس وقت بات آگے بڑھانا ٹھیک نہیں۔ چنانچہ اٹھ کے چلا آیا۔ اگلے دن شام کے بعد میں پھر اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دو ایک گاہک وہاں کھڑے تھے انہیں نپٹا چکی تو مجھ سے کہنے لگی "جاؤ بھائی مجھ گریب کو نا ہیں چھیڑو۔ کل جگ میں ہر کوئی بھلا کہوے اور بُرا چاہوے۔" میں نے کہا

"تم نے مجھ پر شک کیوں کر لیا بی بی! اللہ کی قسم میں بُرا آدمی نہیں ہوں بی بی۔"

"تو نے قسم کھاتے وقت داڑھی پر ہاتھ بھی پھیرا تھا ملّاں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بابو داڑھی ابھی میں نے نہیں رکھی تھی۔ داڑھی ہوتی تو قسم کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"نہیں ملّاں پھر وہ تجھے پاس ہی نہ بیٹھنے دیتی۔"

"چھوڑو بابو میری داڑھی کیوں پکڑ کے بیٹھ گئے تم۔ بڑوں سے یوں نہیں کہتے، خاموشی سے ان کی بات سُنا کرتے ہیں۔ ہاں تو کچھ دیر میں

جان بوجھ کر چپ بیٹھا رہا۔ پھر شاید اسے مجھ پر اعتبار آگیا۔ ایک پان لگا کر اس نے مجھے دیا میں نے پیسے دینے چاہے تو کہنے لگی "یہ کھالیو میرے بھائی۔" میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا "بی بی تمہارا نام کیا ہے؟" بولی "یہ سڑک پر بیٹھنے والوں کا بھی کوئی نام ہووے بھائی؟" پھر خود ہی کہنے لگی "جننے والے رام پرتی کہویں تھے سو رام کی دھرتی پر بیٹھی ہوں بھائی۔" میں نے کہا "بی بی تم اکیلی ہو؟" وہ چپ ہو رہی۔ میں نے پھر کہا "آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم سے بھیک مانگوں — عزت کی بھیک — دیکھو بی بی تم بڑی اچھی ہو تم سڑک پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہو۔" کہنے لگی "واہ بھائی دکھیوں کی ماری سڑک پر بیٹھی تو مجھے یاں پر بھی نہ بیٹھنے دیوے اور کس بھاڑ میں جا پڑوں؟" میں ایک ہی سانس میں کہتا گیا "بھاڑ میں نہیں بی بی گھر میں — میرے دوست جھبو مل کے گھر میں۔ بڑا اچھا آدمی ہے ذات کا کھتری ہے چار پیسے بھی ہیں اس کے پاس اور بس تمہاری عمر کا ہے۔ تم بیاہ کر لو اس سے بی بی تم سڑک پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہو بی بی۔" مجھے یقین ہے بابو اگر میں رُک جاتا تو یہ سب کچھ نہ کہہ سکتا۔ وہ حیران میرا منہ تک رہی تھی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنے کھلے میلے بالوں کی لٹ ہاتھ میں لے کر اور مجھے دکھا کر کہنے لگی "یہ کیا کہویں ہیں ارتھی پر لیٹوں کہ ڈولی میں بیٹھوں۔" میں نے ہنس کر کہا "چلو بی بی تم ڈولی میں نہ بیٹھنا اپنے پاؤں پر چلی جانا ادھر پاس ہی تو ہے لالہ جھبو مل کا گھر۔" مسکرا کر بولی "رام تجھے سمجھے ویسے بھائی اور کیا کہوں ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "لو بی بی میں چلتا ہوں۔ تم سوچنا اس بات کو۔" میں سیدھا جھبو کے پاس پہنچا بابو اور سارا ماجرا اسے سُنایا۔ بولا "بھئی مجھے بھی تو پتہ ہو اس کا۔" میں نے کہا "واہ لالہ کہ گئے جوتوں میں۔ صبر کرو ذرا یہ نہ ہو کہ رام پرتی کے درشنوں کو جاؤ اور چونے کتھے کا بلستر کروا آؤ۔ بس خرچ کے لئے تیار ہو جاؤ تم۔ دکھا دُنا اب اپنی بیاہ بدھو۔" ہنس کے بولا "سب کچھ رام پرتی کے چرنوں میں ڈال دوں گا شریف۔" دو دن بعد میں رام پرتی کے پاس گیا بابو تو کچھ مالٹے لے گیا۔ میں نے سامنے رکھے تو کہنے لگی "انہیں اٹھا لیو بھائی۔" میں نے کہا "تم کہتی ہو گی یہ لالہ جھبو مل نے بھیجے ہیں۔ نہیں نہیں اللہ کی قسم یہ میں نے اپنے پلّے سے خریدے ہیں بابا تم نے مجھ سے پان کے پیسے کیوں نہ لئے تھے اس دن؟" وہ مسکرائی اور چپ رہی۔ میں نے پھر کہا "تم نے میری خاطر کی بی بی میں نے تمہاری اور رہا وہ لالہ جھبو مل والا کام تو وہ تو الگ بات ہے بی بی۔ تمہاری خوشی ہو کرو نہ ہو نہ کرو۔ میں نے جس طرح تم سے بات کی تھی اسی طرح اس سے کہہ دی ہے اس کے جی میں امنگ ہو گی تو آپ پہنچ جائے گا، مجھے اس سے کیا؟" بولی "اے بھائی تُو تو ذرا سی بات پر خفا ہو جاوے۔" میں نے کہا "نہیں بی بی یہ تو سنجوگ کی بات ہے ہونی ہو گی ہو جائے گی میں نے تو تمہارا بھی بھلا سوچا تھا اور لالہ کا بھی۔ اس بیچارے کا گھر سنبھالنے والا کوئی نہیں اور تم یہاں سڑک پر بیٹھی جاڑے، لُو اور برسات کی مار کھاتی ہو۔ اللہ کی قسم بی بی میں تمہاری جگہ ہوتا اور مجھے کوئی ایسی شگن کی بات بتاتا تو میں تو اسی وقت یہ پان بیڑی والا خوانچہ وہاں سڑک کے بیچ دے مارتا اور اس کے ساتھ ہو لیتا۔"

"واہ ملّاں! کیا کہنے تیرے۔ مان لیا آج تجھے۔" میں ہنستے ہنستے دوہرا ہو رہا تھا۔

کہنے لگا "تم کیا ہنستے ہو بابو۔ رام پرتی تو اس بات پر بالکل لوٹ پوٹ ہو گئی۔ پر جس طرح میں نے اسے ہنسایا تھا اسی طرح اس نے مجھے حیران کر دیا بابو۔ بولی "اچھا تو بھائی دیکھ ہی لیویں تیرے لالے کے کس بل۔ ماتھے کا ٹیکا، سر کا چوک، کانوں کی بالیاں اور بندے، ناک کا لونگ بڑے سارے لال نگ والا، گلے کی ہنسلی اور کنٹھی، انگوٹھے کی آرسی، انگلیوں کے چھلّے، ہاتھوں کے کنگن اور گھونگروں والے، پاؤں کے چھلّے اور کڑے لو رچھا نجیں۔ کوئی دس سیر چاندی ہووے یہ سارے۔ یہ اور پانچ دوپٹے گوٹے والے پانچ چولیاں ریشمی، پانچ لہنگے ریشمی۔ یہ سب لا دے پر پہلے اس منگل کو گنج دن چڑھے ادھر سے ہو جاوے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "بہت اچھا بی بی، کہہ دوں گا لالہ جھبو مل سے۔" تو وہ بولی "یہ پان بھی تو لیتا جاوے۔" میں نے ہنس کے کہا "لالے کے لئے دے رہی ہو بی بی؟" کہنے لگی "میں تجھے دے رہی ہوں میرے بھائی تو جسے چاہوے دیوے۔" میں نے پان منہ میں رکھا اور کہا "وہ منگل کو تیرے ہاتھ سے ہی کھائے گا بی بی۔" میں نے آنکھ کے جھجکے سے کہا "لو لالہ آ گئی شبھ گھڑی۔ ہمت ہے تو آ جاؤ لنگر لنگوٹ

کس کر بیدان میں۔ آدھ من چاندی مانگی ہے تمہاری لاڈلی نے۔" چھجو بولا "تم فکر نہ کرو شریف۔ سب کچھ ہو جائے گا بھلا ہوا کہ اس نے سونے کا نام نہ لیا۔" میں نے کہا "اور پانچ جوڑے بھی تو مانگے ہیں اس نے ریشمی چولیاں اور ریشمی گھگرے۔ خیر ہے پوربیوں کی نسل سے ہے تمہاری وہ مسٹر اللہ۔" چھجو کچھ سوچ کر بولا "بن جائیں گے وہ بھی شریف۔" میں نے کہا "دیکھا لالہ یوں صاف کرتی ہے استری۔ اکٹھی گئی نا ساری پونجی؟" کہنے لگا۔۔ "نہیں بھئی کچھ نہ کچھ رہے گا اور نہ بھی بچے تو کیا ہے شریف میں نے تو جوڑا ہی اس کارن تھا۔" میں نے کہا "اور بھئی کسی دن دیکھ بھی تو آؤ تم اسے۔ پر دیکھو اس پوتے کان کو کس طرح پورا کرو گے؟" لالہ ہنس کے بولا "اس سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے جواب دیا "واہ لالہ اس سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اس سے بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ سنو اس دن تم یہ کھدر کی ٹوپی نہ پہننا، ململ کی بڑی سی پگڑی باندھنا اور وہ نوں کان اس میں لپیٹ لینا۔" کہنے لگا "ہاں بھئی بات تو ٹھیک ہے تمہاری۔" تو بابو منگل کے دن کوئی دس بجے چھجو اور میں چلے۔ وہ کیسری پگڑی اور لٹھے کی قمیص اور واسکٹ اور تنگ پاجامے میں بڑا رعب والا آدمی لگتا تھا۔ جین مندر کے پاس پہنچے تو میں نے کہا "دیکھو لالہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دینا وہاں۔ رام پرکتی کو بالکل پتہ نہ چلے کہ تم چھجو مل ہو اور اسے دیکھنے آئے ہو ورنہ سارا کیا کرایا دھرا رہ جائے گا۔" ہم وہاں پہنچے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں بابو۔ رام پرکتی نہائی دھوئی اچھے ستھرے کپڑے پہنے ہاتھوں میں کڑے اور گلے میں منسلی ڈالے بڑے ٹھاٹھ سے تار کے کھمبے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کینچلی بدل آئی ہو۔ اس کی نظر ہم پر پڑی تو اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ کیا کہوں اس لمحے اس کے چہرے کی کیا کیفیت تھی بابو۔ جوانی کے اتھاہ ساگر تو کئی بار ٹھاٹھیں مارتے دیکھے تھے پر بڑھاپے کے شوکتے سمندر میں جوار بھاٹا اُٹھتے کب دیکھا تھا۔ میں نے اجنبیوں کی طرح اس سے کہا "دو پان لگا دو مائی اور دو ڈبیاں قینچی کی دے دو۔" اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں نے جھٹ کہا "ذرا جلدی کر دو بی بی ہمیں بہت ضروری کام ہے۔" تو مسکرا کر بولی "جوروری کام چلے کر آویں بھائی۔" چھجو پیسے گن رہا تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گھبراہٹ میں اس نے ایک دونی زیادہ دے دی تو رام پرکتی نے مسکرا کر سڑک پر پھینک دی اور بولی "بہت پیسے ہو ویں؟" چھجو نے جلدی سے اٹھائی اور ہم چل دیئے۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اسے رام پرکتی کے چہرے پر دوسری نظر ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ میں نے کہا "لالہ کیا ہو گیا تمہیں۔ پیسے گننا بھی بھول گئے آج تو۔ اتنا سخت دورہ پڑا بیاہ بڈھے کا۔" بولا "ہاں بھئی ایسا ہی ہو سکے ہے جلدی سے سر بندھ کرو تم۔ بڑی دیا ہو گی تمہاری۔" میں نے کہا "وہ بھی تمہیں دیکھے گی لالہ چھجو مل۔ اسے کیا پتہ تم کون ہو۔" وہ پریشان ہو کر کہنے لگا "نا بھئی یہ نہ ہو۔" میں نے کہا "کیوں لالہ اپنی باری آئی تو جان نکلنے لگی۔ ہے نا؟" بولا "ہاں بھئی جان کیوں نہ نکلے ڈر ہے کہیں نانہ کر دے۔" میں نے ایک پر زور قہقہہ لگایا اور کہا "واہ لالہ تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی کیا تم نے مجھ سے پوچھا ہوتا کہ بھئی شریف یہ جو مجھے آج ہی دولھا بنا کے ساتھ لے چلے ہو اگر رام پرکتی کو میرا پتہ نہ ہوگا تو اس کا کیا فائدہ؟" چھجو بڑی سادگی سے بولا "تو کیا ہوا بھئی چل اب بتا دو تم اس کا فائدہ۔" اور بابو کچھ نہ پوچھو میں کتنا ہنسا۔"

"مگر تو نے جھوٹ کیوں بولا شریف؟" میں نے پوچھا۔

"بس یونہی چھیڑ چھاڑ۔ مجھے پتہ تھا کہ چھجو بالکل بدحواس ہو گیا ہے۔ پر رام پرکتی سے جو شرارت میں نے کی وہ مجھے بہت مہنگی پڑی بابو۔"

"کیا؟ کیسے؟" میں متوجہ ہوا۔

"میں اسی شام اس سے ملا۔ میں نے ہنس کر کہا "بی بی تمہیں ایسی سج دھج نکالنی تھی تو پہلے کہہ دیتیں مجھ سے میں چھجو مل کو بتا دیتا کہ تمہیں رام پرکتی سے ملانے جا رہا ہوں اسے تو پتہ ہی نہ تھا تمہارا۔" اس کے چہرے پر حیرانی اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ بولی "واہ بھائی کوئی سادی بات بھی کہی جاوے۔" میں نے کہا "تو چلو جس دن تم کہو میں اسے پھر لے آؤں گا اور تم پہلے سے بھی زیادہ بن ٹھن کر بیٹھنا۔" کہنے لگی "کیسی باتیں کرے ہے تو بھائی۔ کوئی جرورت نہیں اس کی اب۔" میں نے پوچھا "کیوں؟" میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بولی "تیرا لالہ تو بہت

بڈھا ہے گا۔" میں نے کہا۔ "گیا کہہ رہی ہو بی بی بالکل تمہاری عمر کا ہے وہ تو" کہنے لگی: "رام کا نام لو بھائی اس کے تو ہاتھ کانپیں آنکھوں سے دکھے ناہیں۔ پیسے ناہیں گنے جاویں۔"

"پنواڑن نے تجھے چکرا دیا ملّاں۔" میں نے کہا۔

"بالکل چکرا دیا بابو۔ پر میری سمجھ نے کام کیا اور میں بے تحاشا ہنسا اور ہنستا ہی گیا اور وہ میرا منہ تکتی رہی۔ بولی: "اتنا نہ ہنسیں بھائی۔" میں نے کہا: "میں نے تو دل لگی کی ہے تمہارے ساتھ بی بی۔ لالہ چھجو مل کو سب پتہ تھا اور اسی لئے تو اس کے اوسان ٹھیک نہ تھے۔ نہیں تو کھتری بچہ اور پیسے گننے بھول جاوے۔" جھٹ بول اٹھی: "تو کیا کہوے وہ؟" میں نے کہا: "وہ کیا کہوے بے چارہ وہ تو تم پر بے طرح ریجھ گیا ہے بی بی کہتا ہے ابھی اسی گھڑی ہو جاوے یہ کام۔" مسکرائی اور کہنے لگی: "اچھا بھائی جو رام کرے سو ہووے کہہ دے اس سے جہیں بنوا لیوے۔"

"تو بس پھر بیاہ ہو گیا چھجو مل اور رام پرتی کا؟" میں نے کہا۔

"ابھی کہاں بابو سب سے کٹھن منزل تو اب آئی ہے۔ رام پرتی کے مشورے سے ایک مہینہ بعد ایک اتوار کو بیاہ ہونا قرار پایا۔ چھجو مل نے ایک پروہت سے بات کر لی۔ طے یہ ہوا کہ ادھر سے چھجو مل، پریس کا ایک اور چپڑاسی چونی لال اور دو چوکیدار جگو اور سنتا اور ادھر سے رام پرتی پروہت کے گھر پہنچ جاتے وہیں بیاہ کی رسم ادا ہوا اور وہیں سے رام پرتی رخصت ہو کر اپنے پتی کے ساتھ آ جاتے۔ چنانچہ میں نے ایک دن رام پرتی کو پروہت کا گھر دکھا دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اب پیچھے ہٹ جاؤں۔ کیونکہ اب سوائے ایک مذہبی رسم کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ مگر چھجو کہتا تھا شریف یہ نہیں ہو سکتا کہ سب کچھ کرا کے تم الگ ہو جاؤ تمہیں پروہت کے گھر چلنا ہو گا۔ خیر تو بابو مقررہ دن آیا اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ چھجو پہلے والی کیسری پگڑی باندھے ہوئے تھا اور سفید قمیص پر گلابی رنگ کی ریشمی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ آدھ پون گھنٹہ بیٹھے رہے رام پرتی نہ آئی۔ میں اور چھجو باہر گلی میں آ کے کھڑے ہو گئے اور اس کی راہ دیکھنے لگے۔ آخر کار وہ آئی لیکن اس کے ساتھ ایک اور عورت تھی وہ بھی پوربی قبیلے سے ہی معلوم ہوتی تھی۔ وہ باتیں کرتی کرتی ہمارے پاس آ گئی: "پندرہ روپئے بہت ناہیں سانتی کھو بچا بھی کھاٹ بھی کٹیا بھی سبھی کچھ۔" پرتی کہہ رہی تھی۔ شانتی بولی: "ناہیں پرتی دس روپئے دیوں ہیں تو۔" پرتی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے گھگرے کے ناڑے سے گنجی کھولی اور لے سے شانتی کے ہاتھ پر رکھ کر بولی: "لے پھر پر پندرہ دن کے بیچ روپئے آ جاویں سانتی۔" اور شانتی نے کہا: "ضرور آ جاویں پرتی۔" شانتی جانے کو ہی تھی کہ چھجو بولا: "شانتی! ٹھہرو منہ میٹھا کرتی جاؤ تم بھی۔" شانتی جھٹ مڑی اور پرتی سے پہلے مکان کے اندر تھی۔ چھجو نے لڈوؤں کی ایک تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔ پھر گہنے اور کپڑوں والا صندوق کھول کر پرتی سے کہنے لگا: "جو اچھے لگتے ہیں پہن لو پرتی۔" شانتی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی پھر ہنس کے بولی: "ہوں یہ تو سب اچھے لگیں بھائی سبھی پہن لیوے پرتی۔" پھر اس نے جلدی سے لڈوؤں والی تھالی میلی اوڑھنی کے پلو میں الٹی اور چلی گئی۔ ہم پروہت کے کمرے میں چلے گئے اور وہ کپڑے بدلنے لگی۔ آخر وہ چھم چھم کرتی گھونگھٹ کئے آ گئی اور چھجو کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ پروہت نے منتر پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ باہر گلی میں شور و غوغا سنائی دیا۔ جگو، سنتا، چونی لال اور میں دروازے کی طرف لپکے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پندرہ بیس پوربئے ننگے سر ننگے پاؤں دھوتیاں ٹانگے لاٹھیاں ڈنڈے لئے گلی میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر یوں دوڑ رہے ہیں جیسے باؤلے کتے کی تلاش میں ہوں پھر میں نے ایک طرف شانتی کو کھڑے دیکھا اس نے ہماری جانب انگلی اٹھائی تو وہ سارے اِدھر پل پڑے: "یہ کدھر ہووے پرتی؟" "پکڑ لو کتیا کو۔" وہ للکار رہے تھے۔ ہم نے جھٹ دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ پروہت کے دم میں دم نہ آتا تھا اس کو سب منتر و نتر بھول گئے تھے اور چھجو سے کہہ رہا تھا: "کیا بات ہے لالہ؟ تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا ہے ان کا؟" چھجو کھڑا کانپ رہا تھا اور اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میں نے کہا: "کچھ پتہ نہیں پنڈت جی کیا بات ہے۔" اچانک رام پرتی اٹھی اس نے گھونگھٹ اٹھا دیا اور ہم سے کہنے لگی: "ہٹ جاویں جرا۔" اس نے اطمینان سے

دروازہ کھولا اور دہلیز سے اتر کر دروازے کے سب سے اوپر والے زینے پر کھڑی ہو گئی۔ سارے پوربیے لٹھ اٹھائے نیچے گلی میں اس کے گرد اکٹھے ہو گئے اور دائیں بائیں مکانوں سے لوگ نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ آسنے جانے والوں کی ایک بھیڑ وہاں لگ گئی۔ رام پرتی گوٹے والا کیسری دوپٹہ، ہری ریشمی چولی اور لال ریشمی لہنگا اور بیروں چاندی کا گہنا پہنے بوڑھی مہارانی کی مانند کھڑی تھی اور اس کے پیچھے دائیں بائیں ہم درباریوں کی طرح دم بخود کھڑے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش سامنے ہجوم کا منہ تکتی رہی آخر "بیٹھو"، "پکڑیو"، "پرتی کتیا" کا شور ختم ہوا اور اس نے اونچی لیکن نرم آواز میں کہا: "کون ہیں گے تم؟" اس کے پاس ہی نیچے سے ایک پوربیا بولا: "تیری برادری!" پرتی نے پوچھا: "برادری کا چودھری کدھر ہو وے؟" اسی آدمی نے پکارا: "گنگو! چودھری! گنگو!" تو ایک بوڑھا لیکن خاصے مضبوط جسم کا آدمی سر سے ننگا ہاتھ میں ڈنڈا لئے آگے کھڑا ہو گیا۔ پرتی نے اس سے کہا: "تو ہو وے ان کا چودھری؟" گنگو بولا: "تجھے کھبر ہے گی پرتی میں ہی ہیں گا برادری کا چودھری۔" پرتی نے کہا: "تو انہیں کیوں لاوے اِدھر گنگو؟" گنگو نے جواب دیا: "سانتی کھوے تو بیاہ کرے اور برادری سے پوچھے تک ناہیں۔" پرتی بولی "برادری کو وہ پوچھے گنگو جسے برادری پوچھے۔ بائیس برس گجر جاویں مجھے سڑک پر بیٹھے اور برادری بہری کھبر نہ لیوے میں کیا جانوں برادری کیا ہو وے۔ دُور کی کیا کہوں ابھی پار سال مجھے تپ آوے تین مہینے کھاٹ سے نہ اٹھوں ہیں کوئی مجھے پوچھنے نہ آوے گنگو۔ نہ برادری نہ چودھری۔" گنگو بولا: "تو کھبر نہ دیوے پرتی تو، دوس کس کا؟" پرتی کچھ تلخ ہو کر بولی: "سرم نہ آوے تجھے گنگو برادری لئے دوڑا آوے آج کون بلاوے تجھے اِدھر؟ کون کھبر دیوے؟ اور دن کی نہ کہوں چودھری کی کہوں، چھوکریوں کے بیاہ رچاوے تو، پتر کی منگنی کی کھسی مناوے باجا بجواوے، رنڈی نچواوے مٹھائی بٹواوے پرتی کو کبھی نہ پوچھے تو۔ کس منہ سے اِدھر لے آوے تو انہیں لٹھ اٹھواوے۔ کیا چاہوے تو؟ میرا سر پھڑواوے؟" اس نے دوپٹہ اتار کر گنگو کے سامنے سر جھکا دیا: "لے بڈا سو رہا ہے گا تو مار دے ڈنڈا۔ دیکھے کیا ہے مارے کیوں ناہیں؟" گنگو ہماری طرف اشارہ کر کے بولا: "تیرا سر ناہیں پھوڑیں، ان کا پھوڑیں جو برادری کی بے اِجی کر واویں۔" پھر پتہ نہیں پرتی کو کیا ہوا بابو۔ وہ غصے سے کانپنے لگی اور بجلی کی طرح کڑک کر بولی: "چوراُچکے بے سرم تو اِجت کی بات کرے ہے میں اٹھارہ برس کی بھولی کنیا ہوؤں تو آٹھ من کو لالے کر ریل کے جمعدار سے میری اِجت کھراب کروا دے، تیری لٹھ باج برادری اس بات کو جانے پر اس کے ہاتھ ناہیں اٹھیں۔ کیوں؟ جمعدار انہیں ٹیشن سے گرا پڑا کو لا چھیننے دیوے تھا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی: "میری بدھوا میا روتی سر پیٹتی بال نوچتی تیرا سیا پا کرتی پھرے تو تیرے کہنے پر وہی کتا جمعدار لے سے تلیوں سے کٹوا کر ریل کی لین پر ڈلوا دے اور تو برادری سے کہوے لاجو کو لے چھنتی گاڈی تلے آگئی۔ کدھر ہو وے وہ سانتی کتیا جو تیری جورو تجھے یہ اجت کہانی سناوے تھی؟" گنگو سر جھکائے کھڑا تھا اس کے سوا سب پوربیوں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا لیکن شانتی وہاں نہ تھی۔ پھر ہاتھوں کے پنجے آگے بڑھائے وہ زینے سے اُتر کر یوں گنگو کی طرف لپکی جیسے اس کی آنکھیں نکال لے گی: "اِجت کے ڈاکو! تیرے اور تیری برادری کے کولے کا بوجھ پیٹ سے اتارتے پرتی پر لوک سے ہو مُڈی۔ کتنے! وہ یوں ہی تو ناہیں دنیا تیاگ کے سڑک پر بیٹھ جاوے تھی۔ میں کیا جانوں تجھے اور تیری برادری کو۔" پھر خود ہی کہنے لگی: "ناہیں ناہیں میں تجھے بھی کھوب جانوں تیری برادری کو بھی کھوب جانوں۔ کتے گو نہ کھانے آ ئیں ہیں اِدھر۔" پھر اس نے اپنی چولی کے اندر سے ایک تھیلی نکال کر گنگو کی چھاتی پر دے ماری: "یہ لے۔ تیس روپے ہیں گے اس میں۔ کئی من کولا آجاوے ان کا۔ جا دال بھات بنوا آپ بھی کھا ان کو بھی دے۔ جانا اب جاوے کیوں ناہیں۔ پوچھ لیا ہے گا برادری سے اب تو۔ یہ دال بھات ہی تو سارے لٹھ اٹھوا دے۔" اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میں اور چونی لال اسے بازوؤں سے پکڑ کر اوپر کے زینے پر لے آئے۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی سسکیاں بھرتی رہی پھر خاموش ہو گئی اور اندر آکر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ پوربیوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی اور وہ ڈنڈے لٹکائے آہستہ آہستہ کھسکنے لگے تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔ پروہت جلدی جلدی اپنی پوتھیاں سنبھالنے لگا۔ پھر عینک میں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے بولا: "یہ استری تو بڑی

پاپن ہے۔ رام رام رام رام۔ یہ بھی، اس سے بیاہ کرتے والا بھی، اس کا بیاہ کرانے والا بھی سب نرک میں جاویں ہے رام ہے رام۔ چلے جاؤ لالہ یہاں سے۔ مہاپاپ ہے یہ کام تو۔ سب کا دھرم بھرشٹ ہو جاوے اس سے۔ رام رام رام۔" رام پرکتی نے میری طرف دیکھا میں نے چھجو کی طرف۔ پرکتی کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔ مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔ "اتا پاپ نہ ہووے بھائی میں ابھی کٹیا کا تالا جا توڑوں ساتنی سے پیسہ ناہیں لیوں گی میں۔" پھر دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ تماری چیجیں اتار دیوں اُدھر۔" ایک بار پھر میں نے چھجو کی طرف دیکھا اور اس نے میری طرف۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے بڑھ کے رام پرکتی کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ "ہم دونوں نرک میں جائیں گے پرکتی۔ تم میرے ساتھ رہو گی اب۔" چونی، سنتا، جگو اور میں آبدیدہ ہو گئے تھے اور پروہت حیران کھڑا تھا۔"

"واہ بھئی شریف دل ہلا دیا تیری رام پرکتی کی کہانی نے۔" میں بے اختیار کہہ اٹھا۔

"اس کے بعد تو سال چھجو مل جیا بابو۔ وہ بیڑا اس نے رام پرکتی کی کہ کہئے تو جھوٹ لگے۔ پرکتی مزاج کی ذرا تلخ تھی کوئی سخت بات بھی کہہ دیتی تو چھجو مسکرا کر چپ ہو رہتا۔ وہ میری پاس دوڑی آتی اور اونچی آواز سے کہتی۔ "ارے بھائی سریف او بھائی سریف یہ کیا بڈھا ڈھور تو میرے پلّے باندھ دیوے یہ گونگا ہووے یہ بہرہ ہووے میں جیکیھوں او ریہ بولے بھی ناہیں۔" کبھی کبھی چھجو کی موجودگی میں ہنس کے کہتی۔ "رام جانے سریف میں اس کا کان دیکھ لیوں تو کبھی اس کے گھر نہ آؤں۔" تو وہ مسکرا کر ہاتھ سے دایاں کان ڈھانپ لیتا۔ مرنے سے پہلے چھجو ڈھائی مہینے کھاٹ پر پڑا رہا تم یقین جانا بابو پرکتی کو اپنے آپ کی سدھ بدھ نہ رہی کھانا پینا تک چھوٹ گیا تھا اس کا۔ ہاتھ پاؤں گلے سے گہنا اتار اتار کر اس نے چھجو پر لگا دیا۔ چھجو مر گیا تو بیس کا مالک لالہ جیا رام کھوسلہ رام پرکتی کو اپنے گھر لے گیا۔ چھوٹا موٹا کام کر چھوڑتی تھی اور روٹی کپڑا مل جاتا تھا۔ مگر ڈیڑھ سال بعد ہی چھجو مل سے جا ملی پتہ نہیں نرک میں کہ سورگ میں۔"

"وہ جہاں بھی ہوں گے وہیں سورگ ہوگا شریف۔" میں نے کہا۔

"دیکھا بابو یہ پھل ہے بیاہ بُدھ کا۔ اب بتاؤ یہ ایک درجن بوتلیں اور یہ آدھ من آم دو آدمیوں کے لئے ہیں کہ محلے بھر کے لئے؟"

"چھوڑ ملّاں اس بیاہ بدھ کو۔ یہ تو نری بکواس ہے۔ چھجو کی بات کوئی اس سے بنی۔ وہ تو سب اس کے جی کا وشواش تھا۔ یہ لے پی ایک اور بوتل اور کھا اور آم تیرا حلق سوکھ رہا ہے اب۔" میں نے بوتل اور آموں والی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

تیسرا سگرٹ

بلونت سنگھ

جب دیوراج نے دیکھا کہ سب ہمہ تن گوش بنے بیٹھے ہیں تو اس نے مُنہ قدرے اُوپر کو اُٹھا کر سگرٹ کا دھواں ایک فرّاٹے کے ساتھ چھوڑنا شروع کیا۔ . اور ہم اس کے گول مُنہ میں سے دُھواں تیزی سے نکلتے اور فضا میں تحلیل ہوتے دیکھتے رہے . . .

یہ اس کی مخصوص عادت تھی کہ بات شروع کی اور جب دوست متوجہ ہوتے تو وہ اپنی داستان میں بڑے طویل وقفے پیدا کرنے لگتا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید سامعین کے شوق کو تیز سے تیز تر کرنا مقصود ہو یا شاید وہ پُرانی فضا میں کھو جانا چاہتا تھا یا ان وقفوں میں تفصیلات فراہم کرتا تھا، مقصد خواہ کچھ بھی ہو لیکن ہمیں یہ وقفے بُرے نہیں لگتے تھے۔ اس سے ملاقات اکثر کافی ہاؤس ہی میں ہوتی تھی۔ کافی ہاؤس میں بیٹھنے کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا یعنی فرصت کے لمحات کو گزارنا۔

اس وقت کافی ہاؤس میں خاصا شور مچا ہُوا تھا، دیوراج کے خوبصورت گول چہرے پہ ذہنی اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ اور اس نے ہم سب کی جانب متوجہ ہو کر کہا "یار! بہت شور ہو رہا ہے!"

ہم سب نے ہامی بھری لیکن ہماری صورتوں سے اس پہ واضح ہو گیا کہ باوجود شور کے ہماری دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اس کے دل کو تسکین سی حاصل ہوئی اور اُس نے سلسلہ کلام جاری کیا "یہ دسمبر ۱۹۴۵ء کا قصّہ ہے۔ میں بیکار تھا۔ تم لوگ جانتے ہی ہو کہ پہلے میں خوب مزے میں تھا۔ لیکن اب کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بھی کبھی کبھی تو فیٹ FATE قسمت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ حالانکہ کئی بااثر حضرات سے مراسم تھے لیکن حرفِ مدعا زبان تک لاتے ہوئے ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ اور ایک آدھ دوست جن سے کوئی پردہ نہیں تھا کوشش میں مصروف تھے۔ ابھی روزگار کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کہ ایک دن کناٹ پیلس میں ایک پرانے ہم جماعت سے ملاقات ہو گئی . . . یہ بجائے خود ایک دلچسپ واقعہ ہے!"

یہاں تک پہنچ کر اس نے پھر تامل کیا پھر ایک طویل کش لے سیٹی بجانے کے انداز سے اس نے ہونٹوں کو گول کیا اور ان میں

سے دھواں چھوڑنا شروع کر دیا۔

دُھواں نکلتا رہا۔ وہ اپنے دھیان میں اور ہم اپنی کرسیوں میں مگن۔

بات پھر شروع ہوئی... "میں ریستوران میں بیٹھا تھا ...... ریستوران کا نام جان کر کیا کریں گے آپ ...... اور نہ ہی اپنے دوست کا نام بتاؤں گا... وہ سی۔آئی۔ڈی کے اینٹی کرپشن محکمے میں ملازم تھا۔ خیر! اب وہ واقعہ سُنئے!... ریستوران کے گوشے میں مَیں نے ایک نہایت حسین خاتون کو دیکھا۔ حسین صورت کو دیکھنا کوئی جُرم تو نہیں لیکن مسلسل دیکھتے رہنا یقیناً معیوب ہے...... ہُوا یہ کہ میں مالی اُلجھنوں میں گرفتار تھا... میرے ذہن نے اس حسینہ کے وجود کا احساس تو ترود کیا لیکن مَیں اس وقت دوسرے ہی موڈ میں تھا۔ مجھے خوبصورت لڑکیوں سے اس وقت قطعاً کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو سکتی تھی البتہ میری نگاہ بظاہر اُسی طرف جمی رہی اور ذہن نظارگی کے لطف سے خالی تھا... عورت کو یوں محسوس ہُوا کہ میں بیہودہ پن سے مسلسل اس کی جانب گھور رہا ہوں۔ اس نے اس امر کی اطلاع پاس بیٹھے ہوئے اپنے خاوند کو دی۔ اس نے مجھے گھور گھور کر دیکھا لیکن میں چونکہ خالی الذہن تھا اس لئے میری ٹکٹکی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس پر وہ اُٹھا اور قریب آکر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو اپنے سامنے ایک خشمگیں چہرہ پایا۔ ناک کے نُسخے کی وجہ سے وہ اور بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ سمجھ نہ پایا۔ بے اختیار کہا "تشریف رکھیئے" میں نے اثبات میں جواب دیا اور ساتھ ہی اسے پہچان لیا۔ ہم کئی برس کے وقفے بعد ملے تھے چنانچہ بڑا پُرتپاک معانقہ ہُوا اور وہ مجھے اپنی بغل میں لئے بیوی کے پاس پہنچا اور قہقہہ لگا کر بولا، بھئی یہ اپنا دیو راج ہے۔ "دیکھو یار! یہ تمہاری بھاوج ہے، دیکھنا ہے تو ترتیب سے دیکھو۔ میں اس پر شرمایا۔ اس کی بیوی نہ صرف حسین اور پڑھی لکھی تھی بلکہ سچ مچ باذوق خاتون تھی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا" اس میں تو شبہ نہیں کہ آپ قابلِ دید ہیں لیکن یقین کیجئے، میں اپنی اُلجھنوں میں گرفتار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا چہرہ آپ کی جانب تھا ——" بھئی میں یقین کرتا ہوں" میرے دوست نے حامی بھری۔ "ارے ہم نے کالج میں بھی کئی رومانس لڑائے لیکن دیو راج بچارا تو خود ہی نصف لڑکی تھا حسینوں سے آنکھیں چار ہوتے ہی شرمانے میں پہل انھیں کی طرف سے ہوتی تھی' —— اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے "

اب پھر وقفہ —— لیکن اس وقفے میں ہم اس دلچسپ حادثے پر قہقہے لگاتے رہے اور دیو راج کو دُھواں اُڑانے کیلئے آزاد چھوڑ دیا۔

" کچھ دنوں کے بعد پھر میری اپنے اسی دوست سے ملاقات ہوئی۔ اب ہم دونوں تنہا تھے۔ ارادہ یہ ہُوا کہ دوپہر کا ٹائم بیئر پینے میں گزارا جائے" دیو راج نے پھر اپنا قصہ جاری کیا۔ "بیئر کے دو دو مگ ختم ہو گئے تو میرے دوست نے میری بیکاری کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کی۔ میں ہچکچا رہا تھا لیکن اسے اصرار تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ سارے حالات سُن کر اس نے ذرا تامل کیا اور پھر کہا یار! تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خواہ مخواہ شرافت سے کام نہ لینا۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی۔ اس نے کہا" دیکھو جہاں تم رہتے ہو وہیں پر سیٹھ دھنی رام کی کوٹھی ہے۔ تم نے ان کی کالی بھجنگ صورت اکثر دیکھی ہو گی۔ بلکہ شاید تمہاری کبھی ان سے علیک سلیک بھی ہو جاتی ہو۔ ہمارے محکمے کو قابلِ اعتبار ذرائع سے علم ہُوا ہے کہ وہ ربر گُڈز میں بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے۔ اور اس دھندے میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا ہے اس نے۔ اب اگر تم ذرا اپنی روایتی شرافت کو چھوڑ کر کمرِ ہمت باندھو تو آم کے آم گٹھلیوں کے دام حاصل کر سکتے ہو" —— مجھے بڑا تعجب ہُوا پوچھا کہ آخر میں کیا کر سکتا ہوں؟"——

"دوست تم بھی ایک بار بلیک مارکٹنگ کر ڈالو"

"وہ کیسے؟"

"وہ میں بتاتا ہوں۔ ... سیٹھ جی اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ تم انھیں کے محلے کے نہایت شریف بال بچے دار انسان ہو۔ تم ایک روز ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ تم ان کی مدد سے روزگار شروع کرنا چاہتے ہو۔ کہہ دینا کہ پندرہ بیس ہزار روپیہ تمہارے پاس ہے۔ اگر یقینی فائدے کی صورت نظر آئے تو اتنا ہی روپیہ تم اور اکٹھا کر سکتے ہو ــــ اس کو تم پر شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ راضی ہو جائے گا۔ . بس پھر چاندی ہی چاندی سمجھو۔ ..."

میرے ہونٹوں پر خشک ہنسی پیدا ہوئی۔ کہا "تم بھی گمن چکر دں کی سی باتیں کرتے ہو۔ واہ پندرہ بیس ہزار کی بھی خوب کہی .... یہاں میرے پاس پندرہ بیس کوڑیاں بھی نہیں ہیں ..."

میرے دوست نے بے صبری سے مجھے ٹوکا "ارے تم کچھ نہیں سمجھے۔ مگر تم تو مجھے بات ختم ہی نہیں کرنے دیتے ... رُپے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس زبانی بات چیت ہو جائے۔ . لیکن اب اصل بات سنو۔ ایک الگ تھلگ مکان کا انتظام کیا جائے۔ کچھ شراب ہو، نوجوان لڑکی ہو۔ کھانے پینے کا سامان ہو۔ وہاں سیٹھ صاحب کو بلا لاؤ۔ کہنا کہ میرے ایک دوست کا مکان ہے جو بال بچوں سمیت کسی کی شادی پر چند روز کے لئے باہر چلے گئے ہیں"

"یار! نہ جانے میں پاگل ہوں یا تم۔ آخر یہ شراب۔ کھانے کا سامان اور پھر ایک نوجوان لڑکی .... میں یہ چیزیں کہاں سے لاؤں گا۔"

"اس کا انتظام ہم کریں گے"

"اچھا اب سمجھا۔ . پھر کیا ہو گا"

"ہو گا یہ کہ تھوڑی سی شراب پی کر وہ تم سے کھل جائے گا۔ کاروباری بات چیت صاف صاف ہو جائے گی۔ اور یہ ساری بات چیت ہم ساتھ والے کمرے میں ریکارڈ کر لیں گے۔ مجرم خود جال میں پھنس جائے گا۔ . . ."

"یعنی تم سچ مچ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ مانا اس الف لیلہ کی کہانی کی سب چڑیں ٹھیک بیٹھ جائیں تو پھر مجھے کیا حاصل ہو گا؟"

"وہ بھی سنو۔ سیٹھ جی پھنس جائیں تو تم ان سے کہنا کہ اگر دس ہزار روپیہ دلوائیے تو معاملہ رفع دفع کروا دونگا!"

"اچھا تو روپیہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے۔"

"ارے نہیں چھوڑیں گے نہیں۔ . سی۔ آئی۔ ڈی ایسے بدمعاشوں کو چھوڑ نہیں سکتی۔ نہ میں اس رُپے میں کچھ لوں گا وہ تو محض تمہاری جیب میں جائے گا"

میں نے جھینپ کر جواب دیا "معاف کرو دوست مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا"

اس پر میرے دوست کو غصہ آیا بولا "دیکھو اس قسم کے لوگ پبلک کے دشمن ہیں۔ انھوں نے ملک کو جو نقصان پہنچایا ہے تم اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتے۔ ان کو سزا دلوانا تو ایسا ہی ہے جیسے طاعون کے چوہوں کو ہلاک کرنا" میں نے کہا "یہ سب ٹھیک ہے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں لیکن میں کسی سے ٹھگی کرنے کو تیار نہیں ہوں"

"بھئی یہ ٹھگی نہیں۔ یہ تمہارا حق ہے۔ محنت کا حق۔ ہم کو دیکھو ہم پبلک کے دشمنوں کو جکمہ دے کر گرفتار کرتے ہیں اور

حکومت ہم کو تنخواہیں دیتی ہے۔ بھئی اگر تمھارا حق محنت مجرم ہی کی جیب سے نکل آئے تو اس میں بُرائی ہی کیا ہے، غرض میرے دوست نے عملی دُنیا کے نشیب و فراز اس انداز سے سمجھائے کہ مجھے آخر کہنا پڑا "لیکن دوست یہ تو سوچو کہ میں اس قسم کی تکڑم بازی میں بالکل ہی کورا ہوں بھلا مجھ میں اتنی چالاکی کہاں کہ اتنی لمبی چوڑی اسکیم کو کامیاب بنا سکوں۔"

"تم لمبی چوڑی اسکیم کی بات کو چھوڑو۔ پہلے تو تمھیں سیٹھ کے پاس جا کر اسے دعوت دینی ہے۔ سمجھے؟"

میں اس کے دلائل کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ لیکن میں نے سوچا کہ اس کے کہنے سے میں سیٹھ کے پاس چلا جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سیٹھ میرے جال میں نہیں پھنسے گا . . . کیوں کہ میں اس معاملے میں بالکل اُلو تھا۔ بس یہیں پر بات ختم ہو جائے گی۔"

پھر دیوراج نے تامل کیا۔ ہمیں اس کی داستان میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ مگر ہم ان وقفوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ہم سب نے ایک ایک سگرٹ جلا لیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر اس نے پھر کہنا شروع کیا — "میں دوسری شام سیٹھ جی کے وہاں پہنچا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا، آواز تک کانپ رہی تھی لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ سیٹھ جی نے بڑی آسانی سے میری دعوت قبول کر لی۔ ان کے دعوت قبول کرنے سے مجھے خوشی ہونے کی بجائے اور پریشانی ہوئی۔"

"جب میرے دوست نے میری کامیابی کے بارے میں سُنا تو اُچھل پڑا بولا 'بس اب پو بارہ سمجھو'۔

"میں نے مری ہوئی آواز میں کہا 'یار یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا'۔

'ارے بھئی! اب کون کام باقی رہ گیا ہے۔ میں تمھیں چند سوال اور چند نکتے سمجھا دوں گا بس سیٹھ سے گفتگو کرنے میں انھیں باتوں کو دھیان میں رکھنا۔ بس مرغا خود ہی پھنس جائے گا۔

میں نے اس کے راستے میں روڑا اٹکانے کے خیال سے کہا 'تو بھئی یہ لڑکی وڑکی کا انتظام کیسے کروں گا۔

'وہ بھی سنو۔ آج ہی شام کناٹ پلیس جاؤ۔ جہاں ایک چھوٹا سا لالی لیڈ بکس ہے وہاں چراغ جلے کھڑے ہو جانا۔ ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے سگرٹ پھونکتے رہنا۔ جب زیادہ سے زیادہ تیسرے سگرٹ پر پہنچو گے تو کوئی نہ کوئی خضرِ راہ دکھائی دے گا۔ بس معاملہ طے کر لینا'۔

مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا لیکن چونکہ میرے لئے کوئی خاص جھنجھٹ نہیں تھا اس لئے اندھیرا ہوتے ہی میں اس جگہ پر جا کھڑا ہوا۔ اور پہلا سگرٹ جلایا۔ کش پر کش لگاتا رہا۔ سینکڑوں لوگ اِدھر سے اُدھر گزر گئے۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ پہلا سگرٹ ختم ہونے کو آیا تو اسی سے دوسرا جلا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دوست کا خیال غلط نکلے گا اور میں خوش تھا کہ اس طرح میں اس قضیہ کو ختم کر دوں گا۔ ابھی دوسرا سگرٹ پی رہا تھا کہ ایک صاحب اور میرے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ میں ان کی موجودگی سے گھبرایا کہ ان کے روبرو اگر کوئی معاملہ طے کرنے والا آگیا تو بہت مشکل پیش آئے گی۔

میں نے چپکے سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اکہرے بدن کا کمزور شخص تھا۔ عمر لگ بھگ اٹھائیس برس۔ بال خشک، گال اندر کو دھنسے ہوئے۔ ہاتھوں کی نسیں ابھری ہوئی۔ گھٹیا سی میلی ٹائی۔ پرانا کوٹ، پرانی پتلون۔ عجیب حلیہ تھا وہ یا تو پرانا شرابی کبابی اور عیاش تھا یا مصائب دُنیا کا ستایا ہُوا۔ لیکن میں جلد ہی اس کے کردار کا تجزیہ کرنے سے اُکتا گیا۔ دوسرا سگرٹ ختم ہو رہا تھا۔ تیسرا نکالا اور سوچا کہ بس چند کش اور، اس کے بعد چل دوں گا گھر کو۔ دفعتاً آواز آئی 'کچھ چاہیئے بابوجی؟'

میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ نووارد چُپ چاپ کھڑا تھا۔ مجھے شبہ ہُوا شاید میرے ہی کان بج اٹھے تھے۔

" میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں "

نووارد ہی بول رہا تھا۔

" آپ .... ؟ میں گھبرا گیا " کچھ .. .. گیا ۔ اوہ ہاں .. .. جی ہاں "

میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نظریں دوسری جانب تھیں۔ وہ جنگلے پر جھکا سڑک کی جانب پیٹھ کئے چپ چاپ سگرٹ پی رہا تھا۔ میں نے سوچا آخر میں اس کی جانب کیوں دیکھوں۔ چنانچہ میں نے سڑک کی جانب منہ پھیر لیا۔

قدرے تامل کے بعد آواز آئی " کب ؟

" کل رات ——— کیسی ہے ؟

اس پر نووارد چپ رہا۔ پھر بولا " بالکل جوان ہے "

" بات یہ ہے کہ " میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ " میں ان باتوں کا شوقین نہیں ہوں۔ سرکاری معاملہ ہے اس لئے ذرا ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیئے "

یہ کہہ کر مجھے خیال آیا کہ آخر مجھے اس شخص کو یہ یقین دلانے کی کیا ضرورت تھی کہ لڑکی مجھے اپنے لئے درکار نہیں تھی . . . اسے میرا اناڑی پن کہنا چاہیئے۔

پھر آواز آئی " کل کس ٹائم ؟

" دس بجے رات سے صبح تک .. . پانچ بجے تک "

" پچیس روپے . . . . "

" ٹھیک ——— کہاں پر "

" انڈیا گیٹ . . . . "

" او کے انڈیا گیٹ دس بجے شارپ "

میرے دوست نے جب یہ بات سنی تو میری پیٹھ پر دھول جما کر بولا " یار ! تم تو چھپے رستم نکلے۔ واہ وا۔ اچھا اب کل شام کو پانچ بجے ملو تا کہ تمھیں مکان دکھا دوں۔ اور تمھیں باقی باتیں بھی سمجھا دوں۔

دوسرے روز شام کو وقت مقررہ پر میں اپنے دوست سے ملا۔ اس نے ایک عمدہ بڑی سی ٹیکسی میں مجھے بٹھایا اور ہم منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایڈورڈ روڈ کے آخر میں ایک سنسان سی کوٹھی تھی۔ لیکن جگہ پرفضا تھی۔ مجھے وہ مخصوص کمرہ دکھایا گیا جو ڈرائنگ روم کی صورت میں سجا ہوا تھا۔ دو کمرے اور بھی تھے جو نسبتاً چھوٹے تھے۔ کوٹھی کے باقی کمروں کے بارے میں مجھے ہدایت دی گئی کہ سیٹھ جی سے کہہ دوں کہ وہ میرے دوست بند کر کے چلے گئے ہیں۔ صرف یہ کمرے میں نے تفریح طبع کے لئے رکھے ہیں ——— ڈرائنگ روم کی دری اور غالیچوں کے نیچے ہی نیچے سے تاریں کوٹھی کے ایک دور افتادہ کمرے تک چلی گئی تھیں وہاں ساری گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جب میرے دوست سب ہدایات دے چکے تو کہا کہ " اب مجھے کناٹ پلیس میں چھوڑ دو۔ اور پھر یہ ٹیکسی تمھارے سپرد کر دی جائے گی۔ پہلے لڑکی کو لے آنا اور پھر ڈرائیور کو سیٹھ صاحب کو لانے کے لئے بھیج دینا۔ خاطر جمع رکھو۔ باقی کھانے پینے کا انتظام بالکل مکمل ہوگا۔ یہ ڈرائیور اور نوکر چاکر سب اپنے آدمی ہیں۔ اس لئے جو کچھ بھی کہنا سننا ہو انھیں سے کہنا۔

رات کے دس بجے تک میں نے وقت اِدھر اُدھر گھوم کر گزار دیا۔ عین دس بجے میں ٹیکسی سمیت انڈیا گیٹ پہنچا۔ لیکن وہاں کچھ، لانے والے صاحب کو نہ پایا۔ انتظار ضروری تھا۔ ٹیکسی سے نکل کر میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا یہ بھی فکر تھی کہ کہیں وہ حضرت نہ آئے تو بڑی مُشکل ہو گی۔

کوئی آٹھ منٹ بعد وہ صاحب، سائیکل پہ سوار آتے دکھائی دیئے۔ تاریکی میں پہلے تو انھیں تنہا دیکھ کر پریشانی ہوئی لیکن ان کے پیچھے کیریر پہ بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر جان میں جان آئی۔

لڑکی کے خدوخال دیکھ کر مایوسی ہوئی وہ بہت عام صورت کی لڑکی تھی۔ البتہ جسم گٹھا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھوں کی بناوٹ اچھی تھی رنگت بھی بُری نہیں تھی۔ اِدھر ہمارے سیٹھ کون پری زاد تھے یہ کہہ کر مَیں نے اپنے دل کو تسکین دی۔

وہ آدمی تاخیر کے لئے معذرت کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی کوئی بات نہیں سُنی جلدی سے پچیس رُپے اس کے ہاتھ میں تھمائے اور بولا "اب اور دیر نہیں ہونی چاہیے — چلیے بیٹھئے کار میں"

آدمی نے لڑکی کو آگے کو دھکیلا تو لڑکی ایسے بڑھی جیسے گھر سے مار پیٹ کر زبردستی لائی گئی ہو۔

ٹیکسی چلی تو وہ آدمی ہاتھ اُٹھا کر بولا "صبح پانچ بجے شارپ"

"پانچ بجے شارپ" میں نے جواب دیا اور پھر ڈرائیور سے کہا "بھئی تیزی سے چلو۔ آگے ہی کافی دیر ہو گئی ہے"

راستے میں لڑکی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پہ گہری اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا میک اپ بے پرواہی سے کیا گیا تھا اگرچہ زیادہ لیپ پوت نہیں کی گئی تھی۔ مجھے وہ بے حد الھڑ، شریف، ناتجربے کار اور گھریلو ٹائپ کی دکھائی دی۔ اس نے ایک آدھ بار ماتھے پر گھرا بل ڈال کر مجھے اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ جیسے میں بھیڑیا ہوں، جو بھیڑ کو اُٹھائے لئے جا رہا ہوں۔ میں دل ہی دل میں بے حد شرمندہ ہو رہا تھا۔ بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ اس سے کہوں بھئی جی! میں آپ کو اپنے لئے نہیں لے جا رہا ہوں۔

لیکن میرے دل کی دل میں ہی رہی۔ یہاں تک کہ ہم کوٹھی جا اُترے۔

ڈرائیور وہیں سے سیٹھ کو لینے چلا گیا۔

میں لڑکی کو لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو دیکھا ایک ملازم کھڑا ہے کچھ ڈھکے ہوئے ڈونگے پرے میز پہ رکھے ہیں۔ وہسکی کی دو دو بوتلیں بھی موجود ہیں۔ ریڈیو بج رہا ہے۔ غرض فضا خاصی دلچسپ ہو رہی تھی۔

لڑکی ایک صوفے پہ بیٹھ گئی۔ میں نے پانی وانی کے بارے میں پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔

نوکر کے اشارے پر میں باہر گیا تو اپنے دوست کو پولیس کے چند اور لوگوں کے ہمراہ گپیں ہانکتے پایا۔ اس نے کہا کہ لڑکی کا انتخاب اچھا نہیں ہے۔ میں نے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے کہا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ شراب کا دَور خوب چلنا چاہیئے پھر سب کچھ حسین نظر آنے لگے گا۔ سیٹھ سے کہہ دیں کہ بات یں پوچھنا تاکہ پکا ثبوت فراہم ہو سکے۔

اس کے بعد مجھے فوراً کمرے میں واپس بھیج دیا گیا اور وہ خود بھی اپنی کمین گاہ میں گھُس گئے۔

سیٹھ صاحب کے پہنچنے کا وقت قریب آ رہا تھا میں نے ایک نظر کمرے میں دوڑائی اور محسوس کیا کہ سوا اس لڑکی کے باقی سب چیزیں درست تھیں۔ لڑکی بالکل مٹھس تھی۔ شکل کی بات تو رہی الگ تیور ہی بے ڈھب ہوئے تھے اور پھر مُنہ کُپّا۔ نہ بات چیت۔ نہ مسکراہٹیں نہ قہقہے۔

اسی اثنا میں لان پہ کار کے رکنے کی آواز آئی۔ میں بازو پھیلائے باہر نکلا۔ اور سیٹھ صاحب کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا۔ سیٹھ صاحب نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "صاحب بڑی سنسان جگہ ہے لیکن ہے پُر فضا"

"جی جی" میں نے جواب دیا۔

سیٹھ صاحب سیاہ فام ہونے کے علاوہ یوں بھی بڑے بے ڈول اور بدصورت انسان واقع ہوئے تھے۔ قد چھوٹا۔ گول مول۔ کالے کلوٹے۔ بھدّے نقوش۔ کلے میں پان۔

میں نے سیٹھ صاحب کو بھی اسی لمبے صوفے پر بٹھا دیا جس پہ کہ لڑکی بیٹھی تھی۔ سیٹھ صاحب نے اِدھر اُدھر کے چند سوالات کئے جن کے معقول جوابات پہلے ہی سے گھڑے گھڑائے موجود تھے۔

وہسکی کا دور شروع ہوا۔ چار چار پیگ حلق سے نیچے اُتر گئے۔ لیکن سیٹھ بالکل سنجیدہ اور اٹل بیٹھے تھے۔ نہ آنکھیں پڑھیں نہ بہکے۔ نہ ہنسے۔ صوفے کے ایک سرے پہ لڑکی چپ چاپ بیٹھی تھی اور دوسرے سرے پہ سیٹھ صاحب۔ دونوں ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے ان دونوں کے درمیان میری جان ضیق میں تھی۔ عجب لوگ تھے یہ۔

یوں سیٹھ صاحب نے وہسکی پینے سے انکار نہیں کیا لیکن کیا مجال جو لمحہ بھر کو بھی بہکیں۔

میں کچھ دیر انھیں لڑکی کے ساتھ تنہا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اور تاریکی میں سے کھڑکی کی دراڑوں سے اندر جھانکتا رہا مگر دونوں چپ چاپ تھے۔ سیٹھ صاحب پیگ لنڈھائے جا رہے تھے اور سگرٹ کا دھواں اُڑا رہے تھے۔ یوں کبھی کبھار ایک نگاہ لڑکی پر بھی ڈال لیتے۔

تنگ آ کر میں پھر اندر پہنچا۔ لڑکی نے شراب پینے سے انکار کر دیا تھا لیکن اصرار کرنے پہ کھانے میں شامل ہو گئی۔ اب میں نے بزنس کی بات کی۔ لیکن سیٹھ صاحب کچھ نہ بولے۔ میں نے نہایت بے ضرر اور معصوم سوالوں سے گفتگو کا آغاز کیا۔ لیکن سیٹھ صاحب کو کھلنا تھا نہ وہ کھلے۔ بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ وہ ہر سوال کا جواب "ہوں ہاں" دے کے ٹال دیتے۔ میں کہتا۔

"سیٹھ صاحب! میں معمولی آدمی ہوں کسی نہ کسی طرح سے پندرہ بیس ہزار روپیہ اکٹھا کیا ہے۔ اگر کامیابی نہ ہوئی تو بڑی مشکل کا سامنا ہوگا۔"

سیٹھ صاحب بھولپن سے کہتے "جی ہاں بزنس میں ایسا بھی ہو جاتا ہے"

میں لمبی چوڑی گفتگو کے بعد پوچھتا "تو سیٹھ صاحب آپ سے کیا اُمید رکھوں؟"

جواب ملتا "اُمید تو بھگوان سے رکھنی چاہیئے"!

غرضیکہ انھوں نے کسی طرح بیٹھے پہ ہاتھ نہ رکھنے دیا۔ نہ شراب نے کچھ کام کیا اور نہ لڑکی نے۔

ہر داؤ اور ہر گھات سے کام لے کر بھی جب کامیابی حاصل نہ ہوئی تو سیٹھ صاحب کو ٹیکسی پہ واپس بھیجدیا گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے وقت صرف اتنا کہا "بہت بہت شکریہ۔ جو کچھ میری قوت میں ہے سو وہ میں آپ کے لئے ضرور کروں گا"

سیٹھ صاحب کے چلے جانے کے بعد لڑکی تو ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی اور میں اپنے دوست اور اس کے ساتھیوں میں جا ملا۔ ہم سیٹھ جی کے گھاگ پن کا ماتم کرتے رہے۔ لڑکی صوفے پہ اونگھتی رہی۔

پانچ بجنے سے کچھ پہلے میں نے لڑکی کو جگایا اور اسے ٹیکسی میں بٹھا کر انڈیا گیٹ کی طرف چل دیئے۔

لڑکی نے راستے میں بات تو کجا میری جانب دیکھا بھی نہیں۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور رحم بھی۔ اور سب سے بڑھ کر میں اپنے

آپ پر لعنت بھیجتا رہا۔

انڈیا گیٹ کے قریب اس کا ساتھی کھڑا تھا۔ انجن روکے بغیر ٹیکسی ٹھہر گئی میں نے دروازہ کھولا تو لڑکی شعلے کی طرح باہر نکلی اور ساتھی سے کہنے لگی "اب آئندہ تم نے ایسا کیا تو زہر کھا لوں گی"۔

ٹیکسی چل دی۔

دیوراج چپ ہو گیا بحسب عادت۔ ہمیں کہانی دلچسپ تو ضرور لگی لیکن بے تکی سی ــــ ہماری طرف مطلقاً دھیان دیئے بغیر دیوراج نے نیا سگرٹ ہونٹوں میں دبایا اور مسکرا کر بولا "یہ میرا تیسرا سگرٹ ہے ــــ کہانی ختم نہیں ہوئی اس کا اختتامیہ باقی ہے۔

"اچھا؟" ہم نے بیک زبان حیرت کا اظہار کیا۔

دیوراج نے گہرے گہرے کش لئے اور کہنا شروع کیا "چند ماہ بعد مجھے نوکری مل گئی اچھی ملازمت تھی۔ گیزیٹیڈ۔ مجھے اپنے لئے ایک معاون رکھنے کی اجازت تھی۔ اس اسامی کے لئے اشتہار دیا گیا ٹیکنیکل کام تھا زیادہ عرضیاں نہیں آئیں۔ جو آئیں ان میں صرف ایک ہی شخص کام کا معلوم ہوا تاہم میں نے نصف درجن امیدواروں کو انٹرویو کے لئے بلا لیا۔ انٹرویو مجھے خود ہی لینا تھا۔

انٹرویو والے دن میں وقت سے ذرا پہلے دفتر پہنچ گیا تاکہ کاغذات پر ایک نگاہ دوڑا لوں۔

دو سگرٹ پی کر میں نے چپڑاسی کو پہلا نام بتایا۔ تیسرا سگرٹ میرے ہونٹوں ہی میں تھا کہ سامنے وہی حضرت ــــ یعنی لڑکی والے دکھائی دیئے۔

نظریں ملتے ہی ہم دم بخود رہ گئے۔

بالآخر میں نے کہا، "تم قابل شخص معلوم ہوتے ہو بلکہ سب امیدواروں سے بھی قابل ...... لیکن وہ لڑکی ....."

اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "میری بہن تھی ــــ یقین کیجیے وہ اس کا پہلا موقع تھا اور آخری ــــ میں اسے آپ کے سامنے لا سکتا ہوں ... وہ خود اس امر کی گواہی دے گی ــــ یہ نہ پوچھیئے کہ اس رات کن حالات سے مجبور ہو کر وہ حرکت کی ..."

"میں نہیں پوچھوں گا ــــ" میرے دل سے بوجھ سا اتر گیا پھر میں نے کہا "دیکھو! اس رات بھی کسی نے اسے چھوا تک نہیں"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہیں کو منتخب کروں گا ــــ اب جاؤ" وہ سسکیاں بھرتا ہوا چلا گیا۔

پھر دیوراج نے مسکرا کر ہم سب کی طرف دیکھ کر کہا:

"اس روز تیسرا سگرٹ پینے کا جو لطف آیا وہ پھر کبھی نہیں آیا"۔

سراب

خدیجہ مستور

لو بھئی وہ تو آس لگائے بیٹھا تھا کہ اب کچھ ظہور میں آئے اور یہاں معاملہ اُلٹا ہو گیا۔ وہ آئی اور ہلکی سی ڈانٹ پلا کر چلی گئی۔ آگ ہی تو لگ گئی اس کے تن بدن میں۔ اس کے اب تک کے سارے کارناموں پر صفا جو تباں لگا گئی۔ ایک ذرا دیر ہو گئی تھی دوائیں بنانے میں کہ اپنے مردانہ قسم کے جوتے دھمکاتی آ پہنچی۔ سلیم ذرا دیر کو تو چکرا کے رہ گیا۔

”بھئی یہ خوب آئیں جانِ جہاں، شاید ہمیں جانتی نہیں“، وہ غصّے اور غرور سے اکڑا۔

”کمپونڈر صاحب یہ بھی انداز تھا ان کا، جب آپ کو جانیں گی تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی“ حسین کے چہرے پر ہلکی سی مایوسی تھی۔

”تو کیا تو سمجھتا ہے سالے کہ ہم ان کا رعب کھا گئے“ سلیم نے زور سے قہقہہ لگایا۔

”تو پھر نئی نرس کے آنے کی خوشی میں ہو جائے تمہاری کلیجی“ حسین نے بہت ساتھوک نگل کر بھوکی بھوکی نظروں سے سلیم کو دیکھا۔

”ضرور ہو جائے“ ـــــ سلیم نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر سچی بات یہ تھی کہ وہ نئی نرس کے تیوروں سے کچھ خوش نہ تھا اس مطب میں مدتوں سے اس کا بول بالا تھا۔ ڈاکٹر کا پروردہ، اس کا سارا خاندان ڈاکٹر کے ذمے! گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے بدلے ٹھاٹ سے سب روٹیاں کھاتے اور عیش کرتے۔ خود یہی تھا جس نے کبھی خاص تکلیفوں کا منہ نہ دیکھا تھا۔ پہلے قطعی جاہل تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت سے اس کو اُردو پڑھوائی۔ وہ لاکھ پڑھائی سے بھاگتا لیکن ڈاکٹر صاحب پیچھا نہ چھوڑتے۔ دیکھنے والے کہتے کہ لڑکا قسمت کا دھنی ہے۔ بھلا کوئی کیا اپنی اولاد کے ساتھ بھی اس طرح سر مارے گا۔ جب کسی نہ کسی طرح اُردو پڑھ لی تو پھر ایک ماسٹر رکھ کر انگریزی شروع کرا دی اور جب وہ نسخے جانچنے بھر کی انگریزی سیکھ گیا تو مطب میں کمپونڈر بن بیٹھا۔ آج اس کی یہ پوزیشن تھی کہ مریضوں سے لے کر ڈاکٹر تک سبھی کا کمپونڈر صاحب کہتے منہ خشک ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر

ایسا اعتماد کہ کبھی شک سے حساب کتاب تک نہ کیا۔ رات دن وہ مطب میں رہتا اور خود کو اس لمبے چوڑے مطب کا مالک سمجھتا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب مطب کے سلسلے میں اس سے مشورہ بھی لے لیا کرتے۔ اس دن مطب کے دوسرے ملازموں کی جان عذاب میں پڑ جاتی۔ سب کو ڈانٹا پھٹکارا جا رہا ہے، یہاں تک کہ حسین بھی ڈانٹوں سے نہ بچتا۔ سب کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے وہ بھول جاتا کہ آخر تو ایک زمانے میں وہ بھی کچھ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے روٹی کپڑا تو ملتا مگر سارا دن ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹانگے پھرتا۔ یہ سب کچھ بھول گیا تھا وہ۔ اس کی بیوی جسے ڈاکٹر صاحب بڑے چاؤ کے ساتھ کسی خانساماں کے گھر سے بیاہ لائے تھے، تنہائی میں اسے چھوٹے ڈاکٹر صاحب کہتی۔ اور جب ڈاکٹر صاحب کے حکم سے وہ ہفتے میں ایک آدھ بار اپنے گھر جاتا تو وہ بے چاری آدھی آدھی رات تک اس کے پاؤں دبایا کرتی۔ مارے رعب کے نظر اٹھانے کی ہمت نہ پڑتی۔ وہ اپنی بیوی کی ذرا بھی پروا نہ کرتا۔ بھلا کہاں وہ اور کہاں اس کی بیوی۔ میلے کچیلے، ڈاکٹر صاحب کے گھر سے ملے ہوئے کپڑے، بال بیا کے جھونج کی طرح خشک، نہ ہونٹوں پہ سرخی، نہ چہرے پہ پوڈر۔ بھلا اسے کس دل سے وہ جھاڑ منہ پہاڑ اچھی لگتی۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ اب تک اس مطب میں جتنی بھی دائیاں قسم کی معمولی نرسیں آئیں، بقول اس کے سب ایک ہی دن میں فریفتہ ہو گئیں۔ ہتّے تو اب تک کوئی نہ چڑھی تھی پھر بھی یہ کیا کم فخر کی بات تھی کہ وہ سب اس پہ آتے ہی صدقے قربان ہونے لگتیں۔ وہ بھی خوش ہوتا کہ چلو مذاق رہتا ہے۔ اور جب وہ غریب دائیاں ٹکے ٹکے کے تحفوں کے ملتے اپنے گال نچوڑتے ہوئے اس کی خوشامدیں کرتیں تو وہ کتنا حسین تصور کرتا خود کو۔

"ہائے کمپونڈر صاحب، ایک جمپر کا کپڑا تو لا دیجئے" اور لپ اسٹک بھی، کب سے پھیکے ہونٹ لئے پھر رہی ہوں۔ آپ کو تو کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا" ـــــ اور اس پرستان کے چہرے اور چھوٹے ڈاکٹر کا مارے خوشی کے دم نکلتا۔ اسے یاد ہی نہ رہتا کہ ابھی دس دن پہلے جو لپ اسٹک لا کر دی تھی، وہ اتنی جلدی ہی کیسے ختم ہو گئی۔ نہ وہ یہ سوچتا کہ بھری دوپہریا میں جبکہ مطب بند ہوتا ہے اور وہ انہیں چپکے سے آنے کی دعوت دیتا ہے تو ہمیشہ ٹال جاتی ہیں۔ ہزار ہزار بہانے بناتی ہیں۔ اس کے باوجود چلچلاتی دوپہروں میں کتنا کھوٹ تحفے خریدے جاتے اور چھپے چوری کے پیاروں کی نذر ہوتے رہتے۔ اسے ہر بہلانے پہ یقین آجاتا۔

"یار وہ ضرور آتی مگر اس کی ماں نے نکلنے نہیں دیا۔ کہتی تھی کہ گھنٹہ بھر روتی رہی ہوں" ـــــ وہ بڑی بکٹیں، آنکھ مار کر حسین کو بتاتا ـــــ "ہوں ہی ایسا خوبصورت جو عورتیں روتی پھرتی ہیں، خدا نے باڈی ہی ایسی دی ہے" جسم تو خیر تھا اچھا خاصا مگر صورت کے سلسلے میں وہ خود کو جانے کیا سمجھتا۔ موٹے موٹے سیاہ ہونٹ، دھنسی ہوئی آنکھیں۔ کالا رنگ اور چیچک کے داغ۔ بڑے طمطراق سے مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں۔ پتلی لمبی، اور کونوں سے رخساروں کی طرف مڑی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی سیاہ بچھو اپنا ڈنک بھول کر چلا گیا ہے۔ مونچھوں کے سلسلے میں اس کا بڑا ہی خوبصورت خیال تھا۔ یعنی یہی کہ عورت اس وقت تک قدموں میں نہیں جھکتی جب تک مونچھ نہ ہو۔ شروع شروع میں جب نرس آتی تو کھنچی کھنچی رہتی مگر جلد ہی وہ اسے جھکا لیتا۔ یہی کوئی دس پانچ تحفے نذر کر دیئے اور بڑے فخر سے اینڈتا پھرا کہ سالی اس کی صورت پہ قربان ہو گئی۔ اسے کبھی کسی نرس کے جانے کا دکھ نہ ہوا۔ ایک گئی تو دوسری آ گئی۔ اسے تو بس عورت چاہیئے تھی۔ جس کے ہونٹ سرخی سے چپڑے ہوں، ساڑی پہنتی ہو، پوڈر لگاتی ہو۔ انگریزی میں اس کی طرح یس اور نو کہہ لیتی ہو۔ اتنے ہی میں وہ خود کو ڈاکٹر صاحب سے بھی زیادہ سمجھنے لگا تھا۔ مگر یہ کمبخت نئی نرس تھی کہ اس کو ڈاکٹر سے زیادہ اہم شخصیت کا جیسے علم ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب

سمجھے کہ اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ یہ پہلی نرس تھی جسے ڈاکٹر صاحب خود کار پر لانے اور پھر پہنچانے جاتے۔

ایک دن تک تو وہ ڈاکٹر سے بھی جلا جلا رہا کہ یہ بڑھاپے میں اس کمبخت کو کیا سوجھ رہی ہے مگر جب ڈاکٹر نے اس سے نئی نرس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ مسز بے حد شریف لڑکی ہے اور یہ مجھے تمہاری طرح عزیز ہے تو پھر اس کا دل صاف ہو گیا۔ پر یہ بات بُری طرح کھٹکی کہ کوئی ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں اس کا ہم پلہ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے الگ سے اور بھی بہت کچھ بتایا یہی کہ لڑکی بہت غریب ہے۔ نرسنگ کا ایک سال پورا کیا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں اور دو چھوٹے چھوٹے بھائیوں کی بھوک کا سوال ہے اس لئے نوکری کر رہی ہے۔ مطلب کے لئے بہت مفید رہے گی کیونکہ عورتیں اس کی سدھائی، شرافت اور کام میں مستعدی سے بہت خوش ہیں۔ بھلا اس کی مستعدی سے کس کو شکایت ہو سکتی تھی مگر یہ بھی کیا کہ دوائیں بنانے میں ذرا دیر ہو گئی تو آج اسے تک ڈانٹ گئی۔ جی تو بہت جلا مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں جو ایک بار چڑھ جائے وہ آسانی سے نہیں اُترتا۔ خود وہی تھا، رہتا تو بغیر تنخواہ کے۔ لیکن پرائے مال پر کیسا کیسا یا حسین کرتا۔ پہ کیا مجال جو ڈاکٹر صاحب کبھی حساب کر جائیں ——— "جانے یہ وبال کب تک رہے" اسے تو یہ سوچ ہی کر پھانس سی چبھتی معلوم ہوتی۔ اچھی خاصی بکٹ ہیں صاحبزادی ——— ڈانٹ کھانے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا۔ مگر وہ بھی تو ایسا گیا گزرا نہیں، آخر اب تک جو اتنی بہت سی نرسیں اس پر جان چھڑکتی اپنے اپنے گھروں کو پیاری ہوئیں۔ تو کیا یوں ہی خالی نکل لی۔

مطلب کا وقت ختم ہوا تو نرس ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جانے لگی۔ جب وہ اس کمرے کی طرف سے گزری جہاں سلیم دوائیں بناتا تھا تو ایک لمحے کو کھڑی ہو گئی۔ بڑی شرمندہ شرمندہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئی ——— ہوں! اب ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا۔ ایسا بنائے گا کہ آج کی ڈانٹ کا مزہ ساری زندگی یاد رکھے۔ بہت بن کر چلی تھیں لاڈو۔

"بہت حسرت سے میرا منہ تکتی گئی ہیں" اس نے اعلان کیا۔ مارے خوشی کے کلیجہ بلیوں اُچھل رہا تھا۔

"بس تو کمپونڈر صاحب اس خوشی میں ہو جائے کباب پوری اور آئس کریم، اللہ قسم کیسی ونا کے کی گرمی پڑ رہی ہے" صدا کے مریکھے حسین کو تو بس ہر وقت کھانے کی فکر رہتی۔ اٹھارہ سال تک بیوہ مزدورنی ماں کے ساتھ ارہر کی دال، باجرے کی روٹیاں اور سدا بہار آلو کھاتا رہا۔ کبھی ملنگے تلنگے سے کوئی مزے کی چیز مل گئی تو مدتوں اس کے ذکر سے ہونٹ چاٹتا رہا۔ تیرے میرے گھروں میں کسی کو مزے کی چیز کھاتے دیکھتا تو رال کے قطرے بہنے لگتے۔ اب تک اس کی یہی حالت رہی کہ ہر وقت موٹے موٹے سرخ ہونٹ بھیگے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی چمک تڑپتی ہوئی معلوم ہوتی۔ غریب نے دو سال کی عمر تک ماں کا خون چوسا اس کے بعد پھر قسم کے برابر ایک قطرہ دودھ کا نصیب نہ ہوا۔ کھانے کمانے کے خیال سے گاؤں چھوڑ کر بھاگا تو قسمت نے ساتھ دیا۔ آتے ہی ڈاکٹر صاحب کے ہاں زنانخانے میں ڈیوڑھی تک دوائیں اور نسخے لانے لے جانے پر ملازم ہو گیا۔ یہاں منہ کا مزہ بدلا۔ سلیم کھلاتا آئس کریم، کباب پوری اور نہاری کلچے۔ بیس سال کا ہو رہا تھا مگر پیٹ کا ایسا ترسا بھوکا کہ عورت کو کبھی نہاری کلچوں کی طرح بھی نہ دیکھا۔ ڈھیر سا کھا کر یوں سوتا کہ کبھی ایک بے بھنی کی کروٹ بھی نہ بدلی ——— سلیم کبھی کبھی اس کو بڑے پیار سے زنخا کہتا اور وہ بُرا ماننے کے بجائے اس طرح ہنستا جیسے کوئی بڑا بھاری اعزاز بخشا جا رہا ہو۔ تنخواہ ملتی سو وہ بھی سلیم اور صدیق کی نظریں بچا کر بالا ہی بالا کھا جاتا۔ کبھی ماں کو ایک دھیلا نہ بھیجا۔ سلیم کتنا سمجھاتا کہ سالے کپڑے تو بنوا لیا کر ڈھنگ کے ورنہ کبھی کوئی عورت بھولے سے بھی نہ دیکھے گی مگر اس کے کان پر جُوں بھی نہ رینگتی۔ اس وقت بھی وہ کباب پوری کی فرمائش کر کے بڑی بھوکی نظروں سے سلیم کو دیکھ رہا تھا اور ہونٹوں کے دونوں کناروں پر رال کے دو چھوٹے چھوٹے قطرے ٹپک جانے کو تیار تھے۔

"اچھا تو لے، پھر کباب پوری لے آ، اور اگر کوئی ملائی کی قلفی والا ملے تو اسے بلاتا لائیو۔ کیا کہو گے تم لوگ بھی کہ کسی امیر سے پالا پڑا تھا۔" سلیم نے پورے دو روپے اس کے ہاتھ پر ٹکا دیئے۔

ڈھیر سی نرم نرم پوریاں کھانے کے بعد حسین اور صدیق سلیم کا بستر لگا کر کھڑی بنچوں پر ڈھلک گئے۔ بستر خدا گواہ ہو تو خواہ مخواہ انسان کو ورزش کی کوڑی لانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سلیم نے اپنے بستر پر دراز ہوتے ہی قصّۂ جانان چھیڑ دیا اور لیٹتے ہی سو جانے والے صدیق کے خراٹوں نے ساز کا کام شروع کر دیا۔

"یار حسین، اب تک جتنی نرسیں آئیں یہ سب سے زیادہ خوبصورت ہے، آنکھیں کیسی ہیں سالی کی موٹی موٹی سیاہ۔"

"بالکل جیسے رس گلے، کیوں نہ کمپونڈر صاحب، یاد ہے نا ایک بار آپ نے آٹھ رس گلے منگوائے تھے جب اس والی نرس نے"———

"دھت تیری کے سالے"——— سلیم پوری بات سُنے بغیر ہی چڑھ گیا ———" اس کی آنکھوں کو رس گلوں سے ملاتا ہے، اے عورت کو دیکھنا بھی تو سیکھ۔"

"جی ہاں جی ہاں! کمپونڈر صاحب"——— حسین گڑبڑایا ——— "ہم کیا جانیں عورت کو دیکھنا، کمپونڈر صاحب اپنی تو بس وہی عورتیں ہیں جو حلوائی کی دکان پر مٹھائی کے تھال میں سجی ہوں۔" سلیم بے تحاشہ ہنسا مگر حسین شاید حلوائی کی دکان پر سیاہ آنکھیں تلاش کرنے جا چکا تھا، اسے ذرا بھی ہنسی نہ آئی۔

"کیسا میرا منہ تکتی گئی ہے، اللہ قسم اب اس کی طرف سے ذرا بھی ملال نہیں"——— سلیم نے پھر من بھاؤنی باتیں چھیڑ دیں" منہ تکتا گیا۔ میں تو کہتا ہوں کمپونڈر صاحب کہ بس سمجھو آپ کی ہو گئی، تین سال سے دیکھ رہا ہوں، غلط بات نہیں کہتا۔" حسین بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو جیسے بڑی مشکل سے کھول رہا تھا ——— کسی ہوئی بنیان پر سے اس کا ابھرا ہوا پیٹ ننھے سے ٹیلے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس پر سے گرمی کے مارے رانوں تک کھلی ہوئی سوکھی سوکھی ٹانگیں۔ ابھرے ہوئے پیٹ پر اس کی ٹانگیں بالکل ایسی معلوم ہوتیں جیسے بڑے سے تربوز میں بانس کی دو کھپچیاں گاڑ دی ہوں۔ سلیم نے کتنی بار سمجھایا کہ سالے استامنٹ کھایا کر ورنہ باڈی بننے سے رہی۔ زندگی بھر کوئی عورت منہ پر بھی نہیں تھوکے گی ——— وہ اپنے بازوؤں میں تڑپتی ہوئی مچھلیاں نکال کر دکھاتا ——— "دیکھ یہ ہے جسم سالے اچھی تو عورتیں مرتی ہیں۔ یوں سمجھ لے کہ دنیا میں سب کچھ پیسہ اور جسم ہوتا ہے ———" اسے اپنے جسم کا بے حد خیال رہتا۔ روز صبح اٹھ کر قسم قسم کی ورزشیں کیا کرتا۔

"یار حسین خدا آج شام تو بھی دیکھیو اس کی نظریں، ہیں نا محبت والی؟" حسین کی طرف کروٹ لیتے ہوئے اس نے پوچھا مگر وہ تو بالکل بے خبر سو رہا تھا۔ سلیم بڑی طرح جھلایا ——— سالے کھا کھا کے انڈا نتے ہیں۔ ذرا دیر جاگا بھی نہیں جاتا۔" اس نے پھر کروٹ بدلی۔ اسے تو ایک رتی بھر نیند نہ آ رہی تھی۔ ایک ذرا نرس کا ذکر ہوتا تو یہ پہاڑ سی دوپہر یا کچھ تو جلدی گزر جاتی۔ کیسے مزے کے ہوتے ہیں ایسے قصّے بھی۔ اور وہ بھی لو دھوپ سے بھرے ہوئے دنوں میں۔ بس بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے لیموں کا ٹھنڈا کھٹمٹھا شربت پیا جا رہا ہو۔

شام کو سلیم انتظار ہی کرتا رہا مگر نرس اس کے کمرے میں نہ آئی۔ اس نے سوچا کہ اب محبت کی نظر ڈالنے کے بعد تڑپایا جا رہا ہے۔ کوئی بات نہیں، شروع میں سب نے اسی طرح کیا تھا اور پھر سب لوٹتی پھریں ——— سوچتے سوچتے اس کی نظریں بار بار زنانے کمرے کے پردے سے اُلجھ جاتیں ———" آ بھی چکو پٹاخہ" ——— وہ بڑبڑایا۔ اور جب حسین اس کی طرف دیکھتا تو

بڑی کٹیلی آنکھ مارتا۔

"بھئی ہم سے تو آج پردہ ہو گیا ہے"

"نہیں جی، ابھی جب میں دوائیں دینے گیا تھا تو ڈاکٹر صاحب سے کہہ رہی تھی کہ میں جا کر سرنج لے آؤں" حسین بھیگے ہوئے ہونٹ چاٹنے لگا۔

"ابے بھاگ، تو نے اتنے شور میں کہاں سنا" سلیم نے اسے جھٹلا کر تصدیق کرنی چاہی۔

"وہ اس وقت" ——— حسین گڑبڑایا ——— اللہ قسم کمپونڈر صاحب اس وقت سب چپ تنے کھڑے ہیں"۔

"اچھا!" وہ قسم پہ اعتبار کھا گیا ——— "ابے صدیق ابھی سرنج لے کر نہ جائیو۔ اندر وہ خود آکر لے جائے گی" خوشی کے مارے زمین پہ پاؤں نہ جم رہے تھے۔ صدیق سرنج بوائل کر کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے سلیم کو دیکھا۔

"کمپونڈر صاحب، جو وہ ناراض ہو گئیں اور ڈاکٹر صاحب سے شکایت کر دی تو پھر"

"دم نکلا جاتا ہے حرام زادے کا ———" سلیم کو ایک دم غصہ آگیا ——— "ابے وہ دوسری جگہیں تھیں جہاں ذرا ذرا سی غلطی پہ نکال باہر کیا گیا۔ یہ میرا مطلب ہے، میں جو کچھ کہوں وہی کیا کر، دھر دے سرنج" ——— صدیق نے سرنج تپائی پہ دھر دی اور آنکھیں مل مل کر رونے لگا۔ چودہ پندرہ سال کی ننھی سی جان نے اس عمر میں اپنی ماں کا پیٹ پالنے کے لئے بیسیوں جگہ نوکری کی ہوگی اور ان بیسیوں جگہوں سے وہ ذرا ذرا سی غلطیوں پہ نکال باہر کیا گیا تھا۔ نئی نوکری کے ملتے ملتے اس نے کیسے کیسے کڑکڑاتے فاقے کئے تھے۔ اس وقت سے جانے اس کے دماغ میں کونسا خوف گھس گیا تھا کہ ہر وقت چہرے پہ جھاڑ کا کرتا مگر یہاں آنے کے بعد تو کچھ زیادہ ہی خوفزدہ دکھائی دیتا۔ ادھر سلیم نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دے کر اپنے مطابق ڈھالنا چاہتا ادھر ڈاکٹر صاحب چھوٹی موٹی غلطیوں پر ڈانٹتے۔ ننھی سی جان چکی کے ان دو پاٹوں میں گھن گھن پسے چلی جا رہی تھی۔ سلیم اسے اچھی طرح دیا دلاتا، صرف اس لئے کہ اس کا خوف دور ہو جائے اور وہ کبھی کو ڈاکٹر صاحب سے کوئی شکایت بھی نہ کرے۔ ابے ہاں کونسا سند یافتہ کمپونڈر تھا جو اس کا سارا خاندان عیش کرتا۔

"بس آنسو پونچھ ڈال سالے" ——— سلیم نے بڑی شفقت سے اس کو دیکھا ——— "میرا کہا مانا کر، عیش نہ کرے جب کی بات، یہ ڈر مادر ناچھوڑ دے، تجھ سے چھوٹے چھوٹے لونڈے کالج کی راہ چلتی لونڈیوں کو آنکھ مار کر خم ٹھونکتے گھر آجاتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں بگاڑ پاتا۔ مگر تو ہے کہ ذرا ذرا میں دم نکلا جاتا ہے ———"

ابھی سلیم اسے سمجھا ہی رہا تھا کہ نرس آگئی۔

"میں نہ کہتا تھا کمپونڈر صاحب کہ وہ آنے کو کہہ رہی تھی، اس خوشی میں کل صبح ہو جائیں نہاری کلچے اور" ——— حسین نے سلیم پہ جھک کر جلدی سے سرگوشی کی۔ نرس آکے صدیق کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"اتنی دیر لگا دی تم نے ایں، ڈاکٹر صاحب انجکشن دینے کو بیٹھے ہیں" ——— اس کے لہجے میں تنبیہہ تھی ——— "ارے یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں میاں صدیق، کیا بہت گرمی لگ رہی ہے؟" وہ جیسے بھول گئی کہ تنبیہہ کر رہی تھی۔ صدیق ڈرا ہوا چپ چاپ کھڑا رہا۔

"سلام علیکم سسٹر"، سلیم نے نطعی فرشی سلام جھاڑا۔

"وعلیکم سلام، اچھے تو ہیں کمپونڈر صاحب؟"

"آپ کی مہربانی ہے"

"آج آپ نے پھر دوائیں بنانے میں دیر کر دی۔ ذرا خیال کرنا چاہیئے مریضوں کا، اور ان چھوکروں کو بھی سمجھائیے انھیں تو ذرا بھی ڈیوٹی کا خیال نہیں۔" وہ مسکرا مسکرا کر بول رہی تھی۔

"کیا بتاؤں سسٹر آج کل میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، جانے دل کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ ہلنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔"

"تو پھر ڈاکٹر صاحب کو بتائیے انشاء اللہ دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ سلیم کو بڑی ہمدردی سے دیکھنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب، بتاؤں گا، بس دل نہیں چاہتا علاج کرنے کو" وہ ایسا سوکھا منہ بنائے تھا کہ جیسے سخت بیمار ہو۔

"ہاں سسٹر میں بھی یہی کہتا ہوں کہ علاج کر لیں۔ مگر یہ سنتے ہی نہیں۔ جانے کیا ہوا ہے کمپونڈر صاحب کو کہ بس کام کے بعد پڑے آہیں بھرا کرتے ہیں۔" حسین کی نہاری نے بھی زور لگایا۔

"ذرا آپ لوگ جلدی جلدی دوائیں بھجوائیے" وہ بے حد سنجیدہ ہو کر ایک دم مڑ گئی۔

"واہ بیٹا، کیا گھما کر بات کی کہ بس لطف آگیا، ابے تو تو سارے گنوں میں پکا ہے، ڈھونڈ دوں تیرے لئے بھی ایک لونڈیا؟" سلیم نے بڑھ کر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

"کیسی نظریں جھکا گئی ہے، اللہ قسم شرما گئی کمپونڈر صاحب، بس اب تو معاملہ پکا سمجھیئے، اور اس خوشی میں کل صبح نہاری کلچے کھلا دیجئے۔"

"پیشگی لے لے، جب تجھے اعتبار آئے گا" —— اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر حسین کی ہتھیلی پر ٹکا دیا۔

"آ تو بھی لے، کیا یاد کرے گا" —— ایک اٹھنی صدیق کی طرف بھی بڑھا دی جو اس نے اس طرح اپنی مٹھی میں دبوچ لی جیسے بھاگی جا رہی ہو —— ایسے آئے ابھی پورا مہینہ نہ ہوا تھا مگر ماں کو پورے چھ روپے بھجوا چکا تھا۔ کیا مجال جو کبھی دھیلے کی چیز لے کر کھائے۔ سلیم لاکھ سمجھاتا کہ کچھ تو کھایا کر ورنہ باؤلی نہیں بنے گی مگر وہ کچھ جواب دینے کے بجائے بڑی مسکینی سے سر جھکا دیتا۔

بخشیش کرنے کے بعد سلیم کو کچھ یوں ہی سا خیال آیا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو۔ کہیں ڈاکٹر صاحب سے شکایت نہ جڑ دے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر ایسے معاملات میں بہت سخت تھا اپنے دواخانے کی نیک نامی کو کلیجے کا ٹکڑا سمجھتا اور اپنے فائدے کے سلسلے میں سخت خود غرض۔

"جا بے صدیق ذرا اندر جا کر دیکھ کہ نرس کیا کر رہی ہے اور ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر غصہ تو نہیں؟" سلیم نے ویسے ہی اپنا اطمینان کرنا چاہا۔ ورنہ حسین کی باتوں اور اپنی آنکھوں پر یقین تھا کہ وہ اس پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ صدیق ڈرا ڈرا سا اٹھا اور زنانے کمرے میں جا کر فوراً ہی پلٹ آیا۔

"جی وہ تو ہنس ہنس کر عورتوں سے باتیں کر رہی ہے"

"بات ہی ہے ہنسنے کی" سلیم اترایا اور مونچھ کی پھنگی مروڑنے لگا —— رات کھانے پر رس گلے بھی کھائے گئے —— اب اسے یقین تھا کہ اگر پہلی بار شکایت نہیں کی تو پھر کبھی نہ کرے گی بلکہ اب معاملہ آگے ہی بڑھے گا۔ یہ تو اس کا پرانا تجربہ تھا۔

معاملہ بڑھنے کے انتظار میں بہت سے دن گزر گئے لیکن بات نہ بنی۔ وہ روز دوائیں بنانے میں دیر کر دیتا، وہ آتی اور اسے "ڈیوٹی اینڈ ڈیوٹی" کے مطلب سمجھاتی۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے اپنے دل کے مرض کا دکھ شروع کر دیتا، پھر وہ ہمدردی سے سمجھاتی کہ بہتر یہی ہے کہ کچھ دن کے لئے گھر جا کر آرام کرے، انشاء اللہ طبیعت سنبھل جائے گی ——— مگر یہاں طبیعت کے سنبھلنے کے امکان ہی کہاں تھے ——— اسے معلوم تھا پھر بھی بنے جا رہی تھی۔ ابھی ابھی سلیم کی طبیعت ایسی جھلائی کہ جی چاہتا اپنا منہ کھسوٹ لے۔ وہ گھنٹوں سوچتا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے ——— اپنی دولت کے ذکر ہزاروں بار کر چکا تھا بلکہ اسے دینے کے لئے کئی چھوٹے چھوٹے تحفے بھی خرید رکھے تھے مگر دینے کی ہمت نہ پڑتی۔ ذرا بھی تو چاؤ سے نہ سنتی دولت کے ذکر۔ حسین روز بھڑکاتا کہ تحفے دے کے تو دیکھیے، جب تک خدمت نہ کی جائے گی قابو میں آنا مشکل ہے۔

حسین کے بھڑکانے پر وہ شیخی ہانکتا۔

"اب میں تو اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب وہ اپنے منہ سے کہے، ہائے کمپونڈر صاحب مجھے بھی کچھ لا کر دیجئے" حسین کا منہ اُتر جاتا۔ شاید اسے اطمینان نہ ہو رہا تھا۔ اب کچھ دن سے وہ بے چین بے چین سا پھرا کرتا۔ صرف مسکراہٹوں اور آرام کی ہدایات کے بدلے میں تو کوئی روز روز چٹخارے دار چیزیں کھلانے سے رہا ——— ادھر سلیم تھا کہ اب واقعی تنگ گیا اپنی سی ساری کوششیں کیں لیکن معاملہ آگے نہ بڑھا ——— اب وہ یہ تو کرنے سے رہا کہ اس کے قدموں پہ گر کر خاک چاٹتے۔ آخر اس کی بھی تو کوئی پوزیشن تھی۔ حسین، صدیق اور صدیق سے پہلے کے حجو کرے اس کی شان دیکھ ہی چکے تھے۔ کیسا ہیرو رہا تھا۔ اس نرس کو بھی اشاروں اشاروں میں سبھی کچھ تو سمجھا چکا تھا ——— مرتا ہے اس پر، جان چھڑکتا ہے اور دل کا مرض لگ گیا ہے ——— پر بدلے میں وہی کبھی کبھی کی مسکراہٹ اور نصیحت ملی ——— زندگی اجیرن کر دی تھی اس کمبخت نے بے چارا سوکھے دنوں میں اپنا پرانا ہیرو پن یاد کر کے دل ٹھنڈا کیا کرتا ——— آخر ایک دن تنگ آ کر اس نے خود ہی آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن جب نرس اس کے کمرے میں سرنج لینے آئی تو اس نے سارے تحفے سامنے دکھ دیئے۔

"کیوں؟" وہ سخت سنجیدہ ہو گئی۔

"یہ آپ کے لئے ہیں سسٹر، اللہ قسم نجری دوپہر میں خریدے ہیں آپ کے لئے، ہم نے سوچا کہ اتنے دن ہو گئے ہماری سسٹر کو آئے اور ہم نے ایک تحفہ تک نہ دیا" سلیم اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ کچھ نہ کہہ سکا جو رات بھر سوچتا رہا تھا۔

"ہاں ہاں لے لیں سسٹر، کمپونڈر صاحب تو ہم سب کو بھی تحفے دیتے ہیں، ایک جگہ کا رہنا جو ہوا" حسین نے بڑے ادب سے ہاتھ باندھ لئے۔

"اوہ! اچھا، ضرور لوں گی" ——— اس نے دفتی کے ڈبے اٹھا لئے اور سلیم کو بڑی متشکرانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مجھے بھی جب تنخواہ ملے گی تو آپ لوگوں کے لئے کوئی تحفہ خریدوں گی" ——— وہ بڑے پیارے پن سے مسکرائی۔

"واہ بھئی، ہم تو ابھی سے انتظار کریں گے" سلیم اٹھلایا۔

"ضرور کیجئے" ——— وہ زور سے ہنسی ——— "مگر اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"طبیعت؟ اب ہر کیا اچھا ہوگا سسٹر؟" اس نے اپنا ہٹا کٹا جسم نحیف و نزار لوگوں کی طرح جھکایا۔

"دیکھئے کمپونڈر صاحب اگر آپ ایسی باتیں کریں گے تو پھر آپ کے تحفے واپس کر دوں گی۔ یہاں کوئی بھی بیمار پڑے گا تو

کیا مجھے تکلیف نہ ہوگی۔ میری بات مانئیے اور کچھ دن آرام کر لیجئے۔ آپ کا کام میرے ذمے رہا۔" آج جانے کیوں وہ کچھ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔

"اب مانوں گا، بھلا آپ کی بات ٹال سکتا ہوں۔" اس نے حسین اور صدیق کو ٹل جانے کا اشارہ کیا۔

"اچھا شکریہ" وہ تحفے اور سرنج لے کر ان سے پہلے ہی باہر چلی گئی۔ تو یہ کیسی چل ہو رہی تھی اس کے جسم میں اور اب کیسی مایوسی ہوئی۔

"سالے جب اس نے تحفے لے لئے تھے تو ذرا یہاں سے دفعان ہو جاتے چھاتی پہ کیوں سوار رہے" اسے ذرا سا غصہ آگیا۔

"دیکھئے کمپونڈر صاحب میں نے ہی تو کہا تھا کہ تحفے دے ہی چکئے ورنہ قابو میں آنا مشکل ہے، اور اب مجھی کو ڈانٹ رہے ہیں" حسین منہ سکیڑ کر منمنایا مگر چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور صدیق اس طرح کھڑا تھا جیسے اسے کسی بات سے مطلب ہی نہ ہو۔

"مان گئے تھے استاد" سلیم ہنس دیا۔

"تو پھر ہو جائے اس خوشی میں دین محمد کی دکان سے پلاؤ کی ایک ایک پلیٹ" حسین بھیگے بھیگے ہونٹوں پہ جلدی جلدی زبان پھیرنے لگا۔

"ابے صرف پلاؤ؟ تو دیکھ تو رات کیا کیا ہوتا ہے"۔ سلیم بالکل آپے میں نہ تھا۔ آج ہی تو اس نے مہم سر کی تھی۔ ورنہ اب تک تو بغیر مہم سر کئے ہی سب کچھ ملتا رہا ——— دوائیں بتا رہا تھا لیکن ذرا بھی دھیان ساتھ نہ دے رہا تھا۔ نرس کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی اور اس وقت کا انتظار سارے جسم میں رینگ رہا تھا جب دوسری بار نرس اس کے کمرے میں آئے۔

رات کھانے پہ ایسے ایسے جشن منائے گئے کہ کوئی دیکھتا تو اچھی بھلی برات کا کھانا یاد آجاتا۔ سلیم کھلاتے ہوئے احسان بھی جتا رہا تھا۔

"سالو ڈاکٹر صاحب تو صبح سے شام تک کھانے کے صرف دو دو روپے دیتے ہیں یہ سب میری گرہ کا خرچ ہو رہا ہے"۔

"بالکل کمپونڈر صاحب، اللہ آپ کا بھلا کرے، میں تو غلام ہوں آپ کا" یہ حسین نے بناسپتی گھی سے لتھڑے ہوئے ہاتھ بڑھا کر سلیم کے پاؤں پکڑ لئے۔

"ابے چھوڑ ساری پینٹ خراب ہو جائے گی"۔ اس نے ہنستے ہوئے پاؤں کھینچ لئے، حسین پھر کھانے میں جٹ گیا۔ صدیق اس طرح چپ چاپ کھاتا رہا جیسے مزے دار کھانوں کے بجائے گھاس کھا رہا ہو۔

حسین اور صدیق تو کھاتے ہی سو گئے مگر سلیم کے لئے رات درو پتی کی ساری ہو گئی۔ کسی طرح کاٹے نہ کٹ رہی تھی۔ اُٹھ اُٹھ کر پاؤں پٹختا۔ حسین کو جھنجھوڑتا کہ کچھ باتیں کرے مگر وہ ایک لمبی سی ڈکار لے کر پھر سو جاتا۔ کیسے کرب سے صبح ہوئی۔ مطب شروع ہوا تو اس کی آنکھیں زنانے کمرے کے پردے سے جا لگیں۔ کیسے مزے مزے کے خیال آرہے تھے۔ سارے سوکھے دنوں کا بدلہ سوچ سوچ کر مسکرائے دیتا تھا۔ حسین اس کی طرف دیکھتا تو زور سے ہنس پڑتا اور بڑی چیلسی آنکھ مارتا پھر مونچھ کی پھنگیاں ذرا اور اونچی کر لیتا۔ یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہی ——— ڈاکٹر کو آئے ڈیڑھ گھنٹے کے قریب ہو گیا تھا مگر اس نے ایک دفعہ بھی ادھر کا رُخ نہ کیا۔ ساری رات کی جگائی اور گرہ کا خرچ سب بیکار جا رہا تھا ذرا دیر اور گزری تو وہ بالکل تپ گیا۔

"سالی حرام زادی یا تو ٹھیک سے رہے یا ٹلے یہاں سے، نخرے دکھاتی ہے ———" اسے بہت سی گھنی گھنی گالیاں یاد آنے

لگیں۔ "نکمہ مارنا بھول کر اب حسین کو ذرا فوراً اسے کام پر جھڑکیاں دے رہا تھا۔

ابھی دل ہی دل میں گالیاں بکنے کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ آگئی۔ اس نے تحفے کی نگوں جڑی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ اس نے آتے ہی بڑے میٹھے پن سے پہلے سلیم کو اور پھر صدیق اور حسین کو دیکھا۔ سلیم کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ حسین ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"اچھے تو ہیں آپ؟"

"ہاں آج تو بالکل اچھا ہوں سسٹر" ——— سلیم نے حسین کو کھسکنے کا اشارہ کیا ——— "یہ چوڑیاں تو آپ کے ہاتھوں پر بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔"

"آپ نے اتنی محبت سے دی ہیں تو اچھی نہ لگیں گی" کیسی شفقت تھی اس کی نظروں میں۔ سلیم کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ——— واہ یہ اچھی رہی خود تو مرمٹی ہیں اور ذکر کرتے شرم آتی ہے ——— اس نے دل ہی دل میں بڑے فخر سے سوچا۔

"چلو بھئی ڈاکٹر صاحب مردانے کمرے میں جا رہے ہیں جلدی سے نسخے لاؤ" حسین صدیق کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔ راستہ بالکل صاف تھا ——— سلیم پاگلوں کی طرح جھپٹا اور اسے سینے میں دبوچ لیا۔ ہڈیاں پسلیاں کڑکڑا کر رہ گئیں۔ مونچھوں کی پھنگیوں نے چہرے کا حلیہ تباہ کر دیا۔ نرس نے اس اچانک حملے سے ایک لمحے کو آنکھیں پھاڑ دیں اور پھر خود کو چھڑاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ نوچنے لگی۔

"کتے کے بچے، بدمعاش، حرامزادے" ——— وہ غصے سے دیوانی لگ رہی تھی ——— "میں پہلے ہی دن تجھے سمجھ گئی تھی مگر اب میرا خیال تھا کہ تو شریف بن گیا ہے، اب تجھے ایک جگہ کام کرنے کی لاج آگئی ہے، اسی لئے مجھے تحفے دے رہا ہے مگر تو رہا لفنگا ہی" ——— اس نے ہاتھوں سے چوڑیاں اتار کر اس کے منہ پر مار دیں۔ حسین اور صدیق نسخے اور دواؤں کی شیشیاں لئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ سلیم کا چہرہ پیلا ہو گیا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب کا تصور روندتا روندتا کہ اس کے کلیجے کو روند رہا تھا۔

"میرا کوئی قصور نہیں سسٹر، یہ سب کمپونڈر صاحب کا قصور ہے، مجھے نوکری سے نہ نکلوایئے گا میری ماں بھوکی مر جائے گی، بڑے فاقے سکے ہیں ہم دونوں نے، سسٹر میری ماں کو گٹھیا کا مرض ہے" ——— صدیق نرس کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھ کر آپ ہی آپ بول اٹھا۔

"اچھا تو تیرے رستے تم سب حرامزادے ہو یہ بدمعاشی کا اڈا بنا رکھا ہے" ——— اس نے صدیق کے پیچھے چھپتے ہوئے حسین کو بھی زور سے گھورا ——— "شرم نہیں آتی، ڈاکٹر صاحب کی شرافت سے فائدہ اٹھاتے ہو" ——— وہ ایک لمحے کو رک کر سلیم کو گھورنے لگی ——— اور تم سب سے بڑے حرام زادے، تمہاری تو صرف یہ سزا ہے کہ تمہارا سارا کنبہ بھیک مانگے۔ تم کو ایک منٹ کے لئے یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ فاقے کرو گے تو چٹکی بجانے میں شرافت آجائے گی، بس اتنے ہی فاقے کرو جتنے میں نے کئے ہیں۔ انسان بن جاؤ گے حرام زادے" وہ ایک دم رو پڑی۔

مجھے نہ نکلوایئے گا سسٹر، میری ماں مر جائے گی، ہائے باپ رے ——— صدیق بھی رونے لگا۔ حسین کا جسم آندھی کے جھکڑوں میں لرزتا ہوا کمزور درخت لگ رہا تھا۔ سلیم جیسے پتھر بن گیا تھا۔ اس کے چہرے سے خون کی آخری چھینٹ بھی غائب ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی لگ رہی تھیں۔ دل آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا، برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ ہو رہی

تھی۔ نرس نے ایک دم آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ ایک لمحے تک کھڑی تینوں کو باری باری دیکھتی رہی اور پھر جانے کے لئے مڑ گئی۔

"آرام سے بیٹھو کتے کے بچو، کوئی آ رہا ہے، ڈسپنسری کو تو نہ بدنام کرو" وہ تیزی سے قدم اٹھاتی زنانے کمرے میں چلی گئی جہاں بیٹھ کر گھر جانے کے لئے ڈاکٹر کا انتظار کیا کرتی ——— سلیم نے بیٹھے بیٹھے جی سے آنے والے مریض کو دوا دے دی۔

"اب کیا ہوگا کمپونڈر صاحب" حسین سلیم کے قریب کھسکا۔

"چپ بیٹھ سالے"، وہ جھلایا۔ اپنی مصیبت کے آگے کس کا خیال آتا۔ جی ہی جی میں گھٹ رہا تھا۔

اب بھلا ان دو دو ٹکے کے نوکروں سے تو کچھ کہنے سے رہا۔ وہ دوائیں بناتے ہوئے نرس کو گھنی گھنی گالیاں دئے رہا تھا اور ڈاکٹر کے زنانے کمرے میں جانے کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔

"میں تو ڈاکٹر صاحب سے کہہ دوں گا میرا کوئی قصور نہیں یہ سب حسین اور کمپونڈر صاحب کا قصور ہے" صدیق پھسر پھسر روئے جا رہا تھا۔

"اُلو کے پٹھے اگر بکو اس کی تو سر توڑ دونگا، میں بھی بتاؤنگا کہ تو روپے کو سسٹر کی باتیں بتاتا تھا"

"میں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا کمپونڈر صاحب" صدیق اور بھی بلکا۔

"مت سالے، نوکری کی کیا کمی ہے۔ ہم تو اپنے کمپونڈر صاحب کے ساتھ رہیں گے، جہاں بھی جائیں وہ، تجھے بھی رکھ لیں گے مگر ایسی باتیں تو نہ کر" حسین اپنی لرزتی ہوئی ٹانگوں کو سہلاتے ہوئے جیسے کویں سے بولا۔ سلیم کچھ بھی نہ کر سکا۔ زبان پہ کانٹے سے چبھ رہے تھے۔

مریض آہستہ آہستہ رخصت ہوگئے ——— ڈاکٹر صاحب زنانے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ سلیم کو ان کے قدم بجلیوں کی طرح کوندتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"کمپونڈر صاحب، یہ نرس پہلی والیوں جیسی نہ تھی" حسین منمنایا۔

"کمپونڈر صاحب میرا کوئی قصور نہیں، ڈاکٹر صاحب سے آپ کہہ دیں کہ صدیق بے گناہ ہے، اللہ آپ کو دنیا میں بدلہ دے گا" صدیق نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ سلیم نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ مارے خوف کے دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ڈاکٹر روح کی طرح فوراً ہی نرس کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نہ آ گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ گزرے تو سلیم کو محسوس ہوا کہ بس اب وہ مرا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ دونوں کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔

"یہاں آؤ تم تینوں" ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے پکارا۔ سلیم بجلی سے چلنے والے پُرزے کی طرح اٹھا اور باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے حسین اور حسین کے پیچھے صدیق جیسے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سسٹر سے ملو یہ آج یہاں سے جا رہی ہیں، مجھے بہت افسوس ہے ——— ڈاکٹر صاحب کا لہجہ بھرایا سا ہو گیا ——— "جب سے یہ آئیں مریض عورتوں کا تانتا بندھ گیا تھا، اور ان سے خوش اتنی کہ دوائیں لینے کے بعد بھی اٹھنے کا نام نہ لیتیں ——— میں نے بہت سمجھایا مگر کہتی ہیں کہ اب جی نہیں لگتا" ——— حسین اور صدیق نے مسرت اور حیرت سے ملی جلی نظروں سے سلیم کی طرف دیکھا۔ سلیم نے چونک کر نرس کو دیکھا اور پھر اس کی ملامت زدہ نظروں کی تاب نہ لا کر سر جھکا لیا۔

"اچھا نرمیاں صدیق اب ہم چلے، سب کو سلام" ——— وہ ایک دم جانے کے لئے مڑ گئی اور تیزی سے کار میں جا بیٹھی۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور گلی کی نکڑ پہ غائب ہوگئی۔ ایک لمحے کو تینوں یوں چپ چاپ کھڑے رہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر

حسین دوڑ کر سلیم کے لپٹ گیا۔ صدیق چپ کھڑا بڑی خوشامدی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"میں نے تو آپ کا کوئی قصور نہیں کیا کمپونڈر صاحب" صدیق گھگھیایا۔ سلیم نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"ابے چھوڑ ان باتوں کو" ——— حسین خوشی سے اچھلا پڑتا۔ سلیم بالکل خاموش تھا۔ ذرا دیر بعد وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اندر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ لپٹا ہوا بستر اٹھا کر بنچ کے سرہانے رکھا اور لمبا لمبا لیٹ گیا۔

"کمپونڈر صاحب، پھر ہو جائیں اس خوشی میں موتی چور لڈو، خدا قسم کل دیکھے تھے دکان پر، بالکل گیندے کے پھول لگ رہے تھے، آج تو خوب جشن منائیں گے، اللہ نے اس بلا کو ٹالا، بڑی سسور کی بچی تھی کمپونڈر صاحب" حسین کے ہونٹوں کے گوشوں سے رال کے موٹے موٹے قطرے پھوٹے پڑتے۔

"اس کے لئے بکرا اس کی تو یاد رکھنا سر پھوڑ دونگا سالے کا" ——— سلیم نے بازوؤں میں منہ چھپا لیا اور آنسوؤں کا ایک ریلا اس کی آنکھوں میں جل تھل مچا گیا۔

فردوسی

سیّد عابد علی عابدؔ

راوی ۱۔ سن ۳۶۵ھ ہجری ہے۔ بمقامِ ولایت خراسان کلک گزر طوس ہے۔ اس وقت ایران میں یہ کیفیت ہے کہ آلِ سامان کا نیّرِ اقبال نصف النہار پہ پہنچ کر آہستہ آہستہ غروب ہو رہا ہے۔ ابھی تک پرانے جاہ و جلال کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ دودمانِ غزنوی کے چڑھتے ہوئے سورج کے مقابلے میں اب سامانیوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔

راوی ۲۔ خراسان پہ انہی کی عملداری ہے انہی کا سکّہ جاری ہے۔ لیکن امیروں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں آلِ سامان کے فرمانروا اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ ان اُمرا میں دودمانِ سیمجوری کے افراد سربرآوردہ ہیں۔ انہی کے گھرانے کا ایک نامور امیر ابوالحسن محمد بن ابراہیم سیمجوری ان دنوں خراسان میں نائب السلطنت ہے۔

راوی ۳۔ اسی سیمجوری امیر کے عہدِ سلطنت میں عامل طوس ابومنصور بن عبدالرزاق نے کہ محمد لشکری کے نام سے بھی معروف ہے ایرانِ قدیم کی ان تمام بکھری ہوئی روایات کو جمع کر دیا جو پہلوی کتابوں میں ستاروں کی طرح پڑی جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ افراسیاب تورانی کی خونخواریاں، رستم کی وفاداریاں، اسفندیار کا ہفت خواں۔ رودابہ کی دلپذیر داستان تھی کہ موبدوں کی زبان پر تھی۔ اور اب کتابی شکل میں مدون ہو چکی ہے۔

راوی ۱۔ دقیقی طوسی نے کہ اس زمین کا فرزندِ جلیل تھا اس داستان کے کچھ ٹکڑوں کو نظم کیا تھا اور اس نے یہ چنگاری کچھ اس طرح سلگائی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی بجھی ہوئی راکھ گرمیٔ حیات سے روشن رہی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی ایرانِ قدیم کی داستانیں اشعار کی شکل میں لوگوں کی زبانوں پر چڑھی رہیں۔ گیتوں میں ڈھلتی رہیں اور کانوں میں شہد و شکر گھولتی رہیں۔

راوی ۲۔ دقیقی نے جس قصرِ جلیل کی بنیاد رکھی تھی، تقدیر کو یہ منظور تھا کہ اس کو نقش و نگار سے مزیّن کرنے والا کوئی اور شخص ہو۔ اسی شخص کو اپنے خونِ جگر سے اس نہالِ آرزو کی آبیاری کرنی تھی۔ اسی شخص کو پینتیس ۳۵ سال کی جگر کاوی

کے بعد صلے سے محروم رہنا تھا۔ اسی شخص کی قسمت میں لکھا تھا کہ ایرانِ قدیم کی داستانوں کو شعر کی انگشتری میں نگینے کی طرح جڑ دے۔ اسی شخص کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ "استادِ سخن" کہلائے۔ رہتی دنیا تک زندہ رہے۔ اس شخص کی جگر کاوی اور جانفشانی، مایوسی اور حرماں کی ایک ہلکی سی جھلک ہم آج آپ کو دکھاتے ہیں۔

(ایک زنانہ آواز یہ شعر گائے گی)

آفرین بر روانِ فردوسی آں ہمایوں نژادِ فرخندہ
او نہ استاد بود و ما شاگرد او خداوند بود و ما بندہ

راوی - تو یاد رہے کہ ۳۶۵ ہجری ہے مقام طوس ہے کہ ولایت خراسان کا مرکز ہے۔

ایک آواز - حکیم ابوالقاسم۔

دوسری آواز - المنصور الفردوسی۔

(ایک زنانہ آواز یہ شعر گائے گی)

در شعر سہ تن پیمبران اند
ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

فردوسی - نوشابہ۔

نوشابہ - کیوں ابوالقاسم۔

فردوسی - نوشابہ! آج رات مجھے نیند نہیں آتی۔ دو گھنٹے ہو گئے کروٹیں بدل رہا ہوں۔ نیند نہیں آتی نوشابہ۔

نوشابہ - کیوں کیا بات ہے ابوالقاسم۔

فردوسی - یہ تو نہیں بتا سکتا۔ (وقفہ) یہ ذرا سامنے کا دریچہ تو کھولو (وقفہ) دیکھ رہی ہو۔ رات کتنی تاریک ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اہرمن نے وشت و راغ پر اپنے سیاہ پر پھیلا رکھے ہیں۔ ظلمت کی لہریں کالے ناگوں کی طرح پھنکارتی ہوئی بڑھتی نظر آ رہی ہیں۔ کیسی خوفناک رات ہے نوشابہ۔ چاند مفقود۔ انجم غیر موجود۔ کیسا ہُو کا عالم ہے۔ ہر چیز سنسان۔ ہر مقام سنسان۔ وشت و در ویران۔ کیا ہُو کا عالم ہے۔

نوشابہ - ابوالقاسم۔ دل ویران اور سنسان نہ ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

فردوسی - یہ تو تم نے سچ کہا نوشابہ۔ پھر۔

نوشابہ - (ہنس کر) پھر کیا۔ سبھی انتظام ہو جاتا ہے۔ (بلند آواز سے پکار کر) ماہ رُو۔

ماہ رُو - سرکار۔

نوشابہ - دیکھ ماہ رُو چراغ روشن کر دے۔ چار مومی شمعیں بھی لے آ۔ اور دیکھ طاق میں انار اور بہی رکھے ہیں وہ بھی طشت میں رکھ کر لے آ۔

ماہ رُو - بہت خوب سرکار۔

فردوسی - اور دیکھ ماہ رُو۔

ماہ رُو - سرکار۔

فردوسی - نوشابہ ایک چیز بھول گئی۔

نوشابہ - کیا۔

فردوسی - (ہنس کر) بھلا بوجھو تو۔

نوشابہ - ہار مان لی۔ تم بتاؤ۔

ماہ رُو - میں بتاؤں سرکار۔

فردوسی - اچھا تم ہی بتاؤ۔

ماہ رُو - بیگم کا چنگ سرکار۔

فردوسی - بے شک۔ کیوں نوشابہ بھول گئیں تھی نا یا آج گاکر سنانے کی نیت ہی نہ تھی۔

نوشابہ - (ہنس کر) بھول نہیں گئی تھی۔ دانستہ چنگ نہیں منگوایا تھا۔

فردوسی - کیوں؟

نوشابہ - ماہ رُو تم جاؤ۔ ابوالقاسم میں آج تمہیں گانا سنانے کی بجائے ایک افسانہ سنانا چاہتی تھی۔

فردوسی - کیسا افسانہ!

نوشابہ - ایک دل پذیر داستان - ایرانِ قدیم کا ایک افسانہ۔ رستم کی شجاعت کی کہانی - بیژن کی شوریدہ سر جوانی - منیژہ کی داستانِ محبت سنو گے۔

فردوسی - (ہنس کر) ضرور سنوں گا۔ بن سُنے داستاں کا لطف آرہا ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔

نوشابہ - بن پوچھے منظور ہے۔

فردوسی - بہتر۔ اور شرط یہ ہے کہ پہلے گانا سناؤ۔

نوشابہ - (ہنس کر) منظور ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔

فردوسی - بن پوچھے منظور ہے۔ کیا شرط ہے۔

نوشابہ - گانا سنانے کے بعد بتاؤں گی۔

فردوسی - بہتر۔

نوشابہ - آگئیں مہ رُو۔ لاؤ چنگ مجھے دو۔ شمعیں روشن کر دو۔

فردوسی - نوشابہ۔ جہاں تمھاری شمعِ رخسار جلوہ افگن ہو وہاں قندیلوں کی ضرورت ہے؟

نوشابہ - (ہنس کر) ضرورت تو نہیں۔ لیکن تفریحاً روشن کرتی ہوں۔

فردوسی - (ہنس کر) بہتر (وقفہ) ہاں اٹھاؤ ناچنگ۔

نوشابہ - بہتر۔ سُنّنا ابوالقاسم اس شاعر مقتول کی غزل سناتی ہوں کہ عین جوانی میں مارا گیا۔

فردوسی - ہائے دقیقی - وائے دقیقی۔

نوشابہ - درست۔ دقیقی مقتول و مغفور کی غزل سنو۔

(یہ غزل ایرانی دُھن میں لیکن ہندوستانی مذاق کے مطابق گائی جائے گی۔)

درا فگندا اے صنم ابر بہشتی
زمیں را خلعت اُردی بہشتی
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی
بجائے نرمی و جائی درشتی
زگل بوئے گلاب آید بہ آنساں
کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیدہ است
بگیتی انہ ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ
مے چوں زنگ و کیش و زردہشتی

فردوسی - واہ واہ کیا غزل ہے۔ ہائے دقیقی - وائے دقیقی۔

نوشابہ - بے شک دقیقی کے مرنے کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن یہ خوشی بھی ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے ایسے جلیل القدر کام کی بنیاد رکھی کہ ایران اسے کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔

فردوسی - سچ ہے۔

نوشابہ - سُنو ابوالقاسم - آج تم نے مجھ سے ایک شرط ہاری ہے۔

فردوسی - بے شک لیکن جو اپنے آپ کو تمھاری محبت میں ہار چکا ہو اسے شرط ہارنے کا کیا رنج ہو گا۔

نوشابہ - ابوالقاسم - یہی بات میں تم سے کہنا چاہتی تھی۔

فردوسی - کیا۔

نوشابہ - کہ تم اپنے آپ کو میری محبت میں ہار چکے ہو۔

فردوسی - اور یہ بات تمھیں پسند نہیں۔

نوشابہ - ابوالقاسم۔ یہ تم نے کیا کہا۔ دُنیا میں کوئی ایسی بیوی ہے جسے یہ بات ناپسند ہو کہ اس کا میاں اس کی محبت میں اپنے آپ کو ہار چکا ہے۔

فردوسی - تو پھر۔

نوشابہ - ابوالقاسم میں سمجھتی ہوں تم ایسا کام کر سکتے ہو جو محبت میں مٹ جانے سے کہیں زیادہ عظیم الشان ہے۔ بیشک کسی کی محبت کا دم بھرنا۔ عمر بھر اس کا ہو رہنا عزتِ نفس کا ثبوت ہے۔ عالی نسبی کی دلیل ہے لیکن ابوالقاسم عورت کی محبت سے بڑھ کر بیوی کی چاہت سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی ہے۔ محبت کرنے کا اور چاہنے کا

ایک اور مقام بھی ہے۔

فردوسی - میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ تم سے محبت کرنے کے علاوہ تمہارا ہو رہنے کے علاوہ میرا کچھ اور منصب بھی ہے؟

نوشابہ - ہاں۔ ابوالقاسم تم اپنے منصب سے بے خبر ہو اپنے مقام سے ناواقف ہو۔ میں تمہارے دل کو جانتی ہوں صحرا کی طرح وسیع اور دریا کی طرح پُرشور اتنے وسیع دل میں صرف میری محبت ہو یہ مجھے گوارا نہیں۔

فردوسی - نوشابہ کیا کہہ رہی ہو۔

نوشابہ - ابوالقاسم میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ اپنے مقام کو پہچانو اپنے دل کی وسعت کا اندازہ کرو۔ یہ درست ہے کہ اس کے گوشے میں میری محبت بھی سمٹی ہوئی پڑی ہے۔ لیکن اس وسیع قلمرو کے بہت سے گوشے خالی ہیں جسے تم دل کہتے ہو۔ ابوالقاسم۔ ابوالقاسم۔ میرے منصور میرے فردوسی ان گوشوں کو بھی بھر دو۔

فردوسی - نوشابہ۔ کیا کہہ رہی ہو۔ مجھ سے کیا چاہتی ہو۔

نوشابہ - ابوالقاسم تم نے مجھ سے شرط ہاری ہے۔

فردوسی - ہاں۔ کیا چاہتی ہو۔

نوشابہ - بتاؤں کیا چاہتی ہوں ابوالقاسم میں چاہتی ہوں کہ جب سرما کی اندھیری راتیں آئیں اور تمہارا جی اداس ہو تو تم مجھے یاد نہ کرو۔ بلکہ اس سرزمین کو یاد کرو جس کی خاک سے تم پیدا ہوئے ہو۔ اس پاک سرزمین کے گیت گاؤ۔ جس کی ہواؤں نے تمہارے دل کو ٹھنڈک بخشی ہے جس کی فضاؤں میں تم پل کر جوان ہوئے ہو ابوالقاسم میرے فردوسی میری محبت کے گیت نہ گاؤ۔ ایران کی محبت کے گیت گاؤ۔

فردوسی - نوشابہ نوشابہ تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے ابوالقاسم کا دل صحرا کی طرح وسیع ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ تمہارے دل کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ تم مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میں ہمہ تن اس کام میں مصروف ہو جاؤں جسے دقیقی نے شروع کیا تھا۔

نوشابہ - ہاں۔

فردوسی - جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔ میری جان تمہارے ابوالقاسم کا دل کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ لیکن اتنا بڑا نہیں کہ اس میں وطن کی محبت کے ساتھ نوشابہ کی محبت بھی سما سکے۔

نوشابہ - شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن ابوالقاسم مجھے اس بات کا رنج نہیں میں خوشی سے اطمینان سے خود تمہارے گوشۂ دل سے نکل کر کہیں دور جا بیٹھوں گی۔ تاکہ تم وہ کام کر سکو جس کے لئے تمہیں پیدا کیا گیا ہے۔

فردوسی - نوشابہ یہ کام کٹھن ہے کیا تم سمجھتی ہو کہ فردوسی کے دل میں یہ خیال کبھی نہیں پیدا ہوا کہ وہ ایران کے ناموروں کے گیت گائے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ فردوسی نے کبھی نہیں سوچا کہ دقیقی کی طرح وہ بھی اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہو جائے۔ یہ کٹھن کام ہے نوشابہ۔ میری عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ کیا میں یہ کام کر سکوں گا۔ یہ سنگلاخ وادی طے کر لوں گا۔ اس میں عمر بیت جائے گی نوشابہ۔ ماہ و سال آئیں گے اور ماہ و سال جائیں گے۔ اور ابوالقاسم کے دل میں فقط ایک لگن ہوگی۔ ایران کی داستان۔ ایران کی داستان اس عالم میں فردوسی کو نہ بیوی کا خیال ہوگا نہ اولاد کا ملال ہوگا۔ تم یہ برداشت کرو گی؟ میری زندگی وفا کرے گی؟

نوشابہ - ابوالقاسم جو لوگ عظیم الشان کام کیا کرتے ہیں وہ یہ نہیں سوچا کرتے کہ ان کی عمر وفا کرے گی یا نہیں میری فکر اپنے دل سے نکال دو۔ تم جانتے ہو تمہاری کنیز کی رگوں میں ساسانی دودمان کا خون موجزن ہے میں صبر کروں گی اور شکر کروں گی کہ اللہ نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ میرے شوہر نے مجھ کو اور میری محبت کو ایران کی محبت پہ

قربان کر دیا۔

فردوسی ۔ نوشابہ۔ نوشابہ۔ تو نے آج میرے دل کی سوئی ہوئی تمنائیں جگا دیں۔ تو نے ان چنگاریوں کو ہوا دی جنہیں میں اپنے دامن کے پیچھے چھپائے ہوئے تھا اگر میں کچھ کر سکا تو تو یقین جان وہ تیرے ہی طفیل ہوگا۔

نوشابہ ۔ ابوالقاسم میں صرف اسی پہ قانع ہوں کہ آنے والی نسلیں کہیں کہ حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی نے ایران قدیم کو زندہ کرنے کے لئے نوشابہ کی محبت کا گلا گھونٹ دیا اور یہ موت نوشابہ نے ہنسی خوشی قبول کر لی۔ اس سے زیادہ کسی بات کی تمنا نہیں۔

فردوسی ۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں یہ کام کر سکوں۔

نوشابہ ۔ ایسا ہی ہوگا اور ابوالقاسم۔

فردوسی ۔ ہاں نوشابہ۔

نوشابہ ۔ اس بابرکت کام کا آغاز آج ہی ہوگا۔ فردوسی کو معلوم ہو کہ نوشابہ کو ایران قدیم کی ایسی داستانیں یاد ہیں جن سے خدائی نامے کے صفحات بھی آگاہ نہیں آج نوشابہ فردوسی کو بیژن اور منیژہ کی وہ رنگین داستان سنائے گی جس کے نور سے ایران کی تاریخ آج تک درخشاں ہے۔

فردوسی ۔ ہاں تم نے وعدہ لیا تھا کہ تم منیژہ کی اور منیژہ کی داستان سناؤ گی۔

نوشابہ ۔ اور تم اسے شعر کے قالب میں ڈھالو گے۔

فردوسی ۔ سچ ہے۔ سنا دیجئے۔

نوشابہ ۔ تو سنو ابوالقاسم کیخسرو کا دربار برپا ہے۔ امرا اور وزرا دست بدستہ دو رویہ کھڑے ہیں۔ ایک طرف شوریدہ سر نوجوان بیژن بھی کھڑا ہے۔ کیا نوجوان ہے سبزہ آغاز ہے۔ قامت دراز ہے۔ چہرہ آفتاب کی روشنی میں حریف گلشن۔ دربار میں دست بدستہ کھڑا ہے اور غور سے ۔ ۔ ۔

(آواز آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہوتی ہے)

راوی ۔ یوں شاہنامے کا آغاز ہوا یوں وہ منظومہ بے مثال وجود میں آیا، جس کی بدولت فردوسی اور ایران آج زندہ و جاوید ہیں، اب ابوالقاسم فردوسی نے دنیا کے تمام کاروبار چھوڑ کر پرانی داستانوں کی جستجو شروع کی۔ ابومنصور محمد کی ہمت سے جو کتاب مدون ہو چکی تھی حاصل کی۔ مجوس کے پرانے بڈھوں سے پرانے وقتوں کی کہانیاں سنیں اور شبانہ روز محنت کر کے ان کہانیوں کو ترتیب دیا۔

راوی ۔ جب فردوسی نامۂ خسروان کے تمام نسخے دیکھ چکا تو خیال آیا کہ موبدوں کے پاس کچھ پرانی داستانیں اور بھی ہوں گی ایران قدیم کے رازداروں کو ملنے کے لئے اب فردوسی یکہ و تنہا اللہ کا نام لے کر وطن سے نکلا۔ مرد گیلہ ہرات گیا، بخارا پہنچا۔ احمد بن سہل سے ملا۔ آزاد سرو سے ملاقات کی۔ پانچ سال خاک چھاننے کے بعد طوس لوٹا تو معلوم ہوا کہ پرانے اور سرپرست خدا کو پیارے ہو چکے ہیں۔ معاش کا کفیل کوئی نہیں لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ شاہنامہ نظم کرنے کے لئے پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا۔ صبح ہی صبح اپنے پائیں باغ میں چلا جاتا اور شام کو جب چراغ روشن ہوتے تو واپس آتا۔

راوی ۔ یوں بیس سال گزر گئے۔ بیس سال۔ بیس بار بہار آئی اور بیت گئی۔ لیکن فردوسی نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ بیٹھا لکھتا رہا۔ ان بیس سالوں میں فردوسی کے سر پہ قیامت بیت گئی پہلے نوشابہ اللہ کو پیاری ہوئی اور اس رفیق سفر کا ساتھ چھوٹا جس نے ایران کی محبت کے لئے شوہر کی محبت کو تیاگ دیا تھا۔ فردوسی نے ایک ہاتھ دل پہ رکھا دوسرے میں قلم تھاما اور سر جھکا کے لکھتا رہا۔ ابھی اس صدمے کا داغ تازہ تھا کہ اکلوتے جوان لڑکے کا داغ مفارقت دے

گیا۔ اس صدمے نے فردوسی کی کمر توڑ دی آنکھوں کی بینائی کم ہوگئی۔ اس مرحلے پر فردوسی کی لڑکی فرنگیس نے ماں کی طرح باپ کی ہمت بڑھائی۔

راوی ۔ اسی طرح کچھ وقت اور بیت گیا یہاں تک کہ سن ۳۹۰ ھ سے پہلے فردوسی کی مالی حالت نہایت خراب ہوگئی۔ جو سرمایہ تھا، پرانی داستانیں مہیا کرنے پر صرف ہو گیا۔ آمدنی کے راستے مسدود ہو گئے۔ اس مرحلے پر حسین قتیب نے اور علی دیلم بودلف نے کہ طوس کے امرا میں سے تھے فردوسی کی اعانت کی اور فردوسی برابر اپنے کام میں مصروف رہا۔ خونِ جگر کھاتا رہا اور شاہنامہ لکھتا رہا۔

راوی ۔ اس زمانے میں جو خیال فردوسی کے لئے سوہانِ روح تھا، وہ یہ تھا کہ فرنگیس فردوسی کی لڑکی جوان ہو چکی تھی اس کی شادی کا اس کے جہیز کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔ عاملِ طوس فردوسی کی حسبِ دلخواہ مدد نہیں کر سکتا تھا۔ فردوسی فرنگیس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا جس میں نوشابہ کے خد و خال جھلکتے تھے اور آنکھوں میں آنسو لا کر خاموش ہو جاتا تھا، یہ نوبت آن پہنچی تو فردوسی سے کام نہ ہوتا تھا۔ شعر کہنا چاہتا تھا۔ اور فرنگیس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور پھر اس کے نقش و نگار نوشابہ کے نقش و نگار میں گھل مل جاتے تھے، یہاں تک کہ سن ۳۹۰ ہجری آن پہنچا۔

راوی ۔ تو یاد ہے کہ سن ۳۹۰ ہجری ہے۔ مقام طوس ہے۔

فرنگیس ۔ ابا جان۔

فردوسی ۔ ہاں بیٹی فرنگیس۔

فرنگیس ۔ امیر حسین قتیب اور علی دیلم آپ سے ملنے آئے ہیں۔

فردوسی ۔ انہیں یہیں بھیج دو بیٹی۔

فرنگیس ۔ بہتر۔ (وقفہ)

فردوسی ۔ آؤ علی دیلم آؤ قتیب۔

علی دیلم ۔ ابوالقاسم۔ آج میں نے شاہنامے کے اشعار احتیاط سے شمار کیا۔ انچاس ہزار تین سو پچپن اشعار نکلے:

حسین ۔ ماشاء اللہ سبحان اللہ اور کیسے کیسے اشعار ہیں۔ لوگ محفلوں میں گاتے ہیں اور سننے والوں کے دلوں کو گرماتے ہیں۔

علی دیلم ۔ کل میں نوقان کے پاس سے گذرا تو کیا سنتا ہوں ایک مطرب یہ شعر گا رہا ہے۔

بہ روزِ نبرد آں یلِ ارجمند
بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

حسین ۔ واہ کیا تصویر کشی ہے۔

علی دیلم ۔ اور آج ہی میں یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

کنوں خورد باید مئے خوشگوار
کہ مے بوئے مشک آرد از جویبار
ہوا پُر خروش و زمیں پُر ز جوش
خنک آں کہ دل شاد دارد بہ نوش
ہمہ بوستاں زیرِ برگِ گل است
ہمہ کوہ پُر لالہ و سنبل است

حسین ۔ ابوالقاسم تم آج چپ چپ ہو۔

علی دیلم ۔ کیا بات ہے فردوسی؟

فردوسی ۔ کچھ نہیں۔

حسین ۔ پھر اس خاموشی کی وجہ؟

فردوسی ۔ میں نے کہا نا کچھ نہیں۔

علی دیلم ۔ ابوالقاسم تمہاری رفاقت میں ہم لوگوں کی عمریں بیت گئیں کیا اب ہم تمہارے بُشرے کو بھی نہیں پہچانتے۔ کیوں

چپ ہو؟

فردوسی ۔ کیوں چپ ہوں ۔ اس لئے چپ ہوں ۔ کہ بہت کچھ کہہ لیا ، پچاس ہزار اشعار کہہ چکا ہوں پچاس ہزار اشعر کہتے ہوئے مجھے بیس سال ہو گئے ۔ علی دیلم کیا مجھے اب چپ رہنے کا حق نہیں پہنچتا ۔

علی دیلم ۔ ابوالقاسم ۔

فردوسی ۔ ذرا ٹھہرو علی دیلم ۔ اب میری بات سن لو ۔ میں یہ سوچ کر چپ ہوں کہ میں نے عمر گنوا دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیس سال سے سنتے ہو قتیب میں اہل و عیال سے بے نیاز ہو کر شعر کہہ رہا ہوں ۔ حیف ہے مجھ پر ۔ نوشابہ مر گئی میرے دل پہ کوئی اثر نہ ہوا ۔ میں شعر کہتا رہا ۔ پھر اللہ نے اس گھر کو ایک چراغ بخشا تھا ۔ ایک ہی لڑکا تھا ۔ وہ خدا نے چھین لیا ۔ میں پھر بھی چپ ہوا اور شعر کہتا رہا ۔ لیکن اب شعر نہیں کہے جاتے ۔ علی دیلم اب چپ ہی رہنے کو جی چاہتا ہے ۔ اب فرنگیس کی صورت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی ۔ دیکھو علی دیلم میری عمر ستر کے لگ بھگ ہو گئی ۔ خدا نے مجھے فرنگیس بڑھاپے میں عطا کی تھی ، آج بیس سال ہوئے ہیں ۔ اللہ نے میری کہولت پر میری تنہائی پر رحم کیا تھا ۔ مجھے فرنگیس بخشی گئی تھی ۔ اور میں نے اس نعمت سے کیا سلوک کیا ۔ جانتے ہو حسین؟ جانتے ہو علی دیلم؟

علی دیلم ۔ ابوالقاسم!

فردوسی ۔ ہاں میں نے شاہنامہ کہنے کی دھن میں اس نعمت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ۔ یہ بچی فرنگیس ماں کی گود میں پلتی رہی اور پھر صحن میں کھیلتی رہی میں نے اس کے منہ سے توتلی باتیں نہیں سنیں ۔ اس کی توتلی باتیں تب سنتا جو چپ رہتا لیکن میں تو شعر کہہ رہا تھا ۔ اور پھر

حسین قتیب ۔ ابوالقاسم!

فردوسی ۔ اور پھر اس بچی نے ہوش سنبھالا اور مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنی چاہیں ۔ لیکن علی دیلم یہ باتیں میں تب سنتا جب چپ رہتا اور میں تو شعر کہہ رہا تھا ۔ اور پھر اس بچی کی ماں مر گئی ۔ وہ عورت مر گئی ۔ جس نے ایران کی محبت پر اپنے گھر کے سکھ چین کو قربان کر دیا تھا ۔ اور اس بچی کا کوئی سہارا نہ رہا اور اپنے باپ کی طرف دوڑی کہ باپ اسے سینے سے لگائے گا لیکن بدبخت باپ ایسا نہ کر سکا ۔ اس نے تو سینے سے شاہنامے کے اجزا لگائے ہوئے تھے ۔ اور اب کہ میری عمر ستر سال کی ہو گئی ہے میں اس بچی کے منہ کی طرف دیکھتا ہوں ۔ اور میرا چپ ہو جانے کو جی چاہتا ہے اس بچی کا کیا بنے گا حسین ۔ اس کی شادی کون کریگا ، علی دیلم اس کا جہیز کس طرح تیار ہو گا ۔

علی دیلم ۔ ابوالقاسم ۔ فرنگیس میری بچی ہے ۔

حسین ۔ فردوسی! میں فرنگیس کا عم ہوں ۔

فردوسی ۔ درست ہے ۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اے فردوسی تو شعر کہتا رہ تو چپ نہ ہو جا ۔ اور جس طرح عمر بھر ہم نے حتی المقدور تیری اور تیرے اہل و عیال کی کفالت کی ہے تیرے مرنے کے بعد بھی ایسا ہی کریں گے ۔ لیکن علی دیلم ، حسین اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا ۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس بچی سے جو سلوک میں نے کیا ہے اس کی تلافی کر جاؤں ۔ صرف اتنا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں چاہتا میں جانتا ہوں علی دیلم اور حسین قتیب کہ تم جی کھول کر میری بچی کے ساتھ سلوک کرو گے لیکن اس سے میرا جی ٹھنڈا نہ ہو گا ۔ میرا دل تب خوش ہو گا ۔ جب میری بچی یہ سمجھے کہ میرے باپ نے میری کفالت کی ہے ۔

علی دیلم ۔ ابوالقاسم کیا چاہتے ہو ۔ کیا سوچا ہے تم نے ۔

فردوسی ۔ سنتا ہوں ۔ آج کل غزنی میں سونا برس رہا ہے ۔ سنتا ہوں آج کل غزنی میں چاروں طرف سے شعرا اور حکما

کھنچے چلے آ رہے ہیں سُنتا ہوں آلِ سبکتگین کے چشم و چراغ محمود کے گرد نوجوان قصیدہ سراؤں کا ہجوم ہے سوچتا ہوں ان میں بوڑھے فردوسی کو بھی بار مل سکتا ہے۔ سوچتا ہوں عمر بھر کی جگر کاوی کا صلہ میسّر ہو سکتا ہے۔ سوچتا ہوں۔ فرنگیس کا جہیز بن سکتا ہے۔ میں پیاسا ہوں علی دیلم دریا کنارے جانا چاہتا ہوں۔

علی دیلم - سچ ہے۔ غزنی میں محمود حکمران ہے اور وہ شعر و سخن کا قدر دان ہے۔

حسین قتیب - تو ابو القاسم غزنی جانے سے کیا چیز مانع ہے زادِ راہ میرے ذمّے ہے اور آگے۔

فردوسی - جو فردوسی کی قسمت میں لکھا ہے۔ علی دیلم مسودہ تیار کر لو۔ میرے ساتھ غزنی چلو اب میں طوس میں نہ رہوں گا اب مجھ سے فرنگیس کی صورت نہیں دیکھی جاتی۔

علی دیلم - تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ مسودے کا انتظام کر دوں۔

حسین - میں بھی رخصت ہوں۔ تمہارے سفر کا انتظام کر دوں۔ (وقفہ)

فرنگیس - ابا جان۔

فردوسی - ہاں بیٹی فرنگیس۔

فرنگیس - آپ ہی آپ ہنس رہے آپ۔

فردوسی - ہاں بیٹی فرنگیس۔ میں غزنی جا رہا ہوں غزنی جہاں محمود حکمران ہے اور سنا ہے وہ شعر و سخن کا قدر دان ہے (ایک زنانہ آواز یہ شعر گائے گی۔ وھن

چھایانٹ یا درباری ہو)

تن شاہ محمود آباد باد
ہمیشہ بہ کام دلش شاد باد
چنانش ستودم کہ اندر جہاں
سخن ماند از و آشکار و نہاں
ہمش رائے و ہم دانش و ہم نسب
چراغ عجم آفتاب عرب

راوی - آخر پیاسا دریا کنارے پہنچا۔ فردوسی نے غزنی پہنچ کر پہلے فضل بن احمد اسفرائنی کی بارگاہ کا رُخ کیا کہ محمود غزنوی کا وزیر باتدبیر تھا اور ایران سے اس کی عقیدت اور محبّت مسلّمہ تھی۔ یہی وہ اسفرائنی ہے جس نے غزنوی دفاتر کی زبان عربی کی بجائے فارسی کر دی تھی۔ باحوصلہ فضل بن احمد اسفرائنی نے فردوسی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نوازشِ شاہانہ کا امیدوار بنایا اور آخر ایک دن نصر بن ناصر الدین سبکتگین کی وساطت سے فردوسی نے شاہنامے کا نسخہ محمود غزنوی کے نام سے منسوب کر کے دربار میں پیش کیا۔

راوی - محمود نے فرمان صادر کیا کہ شاہنامے کی تصنیف کا کام جاری رہے۔ فردوسی کو یقین ہو گیا۔ کہ یہاں سے حسب دلخواہ جانفشانی کا صلہ ملے گا۔ اگرچہ اس کی عمر ستّر سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور صدموں نے نڈھال کر دیا تھا لیکن خدا کا نام لے کر پھر بیٹھ گیا۔ دس ہزار کے قریب اشعار اور لکھے اور اب شاہنامہ مکمل کرنے کے بعد اشعار کا شمار کیا تو معلوم ہوا کہ ساٹھ ہزار شعر لکھے جا چکے ہیں۔

راوی - اس دَوران میں فضل بن احمد اسفرائنی کہ فردوسی کا مربّی خاص تھا معتوب بارگاہ ہونے کے بعد وزارت سے معزول ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ خواجہ بزرگ احمد بن حسن میمندی نے لی تھی کہ اصابت رائے اور حسنِ تدبر میں اپنی نظیر آپ تھا اس نے بھی فردوسی کی تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور آخر کار جب شاہنامہ مکمل ہو چکا اور فردوسی کی عمر بھی اسّی سال کے لگ بھگ ہو گئی تو یہ بدنصیب شاعر متمنّی ہوا کہ طوس جانے کی اجازت مرحمت ہو کہ فرنگیس کی شادی کا انتظام کرے۔

راوی - اسی گفت و شنید میں چھ ماہ کے قریب اور بیت گئے

یہاں تک کہ ۳۹۹ھ ہجری آن پہنچا۔ تو یاد رہے کہ اب مقامِ محمود کا پایہ تخت غزنی ہے اور سن ۳۹۹ھ ہجری۔

(ایک زنانہ آواز یہ رباعی گاتی ہے
دھن کدارے کی ہوگی، ٹھیکے کے ساتھ)

اے شب نہ کنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش
رازِ دلِ من مکن چناں فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم
ہاں اے شبِ وصل آں چناں باش کہ دوش

محمود ۔ مرحبا۔ کیا خوش آوازی ہے۔ کیا سحر سازی ہے ابوسہل ہمدانی۔

ابوسہل ۔ ارشاد یا سلطان۔

محمود ۔ یہ ترکی کنیز جو تم نے ہماری خدمت میں پیش کی ہمہ صفت موصوف ہے۔ سرو قامت، مہر طلعت، مژگاں دراز، سحر ساز اور پھر اس پہ ایسی خوش آواز، سبحان اللہ۔

ابوسہل ۔ سلطان عالم۔ بندہ حضور کا خانہ زاد غلام ہے۔

محمود ۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور تمھیں اپنی نوازش شاہانہ کا یقین دلاتے ہیں (وقفہ) تمھاری آرزو ہو تو بیان کرو پوری کی جائے گی۔

ابوسہل ۔ یا سلطان صرف یہی آرزو ہے کہ عمر بھر آپ کے قدموں میں مقیم رہوں۔

محمود ۔ ہم تمھاری وفاداری کے اظہار سے بہت خوش ہوئے تم ہمارے دبیر تو ہو ہی۔ آج سے ہم تمھیں اپنا میر دبیر مقرر کرتے ہیں۔ تمھاری انشا پردازی اور تمھاری فصاحت و بلاغت کا یہ جائز صلہ ہے جو تمھیں آج دیا گیا ہے (وقفہ) کیوں حاجب۔

حاجب ۔ ایہا السلطان۔ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین اور خواجہ بزرگ احمد بن حسن میمندی شرف باریابی کے متمنی ہیں۔

محمود ۔ اجازت ہے (وقفہ) آؤ نصر خوب آئے اور خواجہ بزرگ بھی تمھارے ساتھ خوب موقع پر پہنچے دیکھو یہ ترکی کنیز ابوسہل ہمدانی نے ہماری خدمت میں تحفہ کے طور پہ پیش کی ہے۔

نصر ۔ ماشاء اللہ۔

احمد ۔ سبحان اللہ۔

محمود ۔ تم دونوں نے ابھی اس کی خوش گلوئی کا کمال نہیں دیکھا یہ عالم ہے کہ مطرب فلک کو بھی رشک آئے۔ ہم چاہتے تھے کہ فرخی بھی آجاتا وہ چنگ چھیڑتا اور یہ کنیز گاتی۔ کیوں خواجہ بزرگ کیا خیال ہے؟

احمد ۔ ایہا السلطان کل رات فرخی ....

محمود ۔ (ہنس کر) ہم سمجھ گئے۔ پھر محتسب کی گرفت سے بچا رہا یا نہیں۔

احمد ۔ اللہ نے اپنا فضل کیا۔

محمود ۔ اچھا خیر تو خمار نے فرخی کو آج اٹھنے نہیں دیا۔

احمد ۔ جی ہاں۔

محمود ۔ معلوم ہوتا ہے نصر تم مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہو اور شاید اس سلسلے میں خواجہ بزرگ کو بھی ساتھ لائے ہو۔

نصر ۔ سلطان کا ضمیر منیر جامِ جہاں نما ہے۔

محمود ۔ اچھا تو ابوسہل اس کنیز کو رخصت کرو (وقفہ) ہاں نصر۔

نصر ۔ ایہا السلطان میں شاہانہ توجہات کو اس بدنصیب شاعر کی طرف مبذول کرانے کی جرأت کرتا ہوں جس نے پینتیس سال خونِ جگر کھایا اور ایران باستان کے ساتھ دودمانِ غزنی کے چشم و چراغ سلطان محمود کا نام بھی روشن کر دیا ہے۔

احمد ۔ ایہا السلطان۔ اس کہن سال شاعر نے اس ضعیفی اور پیری کے عالم میں کیسے کیسے اشعارِ آبدار لکھے ہیں اب بچارہ چراغِ سحری ہے شمعِ آخرِ شب ہے۔ کام کی

تکمیل کر چکا ہے۔ طوس لوٹ جانے کا متمنی ہے کہ اپنی بیٹی فرنگیس کی شادی کا انتظام کرے۔

محمود ۔ ہم حکیم ابوالقاسم فردوسی سے بہت خوش ہیں اور اسے خوشی سے طوس جانے کی اجازت مرحمت کرتے ہیں۔ واقعی حکیم نے عمرِ عزیز شاہنامے کی تصنیف میں بسر کر دی ہے۔ ہماری نوازش پر اس کا حق ہے۔ ہم سخن کے قدردان ہیں وہ سخن کا پروردگار ہے۔ کیوں خواجہ بزرگ فردوسی کو اس کی محنت کا کیا صلہ دینا چاہیئے؟

احمد ۔ عالم پناہ۔ فردوسی کو صلہ اس کی محنت کے مطابق نہیں آپ کے حوصلے کے مطابق ملنا چاہیئے۔

محمود ۔ درست ہے۔ ہم اسے اپنے حوصلہ کے مطابق نوازیں گے۔ اشعار کی تعداد ساٹھ ہزار ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسے ساٹھ ہزار دینار عطا ہونے چاہئیں۔

نصر ۔ ایہا السلطان۔ فردوسی خوش نصیب ہے کہ ایسے فیاض اور دریادل بادشاہ کے حضور میں پہنچا۔

احمد ۔ سلطان عالم نوازش شاہانہ کا یہی تقاضا تھا۔ خدائے بزرگ و برتر آپ کو تا قیامت سلامت رکھے۔

محمود ۔ ابوسہل فرمان قلمبند کرو کہ ہم ... کیوں کچھ کہنا چاہتے ہو۔

ابوسہل ۔ عالم پناہ اگر گستاخی تصور نہ کی جائے تو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

محمود ۔ بیان کرو۔

ابوسہل ۔ عالم پناہ آپ جانتے ہیں مجھے خواجہ بزرگ سے کتنی عقیدت ہے میں ان کی درگاہ کا ایک ادنےٰ غلام ہوں امیر نصر آپ کی طرح میرے مولا و آقا ہیں لیکن عالم پناہ میری رگوں میں خون کی بجائے دودمان غزنی کا نمک رچا ہوا ہے اور میں اپنے آپ کو حق گوئی پر مجبور پاتا ہوں۔

محمود ۔ بے تامل بیان کرو۔

ابوسہل ۔ عالم پناہ بے شک فردوسی نے بہت بڑا کام کیا لیکن اس پر غور کر لیا جائے کہ کیا اسے انعام و اکرام سے اس طرح مالا مال کرنا قرینِ مصلحت ہے۔ پہلے تو اس پر تدبر فرمائیے کہ حکیم فردوسی نے پچاس ہزار شعر تو امرائے طوس کی اعانت سے طوس ہی میں لکھ لئے تھے۔ یہ لوگ عمر بھر اس کے کفیل رہے ہیں اس لئے فردوسی اتنے گرانقدر انعام کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے کہ من جملہ رموزِ مملکت ہے۔

محمود ۔ وہ کیا۔

ابوسہل ۔ سلطان عالم شاہنامے میں مجوسیوں کی موبدوں کی اور گبروں کی داستانیں ہیں۔ آپ بحمد اللہ دین قیم اسلام کے ناصر ہیں جب دنیا کے دوسرے فرمانروا اور عالم اسلامی کے امرا یہ سنیں گے کہ محمود غزنوی نے حکیم فردوسی کو زردشتیوں اور آتش پرستوں کی تاریخ لکھنے کے لئے ساٹھ ہزار دینار دیئے ہیں تو وہ اپنے دل میں کیا خیال کریں گے۔ اگر شاہنامہ رسولِ اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی منقبت پر مشتمل ہوتا تو واقعی فردوسی بہت بڑے صلے کا مستحق تھا لیکن ایک شاعر آتش پرست کافروں اور ملحدوں کی داستان لکھ کر اسلام کے جاں نثار محمود غزنوی سے انعام کی توقع رکھے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی خواجہ بزرگ میں اس بے باکی کے لیے عفو کا خواستگار ہوں۔

محمود ۔ کہتے جاؤ ابوسہل۔

ابوسہل ۔ ایہا السلطان فردوسی کو اتنا انعام دیا گیا تو سخت بدگمانی کا موجب ہوگا۔ بالخصوص جب لوگ فردوسی کے متعلق یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ وہ رفض سے ملوث ہے۔

احمد ۔ ابوسہل یہ بات غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ فردوسی راسخ العقیدہ مسلمان ہے۔

محمود ۔ لیکن خواجہ بزرگ آپ کے متعلق بھی تو لوگ۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سمجھ گئے ابوسہل واقعی فردوسی کو اتنا گرانقدر انعام دینا قرینِ مصلحت نہیں ہے تم کیا تجویز کرتے ہو۔

ابوسہل - عالم پناہ آپ نے زبانِ مبارک سے ساٹھ ہزار کا کلمہ ارشاد فرما دیا۔ ورنہ شعر بھی ساٹھ ہزار ہیں۔ تو میری ناچیز تجویز یہ ہے کہ حکیم فردوسی کو ساٹھ ہزار درہم عطا کر دیئے جائیں یہ بھی بہت خطیر رقم ہے فردوسی اپنی بیٹی کی شادی بھی کر سکتا ہے اور اپنی عمر کے بقایا دن استغنا سے بسر بھی کر سکتا ہے۔

نصر - لیکن ایہا السلطان۔

محمود - بس نصر۔ ہم کچھ نہیں سُننا چاہتے۔ ساٹھ ہزار درہم بہت ہیں۔ یہی فردوسی کو ملیں گے۔

راوی - کہتے ہیں کہ جب محمود کا عطیہ یعنی ساٹھ ہزار درہم فردوسی کو بھیجے گئے تو وہ حمام میں تھا۔ اطلاع ملی کہ ساٹھ ہزار درہم فردوسی کے لئے آئے ہیں تو دل پر ایک عالم بیت گیا۔ استغنا اور ہمت آڑے آئے۔ حمام کے اندر ہی سے کہلوا بھیجا کہ روپیہ حمام کے نوکروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ نصر کو یہ خبر ملی تو سہم گیا کہ محمود اس گستاخی کی سخت سزا دیگا۔ دوڑا ہوا آیا۔ فردوسی کو ساتھ لیا اور اسے لے کر ریاست سجستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

راوی - اس موقع پر فردوسی نے جو شعر کہے ہیں۔ وہ خونِ دل کے قطرے ہیں جو کاغذ پر ٹپک پڑے ہیں۔ پیالہ سا دریا کنارے سے پہنچا ہے اور حلق تر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس مایوسی، اس حرماں اور اس آزردگی کا نقشہ دیکھئے گا۔

(ایک زنانہ آواز یہ شعر پڑھے گی۔ بغیر ٹھیکے کے گائے جائیں تو اچھا ہے)

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی
سی و پنج سال از سرائے سپنج
بسے رنج بردم بہ امید گنج
کز و ہیچ شد رنج سی سالہ ام
شنید آسماں از زمیں نالہ ام

چنیں شہر یارے دہش بندۂ
بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
نہ کرد اندریں داستاں ہا نگاہ
ز بد گوئے و بخت بد آمد گناہ
حسد برد بد گوئے در کارِ من
تبہ شد بر شاہ بازارِ من

راوی - فردوسی افسردہ و پژمردہ، مجبور و مقہور، مظلوم و محروم، مارا مارا پھرتا رہا۔ عمر اسی سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ جس بچی کے لئے جہیز کا بند و بست کرنا چاہتا تھا۔ اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر در بدر اور خاک بہ سر پھرنے کے بعد کہن سال خمیدہ پشت فردوسی طوس پہنچا۔ اور زندگی کی گھڑیاں گن گن کر کاٹنے لگا۔ کہ اب ہر نفس اس کے لئے دمِ شمشیر تھا۔ یہ فردوسی کے لئے عجب تنہائی کا عالم تھا۔ پرانے دوستوں اور رفیقوں کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ معاصر، آشنا، رفیق سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ حکیم صبح سے بعد شام تک اپنے آبائی باغ میں کہ باغِ فردوس کہلاتا تھا۔ سر بہ زانو بیٹھا رہتا تھا۔

راوی - اب اُدھر کی سُنیئے صاحبِ چہار مقالہ لکھتا ہے کہ محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بعد واپس جا رہا تھا۔ کہ راستے میں ایک سرکش راجے کا قلعہ پڑا کہ اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتا تھا۔ محمود نے ایلچی بھیجا کہ درگاہ میں حاضر ہو کر حلقہ بگوشی کا اعلان کرو، ورنہ نیست و نابود کر دیئے جاؤ گے۔

راوی - ایلچی کا انتظار تھا اور محمود خواجہ بزرگ سے باتیں کر رہا تھا کہ ناگہاں محمود نے کہا خواجہ بزرگ کیا خیال ہے ایلچی کیا جواب لائے گا۔ خواجہ بزرگ نے معنی خیز نظروں سے محمود کی طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؎

اگر جز بہ کامِ من آید جواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

محمود پھڑک اٹھا پوچھا کس کا شعر ہے۔ خواجہ بزرگ نے کہا اس بدنصیب کا جس نے پینتیس سال خونِ جگر کھایا اور صلے سے محروم رہا۔ محمود کو سخت ندامت ہوئی۔ فرمان صادر کیا کہ غزنی پہنچ کر فردوسی کا معاملہ پھر پیش ہو۔

راوی۔ جب محمود غزنی پہنچا تو ابوسہل ہمدانی دبیر کو حکم دیا کہ ساٹھ ہزار دینار کا نیل خرید کر اونٹوں پر لاد کر طوس بھجوا دیا جائے۔ اور فردوسی سے معذرت چاہی جائے۔ بدنصیب فردوسی کی محرومی کی غایت پر غور کیجیے گا۔ اِدھر اونٹوں پر لدا ہوا نیل دروازۂ رُودبار سے طوس میں داخل ہوا۔ اُدھر فردوسی کا جنازہ دروازۂ رزاں سے طوس سے باہر نکلا۔ اللہ اکبر۔

راوی۔ تیسرے دن ابوسہل ہمدانی محمود کا سر دبیر فردوسی کے مکان پر پہنچا۔

ابوسہل۔ فرنگیس تم جانتی ہو میں تین دن سے محمود سے انعام لے کر طوس میں مقیم ہوں۔

فرنگیس۔ ہاں۔

ابوسہل۔ سلطان محمود نے مجھ سے کہا تھا کہ میں حکیم فردوسی مرحوم سے معذرت چاہوں کہ اس سے سخت ناانصافی کی گئی ہے۔

فرنگیس۔ مناسب ہے کہ حکیم فردوسی کی قبر پر جا کر یہ معذرت چاہو۔

ابوسہل۔ فرنگیس۔ فرنگیس۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے دل پر اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔ لیکن تقدیرِ الٰہی پر کسی کا زور نہیں چلتا۔

فرنگیس۔ تم سچ کہتے ہو۔

ابوسہل۔ اونٹوں پر جو نیل لدا ہے وہ یہاں لے آؤں۔

فرنگیس۔ نہیں۔

ابوسہل۔ تو اس نیل کا کیا بنے گا۔

فرنگیس۔ یمین الدولت سلطان محمود غزنوی سے کہنا کہ کلنک کا ٹیکہ بنا کر اس نیل کو اپنے ماتھے پر لگا لے۔

ابوسہل۔ فرنگیس۔ میں منت کرتا ہوں۔ میں محمود کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں یہ نیل قبول کرو۔ ساٹھ ہزار دینار کا یہ نیل ہے۔

فرنگیس۔ ابوسہل۔ اس نیل کو واپس لے جاؤ۔ فردوسی کی بیٹی اس انعام کو قبول نہیں کر سکتی۔ جو انعام جیتے جی فردوسی کو نہ ملا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی اس انعام سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی۔ تم کہتے ہو یہ ساٹھ ہزار دینار کا نیل ہے۔ ابوسہل اگر ساٹھ کروڑ دینار کا نیل ہوتا تو بھی میری ہمت اسے قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اس نیل کو اپنے اونٹوں کو واپس غزنی لے جاؤ۔ میں اپنے باپ کی لاش ساٹھ ہزار دینار کے نیل کے لئے نہیں بیچ سکتی۔ واپس جاؤ ابوسہل۔

ابوسہل۔ فرنگیس۔ میں صرف محمود ہی کی طرف سے معذرت پیش نہیں کرتا ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا بھی اعتراف کرنا ہے۔ میں نے حکیم مغفور و مرحوم کی قبر پر رو رو کر گڑگڑا کے اللہ سے دعا مانگی ہے کہ وہ میرے گناہ کو بخش دے۔

فرنگیس۔ تم نے کیا گناہ کیا ہے۔

ابوسہل۔ فرنگیس، محمود کو ساٹھ ہزار دینار دینے سے میں نے روکا تھا۔

فرنگیس۔ ابوسہل تم اب اس گناہ کی تلافی کرنا چاہتے ہو۔

ابوسہل۔ ہاں بہ دل و جاں۔

فرنگیس۔ تو اس کی یہ صورت ہے کہ جابر اور قاہر محمود غزنی تک ایک کمزور اور ناتواں عورت کی آواز پہنچاؤ۔ یاد رکھو۔ سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ میرا پیغام محمود تک پہنچاؤ گے۔

ابوسہل۔ ہاں۔

فرنگیس۔ چاہے جان پہ بن جائے۔

ابوسہل۔ ہاں میں اپنے گناہ کی تلافی کروں گا۔

فرنگیس۔ تو ابوسہل محمود سے کہنا۔ اے ایران کے جابر و قاہر فرمانروا، فرنگیس نے کہا ہے ماہ و سال آئیں گے اور ماہ و سال جائیں گے۔ وقت زمانے کی کتاب کے بیشمار اوراق اُلٹ دے گا۔ پُرانے فرمانرواؤں کے خاندان مٹ جائیں گے اور نئے فرمانرواؤں کا نیّرِ اقبال طلوع ہو گا۔ صدیاں بیت جائیں گی، قرن گزر جائیں گے لیکن دُنیا یہ واقعہ کبھی فراموش نہ کرے گی کہ محمود غزنوی نے شعر کی بے حرمتی کی تھی۔ فردوسی کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ محمود کی فتوحات لوگوں کو یاد نہیں رہیں گی۔ آنے والی نسلیں صرف یہ یاد رکھیں گی کہ محمود نے فردوسی کی، شعر کی، علم کی، فن کی قدر نہیں پہچانی تھی۔ آنے والی نسلیں صرف یہ کہیں گی۔ محمود کو نام نہیں دولت عزیز تھی۔ ماہ و سال آئیں گے اور ماہ و سال جائیں گے لیکن محمود کے چہرے سے اس بدنامی کا داغ نہیں دُھلے گا نہیں دُھلے گا۔ نہیں دُھلے گا۔

(آواز فیڈ آؤٹ ہوتی ہے۔)

راوی۔ اور وہی ہُوا جو فرنگیس نے کہا تھا۔ فردوسی زندہ جاوید ہے اور محمود نے فردوسی سے جو سلوک کیا اس کی داستان اب تک وقت کو یاد ہے اور محفل میں دہرائی جاتی ہے۔ فردوسی کی ناقدردانی کا داغ اب تک نہیں دُھلا۔

(ایک راوی یہ شعر گائے گا)

گزشت شوکت محمود و دور زمانہ نماند
جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدرِ فردوسی

(پھر یہ شعر پڑھے جائیں گے)

آفریں بر روانِ فردوسی
آں ہمایوں نژادِ فرخندہ
او نہ استاد بود و ما شاگرد
او خداوند بود و ما بندہ

مجھے بیساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جوشؔ ملیح آبادی

لرز اُٹھتے ہیں جب موہوم جالے کُنجِ ویراں میں — دیا جلتا نہیں جب خانۂ تاریکِ دہقاں ہے
ہوائیں سسکیاں بھرتی ہیں جب گورِ غریباں میں — دمِ رفتار، پامالِ خزاں صحنِ گلستاں میں
قدم پڑتے ہی جب ہر ایک پتی کھڑکھڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حریمِ عقل سے منہ موڑ کر دانش کو ٹھکرا کر — جنوں کے دشت میں آکر خرد کے قصر کو ڈھا کر
اماماںِ تعقل سے بغاوت کی قسم کھا کر — نفس کی آمد و شد کو گھنی زلفوں میں اُلجھا کر
ربابِ عشق پر جب خامکاری گنگناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فضا پر نُور کا پچھلے پہر مڑتا ہے جب دھارا — زمیں پر چھُوٹتا ہے جب سُہانے بن کا فوّارا
شلوکا دھوپ چھاؤں کا پہن لیتا ہے اندھیارا — مچل اُٹھتا ہے آدھے چاند کے آغوش میں تارا
کلی میں پھول بننے کی خلش جب کُن مناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

دمکتے زیوروں کی شوخ تابانی کو سنولا کر — سبک ہاروں کے جنّت آفریں پھولوں کو مُرجھا کر
بساطِ زر پہ چھپا کر عود کی لپٹوں کو بکھرا کر — نقوشِ ساغر و مینا کی رنگینی کو دھندلا کر
قریبِ صبح جب شمعِ شبستاں جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گھٹا کی چھاؤں میں گردن جھکا کر شرم ساری سے — ذرا سا لڑکھڑا کر اک ادائے بادہ خواری سے
حیا سے کانپ کر بل کھا کے فرطِ بے قراری سے — کلائی میں سبک کنگن گھما کر طرح داری سے
کسی کو دیکھ کر جب کوئی کم سن مسکراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گرجتے گونجتے کم بخت ساون کے مہینے میں — جو دل کو بھینچ دے وہ ٹیس جب اُٹھتی ہے سینے میں
شبِ فرقت دہکتی سرد راتوں کے سفینے میں — جب ارمانوں کے پیکر ڈوب جاتے ہیں پسینے میں
کسی کی کم سنی تکیے پہ جب آنسو بہاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

برس پڑتے ہیں جب صحنِ چمن پر ٹوٹ کر بادل   اُڑا دیتی ہے جوشِ مے سے اپنا کاگ جب بوتل
پپوٹے تخمِ سبزوں کے نیند سے ہوتے ہیں جب بوجھل   ہزاروں و لولوں سے پھوٹتی ہے جب ہری کونپل
قبائے غنچہ میں جب بوئے گل دھومیں مچاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

تصور دیکھتا ہے جب پری زادوں کو مدفن میں   تخیل ہانپنے لگتا ہے جب اُلجھے ہوئے بن میں
نظر آتا نہیں جب ایک طائر بھی نشیمن میں   اور اک اُجڑے ہوئے عشرت کدے کے تنگ روزن میں
ہوا جس وقت آدھی رات کو سیٹی بجاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مرے خلوت کدے میں کانپنے لگتے ہیں جب سائے   ہوا آتی ہے مرجھائے ہوئے لمحوں کو مہکائے
چمک اُٹھتے ہیں جتنے چاند تھے یادوں میں گہنائے   تصور میں نگار آتے ہیں جب زلفوں کو بکھرائے
تمنا جب اندھیرے میں کبھی راتیں جگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

صبا اٹکھیلیاں کرتی ہے جب برگِ نسریں سے   نسیمِ صبح کا ذب کھیلتی ہے خوابِ نوشیں سے
نہ جانے کیا صبا چپکے سے کہہ جاتی ہے پروین سے   کہ اپنا سوز دکھلاتے کو اک اندازِ رنگیں سے
تنوروں میں سنہری آنچ مڑتی ، سنسناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فضا پر چونکنے لگتا ہے جب ذوقِ جہاں گردی   مچلتی ہے سرِ دوشِ صبا جب رات کی سردی
ستارے کانپتے ہیں چاند پہ چھاتی ہے جب زردی   سسک جاتی ہے جب پچھلے پہر کی مل گجی وردی
بلندی آسماں کی جب سہاگ اپنا بڑھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

بہاریں سونپتی ہیں جب گل و سنبل کو برنائی   جنونِ شوق کو آتی ہے انگڑائی پر انگڑائی
تصور بخشتا ہے جب مشامِ جاں کو بینائی   کسی کے دل نشیں مکھڑے میں ڈھل کر جب برعنائی
دلِ خوں گشتہ میں پھولوں کی خوشبو رمساتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

بدن اپنا چرائے تیرہ گلیوں میں قدم دھرتی   لرزتی، ہانپتی، رکتی، بدکتی، خوف سے مرتی
ٹھٹکتی، کانپتی، مڑتی، سمٹتی، جھینپتی، ڈرتی   غرض چھپنے کے ہیں جتنے بھی وہ سارے جتن کرتی
کسی کا در کوئی الھڑ جب آکر کھٹ کھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کھنچی ہوتی ہے جب تاروں کی چادر خوش نواؤں پر اُترتی ہے مٹھاس افلاک سے رنگیں فضاؤں پر
گلستانِ فسوں کے پھول کھلتے ہیں فضاؤں پر سہانی راگنی جب رقص کرتی ہے ہواؤں پر
زندا سی بھیرویں مکھڑے سے جب گھونگھٹ اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چٹک جاتی ہیں جب کلیاں حریم شبنمستاں کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں مرغانِ خوش الحاں کی
گلابی روشنی میں آنکھ کھل جاتی ہے بُستاں کی اور اُس کے ساتھ ہی پہلی کرن صبحِ بہاراں کی
جب اس دکھتے ہوئے سینے میں چبھ کر ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نشیلے جھٹ پٹے میں اُمڈنے لگتے ہیں جب منظر فضا کے دوش پر ہوتی ہے جب اک سرمئی چادر
مہکتی جھاڑیوں میں اک ذرا سا شہر سے ہٹ کر پسِ کہسار خم کھائے ہوئے خوابیدہ ساحل پر
مرے دل کے سمندر میں ندی جب ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

تکا ہوتا ہے جب متقیش سا موجوں کے داماں میں سہانی چاندنی جب آنچ بنتی ہے رگِ جاں میں
خنک چنگاریاں اُڑتی ہیں سنگم کے شبستاں میں اور اک انداز سے پھر ڈوب کر شوقِ فراواں میں
تھکی جمنا کو گنگا جب کلیجے سے لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں میری تمناؤں نے کل دھومیں مچائی تھیں جہاں ناچے تھے ارماں آرزوئیں گنگنائی تھیں
جہاں شیریں لبوں پر بارہا مہریں لگائی تھیں جہاں راتیں گھنی زلفوں کے سائے میں جگائی تھیں
مجھے پہچان کر جب وہ گلی آنکھیں جھکاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چمن کو غرقِ سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھنورا نیازِ عاشقاں کو ناز کر جاتا ہے جب بھنورا
خموشی کو لطیف آواز کر جاتا ہے جب بھنورا کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھنورا
اور اس کے بعد جب تا دیر ٹہنی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اُٹھائے دوش پر گم کردہ لمحوں کی ملاقاتیں ملاقاتیں، دعائیں، شکریے، شکوے، مناجاتیں
لئے چاندی کی تھالی میں جواں لمحوں کی سوغاتیں مری گردن میں باہیں ڈالتی ہیں چاندنی راتیں
اور اُن راتوں میں جب کوئل مدھر تانیں سناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فراق گورکھپوری

مجھے گنوا کے اپنے جور کرتے ہو پشیماں کیا
فریبِ رنگ و بو یہ سوچنے کی کاش فرصت دے
کسی کے غمکدے میں مسکراہٹ کی پَویں پھوٹیں
رہائی یا گرفتاری سے کیا بنتا بگڑتا ہے
فنا فی الیار ہیں وہ اے اجل اہلِ محبت کو
نگاہِ یار ہی جب پھر گئی ہم خانہ زادوں سے
کوئی رُوداد ہو کہ سُن کے دنیا بھول جاتی ہے
اُسی اک شعلۂ بیتاب کی ہیں کروٹیں دونوں
اُفق پر سینۂ ظلمت میں شعلے سے مچلتے ہیں
جو آنکھیں ہوں کسی کے عشق نے سو بھیس بدلے ہیں
حیا میں شوخیِ پنہاں کا عالم طرفہ عالم ہے
یہ دل اُچٹا جو دنیا میں کہیں اب جی نہیں لگتا
بالآخر ہمنشیں رو پیٹ کے سب بیٹھ رہتے ہیں
فضائے انجمن رہ رہ کے جیسے کچھ کھنک جائے
یہاں دو دل نہیں ملتے دگر نہ کیا نہیں ملتا

حسابِ دوستاں در دل شمارِ زخمِ پنہاں کیا
قفس کیا، آشیاں کیا، موسمِ گل کیا، گلستاں کیا
کرے اب ڈبڈبائے آنسوؤں کا شبنمستاں کیا
جنوں اپنی جگہ دنیا ہے زنداں کیا بیاباں کیا
ترا خوابِ گراں کیا زیست کے خوابِ پریشاں کیا
ستم ہائے حریفاں کیا کرم ہائے عزیزاں کیا
انوکھی داستاں ہے قصۂ خونِ شہیداں کیا؟
ارے پروانۂ آتش بجاں کیا شمعِ سوزاں کیا
سحر صحرائے شب میں چاک کرتی ہے گریباں کیا
نمودِ برگِ گل کیا مہر و مہ کیا حسنِ انساں کیا
لَویں پھینکے گا یوں کوئی چراغِ زیرِ داماں کیا
غمِ صبحِ وطن کیا ماتمِ شامِ غریباں کیا
یہ کس سے پوچھئے وجہِ سکونِ بے قراراں کیا
سرِ بزمِ طرب تیری نگاہیں ہیں غزلخواں کیا
نہ امکانِ محبت ہو جہاں وہ دارِ امکاں کیا

نشاطِ حسن کو آزردگی کیونکر چھپا لیتی
تبسم کا ہے آئینہ سرشک آلودِ مژگاں کیا

فسانہ ہو کے رہ جاتے ہیں دنیائے دو روزہ میں
نیازِ عاشقاں کیا، نازہائے نازنیناں کیا

ترے قربان آوازِ شکست اس میں نہیں ہوتی
جو ٹوٹے بھی صدا دے گا ترا پیمانِ پنہاں کیا ؟

مرے اصرار میں اک شائبہ ہے بدگمانی کا
ہے اک انکار کا پردہ ترا اقرار آساں کیا؟

سحر کرتے ہیں راتیں ہجر کی خونِ جگر کھا کے
بسر ہو جاتی ہے خوابِ خورِ شب زندہ داراں کیا

خود اپنا قرب بھی صبحِ ازل سے ناگوارا ہے
وجودِ عشق اپنے آپ سے بھی ہے گریزاں کیا

خود اپنے آپ پر جھنجلا کے تجدیدِ دل آزاری
مجھے جینے نہ دے گا اب ترا جورِ پشیماں کیا

مزاجِ عشق میں بھی سادگی ایسی نہیں دیکھی
تکلف برطرف یہ بھی ہے اک شوخیِ پنہاں کیا

کچھ اس سے ارتباطِ حسن و الفت اک ذرا اونچا
نوازشہائے پیدا کیا تغافلہائے پنہاں کیا

مظاہر غیبِ غیب اور عالمِ غیب اظہر من الشمس
وجود اک راز ہے ہمراز نہاں کیا نمایاں کیا

چلے تھے دل لگانے جس کا یہ انجامِ کار اے دلِ
کہ لو ہے لگ گئے کارِ محبت بھی ہے آساں کیا

دبی آنچوں سے روشن ہو گئی پیشانیِ دوراں
ہمارا سوزِ پنہاں کر گیا کارِ نمایاں کیا

نوائے سرمدی ہے بے نیازانہ سناتا ہوں
مدیحِ فن شناساں اعتراضِ ناشناساں کیا

غزل وہ چھیڑ دی جو ختم ہونے میں نہیں آتی
فراقؔ اشعار بھی ہیں داستانِ شامِ ہجراں کیا

رباعیات

جوشؔ ملیح آبادی

سوئے ہوئے لمحوں کو جگایا میں نے
ڈوبے ہوئے برجوں کو ترایا میں نے
یادوں کے ہجوم میں جنازہ اپنا
کس دھوم سے رات کو اٹھایا میں نے

ہر رقص میں درد کے ہزاروں پہلو
ہر لحن کے زیر و بم میں لاکھوں آنسو
عشرت کے شبستاں کی گھٹی سانسوں میں
غلطاں ہے جلے ہوئے دلوں کی خوشبو

دولت ہی نہیں فکرِ مبیں سے بہتر
دانائی حکمت آفریں سے بہتر
عالِم کا دیا ہوا گمانِ بد بھی
جاہل کے عطا کردہ یقیں سے بہتر

اے آج کے انسان ہوا کے فرزند
مرجا مرجا، زمیں کا ہو جا پیوند
تیرے شکمِ مرگ سے ہوگا پیدا
اک پختہ بشر، اس بشریت سے بلند

اثر لکھنوی

صبح نے انگڑائی لی چھلکا وہ نورِ آفتاب
ساقیا بھر دے مرے ساغر میں بھی لعلِ مذاب

تازہ تازہ وہ شباب اُس کا وہ اندازِ حجاب
چہرۂ گل پر سحر گہ جیسے شبنم کی نقاب

یاد اُن آنکھوں کی جن کا تھا یہ عالم وقتِ خواب
جیسے چاہے ہوش میں رہنا کوئی مستِ شراب

اب کہاں صبر و سکوں شیوہ نیازِ عشق کا
دل سے پیہم اٹھ رہی ہے ایک موجِ اضطراب

ہو نگہ سائل تو ہو میری زباں خاموش تھی
آہ شرمِ ناکسی کا خندۂ نوشیں جواب

چل گیا دونوں پر اُن آنکھوں کا جادو چل گیا
ایک ہی درجے میں ہیں ہشیاری و مستی خراب

لوٹ لے دل لوٹ نظارے کی لذت بے دریغ
آرہا ہے حسن کو اپنے کرشموں پر عتاب

ہمکنارِ بحر ہو کر رقص کر گرداب وار
سرکشی دم بھر کی خاطر کس لئے مثلِ حباب

ہر نفس ہے پا بجولاں پر لگے ہیں وقت کے
جس کو جو کچھ بھی یہاں کرنا ہے وہ کر لے شتاب

بے نیازی دیکھنا عاجز نوازی دیکھنا
جب دعا سے ہاتھ اُٹھایا ہر دعا تھی مستجاب

اشکِ خوں میں صبحدم تھا اک جگر پارہ اثر
جس طرح موجِ شفق میں ہو ستارہ بے نقاب

صبحِ شکستہ

احمد ندیم قاسمی

کتنی شدت سے یہ رات خاموش ہے
کتنی لامنتہیٰ، کس قدر بے کراں
ایک پتّہ بھی گرتا ہے جب گھاس پر
مجھ کو ہوتا ہے جھنکار کا سا گماں

چاندنی شاہراہوں پہ سوئی ہوئی
اور ہر شے کسی شے میں کھوئی ہوئی

وادیاں چپ ہیں اور دم بخود ندیاں
بکھری مانگوں کی مانند پگڈنڈیاں
اُکھڑے اُکھڑے سے آبادیوں کے نشاں
جیسے صدیوں کی اُجڑی ہوئی بستیاں

میں تو دن کی مسافت میں مصروف تھا
جھٹپٹا کب ہوا؟ شام کب آگئی؟
اے ستارو، مرے رات کے دوستو
میرے سورج کو کس کی نظر کھا گئی

کچھ تو زادِ سفر ساتھ لے کر چلوں
میرے پھولو، مجھے اپنی مہکار دو
یہ گھنی تیرگی کاٹنے کے لئے
میرے کانٹو، مجھے اپنی تلوار دو

اپنے نغموں کی مربوط تکرار سے
اس اندھیری خموشی کو توڑوں گا میں
شب کا ماحول کتنا ہی پُرہول ہو
چوٹ کھا کر بھی رستہ نہ چھوڑوں گا میں
جب کہ تخلیق کا فن مرے پاس ہے
دن کے ریزوں کو چن چن کے جوڑوں گا میں

انکشاف

عندلیب شادانی

بہت دنوں کی بات ہے
تمھیں تو شاید اب وہ یاد بھی نہ ہو
حریر کا وہ پیرہن
سفید جیسے جھاگ آبشار کے
لطیف جیسے پردہ رنگ و نور کا
حسین جیسے چاندنی بہار کی
وہ جس کی اک جھلک سے ہر نگاہ آرزو بنے
وہ جس کے لمس مخملیں سے روح جھومنے لگے
حریر کا وہ پیرہن
تمھیں بہت عزیز تھا
مجھے بہت عزیز تھا
تمھیں تو شاید اب وہ یاد بھی نہ ہو
بہت دنوں کی بات ہے
مری نظر میں چھا رہا ہے آج بھی اُسی طرح
وہ پچھلی رات کا سماں
وہ سطح آب جُو پہ چاندنی کی جھلملاہٹیں
ہوا کی گدگداہٹیں
فضا کی خوابناکیاں
تمھارے جسمِ نازنیں پہ وہ حسین پیرہن
وہ اُس کی تابناکیاں
بہشت اپنی ساری دل ربائیاں سمیٹ کر
زمیں پہ آگئی تھی صرف ایک رات کے لئے
تمھیں تو شاید اب وہ یاد بھی نہ ہو

بہت دنوں کی بات ہے

وہ رات بھی گذر گئی
اور اس کے بعد اور کتنے روز و شب گذر گئے
مسرتوں کی یاد میں غم و تعب گذر گئے
بہار بھی مجھے فسردہ چھوڑ کر چلی گئی
نہ روح کی خلش مٹی، نہ دل کی بے کلی گئی
زمانہ یونہیں کروٹوں پہ کروٹیں لیا کیا
بہت دنوں کے بعد پھر
وہی حسین پیرہن
پڑا ہوا تھا ایک دن
تمھاری ایک خادمہ کے دوش پر
غبار میں اٹا ہوا
کٹا ہوا، پھٹا ہوا
وہ خادمہ اسی سے پہلے اپنے پاؤں جھاڑ کر
برآمدے کا فرش جھاڑنے لگی
یہ انقلاب دیکھ کر، دلِ غمیں کچھ اور بھی اداس ہو کے رہ گیا
مگر یہ انقلاب اک پتے کی بات کہہ گیا
وہی فقط مری الم نصیبیوں کا راز ہے
وہ راز میں تمھیں ابھی کیوں نہ بتا دوں
تو پھر سنو!
کشش کا ایک وقت ہے کشش کی ایک عمر ہے
مقررہ ہیں مدتیں شباب اور جمال کی
زوال سے ملی ہوئی ہیں سرحدیں کمال کی
وہ مدتِ مقررہ جہاں تمام ہو گئی
کشش کی دوپہر ڈھلی، ڈھلی کہ شام ہو گئی

اور اس کے بعد؟ اس کے بعد حسرتوں کی وادیاں
ہزار کس مپرسیاں، ہزار نامرادیاں
حیات تلخ کامیوں کی اک طویل داستاں

(حلقۂ اربابِ ذوق ڈھاکا میں پڑھی گئی)

روشؔ صدیقی

امتیازِ خیر و شر ہونے لگا
تنگ، دامانِ نظر ہونے لگا
رات بھر اشکوں کو روکا، صبح دم
کارواں گرمِ سفر ہونے لگا
زندگی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ
کارِ دنیا مختصر ہونے لگا
صبحِ منزل کا درخشاں آفتاب
کیوں چراغِ رہ گذر ہونے لگا
خود فراموشی کا ہلکا سا غبار
غازۂ فکر و نظر ہونے لگا
کون لے سر پہ وبالِ گم رہی
راہزن کیوں راہ بر ہونے لگا
برملا یہ گریۂ بے اختیار
کیا تجھے اے چشمِ تر ہونے لگا
رفتہ رفتہ حسرتِ تعمیر کو
شکوۂ دیوار و در ہونے لگا
میں تو ہوں گم کردۂ دل اے روشؔ
کون میرا ہم سفر ہونے لگا

سب میکش جی بھر پی لیں پیہم دَورِ جام رہے
رہتی دنیا تک اے ساقی! میخانے کا نام رہے
پھرتے ہیں اب بستی بستی جیسے کوئی کام نہیں
جب تک تیرے شہر میں تھے ہم دنیا بھر کے کام رہے
بادِ صبا کی باتیں سنکر کس کو آسکتا تھا یقیں
پھر بھی کل سے آج سدا ہم مشتاقِ پیغام رہے
روئے صنم کو مصحف سمجھا، ابرو کو محرابِ نماز
کعبے والو! دیر میں بھی ہم پابندِ اسلام رہے
صبحِ ازل سے شامِ ابد تک کیا ایفا ہو وعدۂ دوست
لب پہ ترے اے کشتۂ فردا! صبح رہے یا شام رہے
جام لبوں تک لاکر ساقی! دانستہ توڑا ہم نے
تیرا تغافل سر آنکھوں پر، تجھ پر کیوں الزام رہے
ہم نے اگر کچھ رنج اٹھائے اس میں بڑی کیا بات ہوئی
وہ بھی ہیں جو اپنی خوشی سے، مانوسِ آلام رہے
منزل سے بیگانہ ہو کر، دل کو تیری راہ ملی
جن کا رُخ سوئے منزل تھا آخر وہ ناکام رہے
لاکھ اٹھے طوفانِ ملامت، لب نہ ہلیں اے پاسِ وفا
حسن پہ کوئی بات نہ آئے، عشق پہ ہر الزام رہے
اہلِ جہاں کی تنگ دلی سے کیا مطلب ہے ہم کو روشؔ
آزادوں کی وضع یہی ہے کام سے اپنے کام رہے

اختر انصاری

وفورِ شوق کی بنیاد آرزو تیری
مرے مزاج کی افتاد آرزو تیری

بہارِ طبع جنوں زاد آرزو تیری
بہشتِ فطرتِ آزاد آرزو تیری

کبھی لبوں پہ نکھرتی ہے زمزمہ بن کر
کبھی ہے نالہ و فریاد آرزو تیری

کہیں ہے رافتِ لطف و کرم تری چاہت
کہیں ہے آفتِ بیداد آرزو تیری

جنون و وحشت و دیوانگی کی رگ ہے کہیں
کہیں ہے نشترِ فصاد آرزو تیری

سمیٹ لیتی ہے اپنے گھنیرے سایوں میں
مثالِ زلفِ پری زاد آرزو تیری

دل و دماغ ہیں معمور تیرے ارماں سے
نفس نفس میں ہے آباد آرزو تیری

جسے یہ سب ہو میسر وہ اور کیا چاہے ؟
ترا خیال ، تری یاد ، آرزو تیری

نہ جینے دیتی ہے ظالم نہ مرنے دیتی ہے
غضب کی ہے ستم ایجاد آرزو تیری

قسم ترے دلِ خانہ خراب کی اختر
کسی کے دل میں ہے آباد آرزو تیری

عدم

ترا جمال بھی ہر چند اک ستارا ہے
مری نگاہ نے اس کو بہت اُبھارا ہے

ترے فریب کا پردہ ہی چاک چاک نہیں
مرے خلوص کا شیشہ بھی پارا پارا ہے

وہ ٹی ہے ترے ہوتے ہوئے بھی تیرے نگر
تمام دن بڑی تکلیف سے گزارا ہے

مری کہانی چھڑی ہے تری نگاہوں سے
مری خرابیٔ انجام آشکارا ہے

غمِ زمانہ ہمیں کیا کرے گا تُو زخمی
کسی نے آبِ رواں کو بھی تیر مارا ہے

پڑی ہے دیر و حرم کی وہیں وہیں بنیاد
جہاں جہاں تجھے انسان نے پکارا ہے

اِدھر تو آؤ ذرا لے کے کاکُلِ برہم
یہ غم تمہارا نہیں ہے یہ غم ہمارا ہے

حسین ہو اور عدمؔ اتنا لطف کا خوگر
عجیب مال پہ اُستاد ہاتھ مارا ہے

شاد عارفی

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج ‏ ‏ ‏ کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج
نہ بدل پائیں گے رسوم و رواج ‏ ‏ ‏ جھوٹ کہتی ہے بک رہی ہے سماج
یہ حکایت نہیں حقیقت ہے ‏ ‏ ‏ بیکسی کا بدل چکا ہے مزاج
ہم وہ پہنچے ہوئے شرابی ہیں ‏ ‏ ‏ ایک بوتل میں بیچتے ہیں تاج
زندگی پر دلیر ہیں وہ لوگ ‏ ‏ ‏ مقبروں سے جو لے رہے ہیں خراج
"یہ تغیر کا کارخانہ ہے" ‏ ‏ ‏ وقت پوچھے گا سر پھروں کے مزاج
ہم ہیں محرومِ آرزو بیشک ‏ ‏ ‏ ہیں مگر آپ عقل سے محتاج
"یہ پڑاووں پہ گھومنے والے" ‏ ‏ ‏ ہم سے کرتے ہیں دعوئ معراج
گرم رفتارئ زمانہ سے ‏ ‏ ‏ کل جو ہوتا وہ ہو رہا ہے آج
کل جو ہوگا وہ ہو رہے گا مگر ‏ ‏ ‏ خود پرستوں پہ مسکرائیں آج
ہیں وہ خود انتہا کے بدپرہیز ‏ ‏ ‏ چاہتے ہیں جو رشوتوں کا علاج
حق طلب کر رہا ہوں بھیک نہیں ‏ ‏ ‏ نہ غریب الوطن نہ ہیں محتاج

شادؔ حیرت یہ ہے کہ اَن داتا
"بھر کے لاتے ہیں گاڑیوں میں اناج"[1]

[1] اسماعیل میرٹھی کی ایک نظم کا مصرع

اتحادِ ہند و پاک

پروفیسر شور

ہم صفیرو! اٹھو، راہگیرو چلو قافلوں کو غباروں نے آواز دی،
سازسے پھر ہواؤں میں چھڑنے لگے پھر سفینوں کو دھاروں نے آواز دی
پھر ستاروں کی لو جھلملانے لگی پھر دلِ ماہ و انجم دھڑکنے لگا
پھر جبینِ افق سے سیاہی ڈھلی، پھر سویرے کا قشقہ دمکنے لگا
ہانپتے وقت کا تیز رَو کارواں زخم کھاتا چلا مسکراتا چلا
انقلابات کی لو بڑھاتا چلا، آفتابوں کے پرچم اُٹھاتا چلا
ظلمتوں کی سیہ کفنیاں پھاڑ کر تازہ سورج اُفق سے نکلنے لگا
پھر ہمالہ کے ماتھے سے پھوٹی کرن پھر شفق آسماں منہ پہ ملنے لگا
چوڑیاں کتنی ٹوٹی ہیں ہر راہ میں عصمتوں کے دُٹے کتنے کجلا گئے
کتنی مجبور و معصوم ماؤں کے غم خون چشم ہمالہ سے برسا گئے
اب برہنہ نہ ہوں گی بناتِ حرم غسل ہوگا نہ شہروں کا اب آتشیں
شیر خواروں کے بہتے ہوئے خون سے اب نہ کھیلے گی ہولی دلِ نازنیں
اب چراغوں کی خاطر کسی جشن میں ابن آدم کی چربی نہ کام آئے گی
قحط و افلاس کی آرسی دیکھ کر بنت حوا کی عصمت نہ شرمائے گی
حادثوں سے نگاہیں ملاتے چلو سازِ ایام پر گنگناتے چلو
وسعتِ خاک کے تند طوفان کو آئینے ساحلوں کے دکھاتے چلو
بادلوں کے جو سینوں میں ملتی رہی اب وہ بجلی نہ خرمن پہ لہرائے گی
ہم جلاتے چلیں گے جہاں تک بنے شمع کوئی ہوا سے نہ بجھ پائے گی
بجلیاں جنتوں کی نگہباں سہی، جنتیں بجلیوں کا اجارہ نہیں
وہ نشیمن تو اپنا نشیمن نہیں جس کو برق و شرر نے سنوارا نہیں

غلام ربّانی تاباںؔ

سرتابقدم ایک حسیں راز کا عالم ‏ ‏ ‏ کیا کہئے کسی فتنہ گرِ ناز کا عالم
زلفوں میں وہ برسات کی راتوں کی جوانی ‏ ‏ ‏ عارض میں وہ انوارِ سحر ساز کا عالم
عنوانِ سخن ۔ غالبؔ و مومنؔ کا تغزّل ‏ ‏ ‏ اندازِ نظر ۔ بادۂ شیراز کا عالم
دُزدیدہ نگاہوں میں اِک الہام کی دنیا ‏ ‏ ‏ نازک سے تبسّم میں اِک اعجاز کا عالم
ہر جنبشِ ابرو میں محاکات کے دفتر ‏ ‏ ‏ کچھ سوز کا عالم ہے تو کچھ ساز کا عالم
اُلجھے ہوئے جملوں میں شرارت بھی حیا بھی ‏ ‏ ‏ جذبات میں ڈوبا ہوا آواز کا عالم
اس سادگیٔ حسن میں کس درجہ کشش ہے ‏ ‏ ‏ ہر ناز میں اک جذبۂ غمّاز کا عالم
اُس صید کو کیا کہئے جو خود آئے تہِ دام ‏ ‏ ‏ دل میں لئے اک حسرتِ پرواز کا عالم
قربت بھی ہے دوری بھی ہے اب کیا کوئی سمجھے ‏ ‏ ‏ انجام کا عالم ہے کہ آغاز کا عالم
یوں تو نہ تساہل نہ تجاہل نہ تغافل ‏ ‏ ‏ کچھ اور ہے اس کا فرِ طنّاز کا عالم

شوخی میں شرارت میں متانت میں حیا میں
جو راز کا عالم تھا وہی راز کا عالم

[۱] اسماعیل میرٹھی کی

وامق جونپوری

برق بر رخسار دیکھئے کب تک رہے
ہم کو یقینِ بہار دیکھئے کب تک رہے

دامنِ گلچیں میں پھول بلبلِ شیدا ملول
روحِ چمن سوگوار دیکھئے کب تک رہے

کتنے نئے قافلے منزلوں سے جا ملے
بخت میں اپنے غبار دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب راہ پر ٹھیک سے اُٹھیں قدم
رات کی مئے کا خمار دیکھئے کب تک رہے

محنتِ بے دام پر نظمِ کہن برقرار!
نظمِ کہن برقرار دیکھئے کب تک رہے

اہلِ جنوں خوب ہیں واقفِ آئینِ شوق
دل پہ مگر اختیار دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب تک نظر بزم میں بھٹکا کرے
حسرتِ دیدارِ یار دیکھئے کب تک رہے

رات بھی مرجھا چلی چاند بھی کمھلا گیا
پھر بھی ترا انتظار دیکھئے کب تک رہے

انجمِ خاکی کا نور چشمِ نجومی سے دور
انجمِ فلک کا شمار دیکھئے کب تک رہے

حضرتِ انسان اور تابعِ مریخ و ماہ
جہل کا یہ اشتہار دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب تک نہیں ذرّوں کی دھمکی سہے
زیست کے رُخ پر غبار دیکھئے کب تک رہے

کشمکشِ ننگ و نام دہر میں جینا حرام
نام کی یہ جیت ہار دیکھئے کب تک رہے

وامقِ سرگشتہ اور گردشِ لیل و نہار
وقت کا یہ کاروبار دیکھئے کب تک رہے

پیت کئے دُکھ ہوئے

ابن انشا

لکڑی جل کوئلا بنے، کوئلا جل بنے راکھ
ہم پاپی کچھ یوں جلے، کوئلا بنے نہ راکھ

اس چاند کا دُور نگر میں بسیرا رہنے لگا
یہاں شام سے اپنے من میں اندھیرا رہنے لگا
اجڑی ہوئی گلیاں چپ چپ پیڑ ستانے لگے
دکھی جی کے بہلنے کے سارے بہانے ٹھکانے لگے
بڑا تاروں بھرا سہی خوب بسا سہی نیلا گگن
اُسی چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

یہاں روپ بھی ہے یہاں رنگ بھی ہے یہاں راگ بھی ہے
سبھی کچھ ہے مگر اس دل میں بجوگ کی آگ بھی ہے
اسی آگ کی آنچ پہ خود کو ہمیشہ جلایا کریں
ہم صبح تلک یونہی رات کا ساتھ نبھایا کریں
بڑی روح دُکھی، گئی جان پہ بن، لگا جی کو گہن
اُسی چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

اک گوری نے چاہ کی راہ میں لاکر چھوڑ دیا
بڑا قہر کیا، بھری زندگی کا رُخ موڑ دیا
سو روپ یہاں، ہر روپ کی ایک عجب جھلکی
کسی اور میں لیکن بات کہاں اس چنچل کی
جس چاند نے جیون رات کو بخشی ایک کرن
اُسی چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

اب خط نہ سندیسہ، باتیں نہ وہ ملاقاتیں ہیں
بس جلتے سلگتے دن ہیں تو بے کل راتیں ہیں
اور دل کا یہ حال تھا ڈر کر جسے سمجھانے پہ
ہم آپ بہت حیران ہیں اِس دیوانے پہ
اس جیون کے کارن اجڑیں نگر آباد ہوں بن
کیوں چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

ہم آپ ہی آپ میں گھُلتے رہیں فریاد کریں
کیا قول و قرار ہوئے تھے کہاں تک یاد کریں
جب ہم نے کہا تھا کہ 'دیکھنا بھول نہ جانا ہمیں'
بھلا کس نے کہا تھا کہ 'سمجھو نہ تم بیگانا ہمیں'
ہمیں یاد رہا تمھیں یاد نہیں وہ ایک بچن
کیوں چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

وہ جو آخری تحفہ آئی تھیں کلیاں بیلے کی
اک رات میں جو مرجھائی تھیں کلیاں بیلے کی
ان کلیوں میں اب بو باس کہاں، سب کہتے ہیں
ہم ان کو مگر سینے سے لگائے رہتے ہیں
جب چاہیں انھی کی سیر کریں، یہی اپنا چمن
اسی چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

اس کھیل میں ہاں ہمیں ہار گئے وہی جیت گئے
وہ جو دور تھے لا کر بیت گئے —— جگ بیت گئے

اب جیتے ہیں پر اس زندگی میں نہ رنگ نہ رس
سکھ چین کی ایک گھڑی کو گئی ہے یہ جان ترس
بڑے اچھے ہیں لوگ کہ رہتے ہیں خوش سدا خود میں مگن
یہاں چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

ہر شام یہاں کسی دیس کے پنچھی آیا کریں
پل بھر نہ ٹھہریں، کسی دیس نئے چلے جایا کریں
کبھی ان سے جو پوچھیں سجن کا پتا، کچھ اس کی خبر
کہیں —— ہم تو میاں کبھی لوٹ پھریں، کریں روز سفر

یہاں کون سجن یہاں کس کا سجن - یہاں کیسا سجن،
کیوں چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

جب چیت مہینے پینڈے لگے بنجاروں کی
ان دیس دیس کے ایلچیوں ہرکاروں کی
انھیں میت بنا اسی بات کو پوچھیں ہچھو آئیں
یہ لوگ بھی یک دم جی کو مسوس کے رہ جائیں
بڑی دُور رہا ترے پی کا نگر، رہ اس کی کٹھن
کیوں چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

کبھی پوچھیں مست چکور، پپیہے پاگل سے
کبھی متوالے گھنگھور گھٹا کے بادل سے
کبھی جنگل کے ہر فوٹل، بن کے بیلوں سے
کبھی پیروں اور فقیروں گوروؤں چیلوں سے
کس طور بنے اس پی کا ملن، کریں کون جتن،
اسی چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

ارے دوستو تم ہمیں دیکھنے نت یہاں آیا کرو
اس بَیری سجن کو بھی جا کے کبھی سمجھایا کرو
ہر روگ کا ایک علاج ہے رکھا قدرت نے
ہر چیز جُڑے، ہر چاک سِلے، ہر بات بنے
پر دل کے نگینے کو تو بہت ہے ایک ہی چھن
اس چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

پڑا غزلوں کی نیویں اُٹھاتا رہے ہے بچارا کوی
دکھی گیتوں کے دیپ جلاتا رہے ہے بچارا کوی
پر کس کا قصور ہے — ہم نے تو اس کو تھا سمجھایا
کوئی اس سے یہ پوچھے کہ نیت ہیں تم نے کیا پایا
بس ایک لگن، بس ایک جلن، بس ایک دُکھن
کیوں چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

منٹو زندہ ہے

مصطفیٰ زیدی

گھاس سے بچ کے چلو، ریت کو گلزار کہو
نرم کلیوں پہ چڑھا دو غمِ دوراں کے غلاف
خود کو دل تھام کے مُرغانِ گرفتار کہو
رات کو اُس کے تبسّم سے لپٹ کر سو جاؤ
صبح اُٹھو تو اُسے شاہدِ بازار کہو
ذہن کیا چیز ہے، جذبے کی حقیقت کیا ہے
فرش پر بیٹھ کے تبلیغ کے اشعار کہو

کبھی اک گوشۂ تاریک کے ویرانے میں
کسی جگنو کے چمکنے پہ فغاں ہوتی ہے
کبھی اُس مرحمتِ خاص کا اندازہ نہیں
کبھی دو بوند چھلکنے پہ فغاں ہوتی ہے
کبھی منزل کے تصوّر سے جگر جلتے ہیں
کبھی صحرا میں بھٹکنے پہ فغاں ہوتی ہے

اسی رفتار سے چلتا ہے جہانِ گذراں
اسی قدموں پہ زمانے کے قدم اُٹھتے ہیں
کوئی عینک سے دکھاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں
کوئی کاندھوں پہ اُٹھاتا ہے تو ہم اٹھتے ہیں
ایک رقاصۂ طنّازہ کی محفل ہے جہاں
کبھی آتے ہیں بھتیجے کبھی عم اُٹھتے ہیں

ہم نے اُس چور کو سینوں میں دبا رکھا ہے
ہم اُسی چور کے خطرے سے پریشان بھی ہیں
کون سمجھے گا کہ اس سطحِ خوش آغاز کے بعد
اسی ٹھہرے ہوئے تالاب میں طوفان بھی ہیں
بھائی کی آنکھ کے کانٹے پہ نظر ہے سب کی
دیوتا بھی ہیں اسی بزم میں انسان بھی ہیں،

خطِ سرطان سے آتی ہے بلا کی آواز
اور امریکہ کے بازار میں کھو جاتی ہے
جو اُس کی فکر نے تعمیر کیا ہے جس کو
وہ زمیں حسرتِ معمار میں کھو جاتی ہے
کبھی منٹو کا قلم بن کے دہکتی ہے حیات
کبھی سرمائے کی تلوار میں کھو جاتی ہے

ہر پیمبر پہ ہنسا ہے یہ زمانہ لیکن
ہر پیمبر نے جھکائی ہے زمانے کی جبیں
اپنے ہم عصر سے خائف نہ ہوئے وقت کی آنچ
اس کی مٹی میں ستاروں کا دھواں ہے کہ نہیں
اسی مٹی سے دمکتی ہے یہ دھرتی ورنہ
"دور دیک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں"

جسم کے داغ چھپانا تو کوئی بات نہیں
روح کے زخم سلگتے ہیں پسِ پردۂ دل
سر جھکا لیتے ہو تم ریت ہیں جن کے آگے
انہی طوفانوں میں گھر جاتے ہیں لاکھوں ساحل
ایک راہی جسے احساس نہ حسرت نہ طلب
اک سفر جس میں نہ منزل نہ سراغِ منزل

اپنی حساس ؍ سبک ناک سے رومال ہٹاؤ
کھاد میں محض تعفن ہی نہیں، خیز بھی ہے
ذوق درکار ہے قطرے کو گہر کرتے میں
یہ مے ناب پُر اسرار بھی ہے تیز بھی ہے
کچھ تو ہے وجہِ دل آزاری و آہنگ ستیز
ورنہ یہ طبع خوش اخلاق و کم آمیز بھی ہے

شہر کی تیرہ و تاریک گذرگاہوں میں
داستاں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا
زیست قانون و فرائض قفس کے آگے
بے زباں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا
اس شفا خانۂ اخلاق میں نشتر کے قریب
رگِ جاں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا

گوپی ناتھ اور ظفر شاہ کے جیسے لاکھوں
کتنی گم نامی میں جی لیتے ہیں مر جاتے ہیں
کس نے ان آنکھوں میں وہ خواب دہکتے دیکھے
جو اس انسانوں کے جنگل میں بکھر جاتے ہیں
کس کا آئینہ ہے موذیل کی اس روح کا عکس
جس میں مریم کے حسین نقش نکھر جاتے ہیں

اے نئے عصر کی رگ رگ کو سمجھنے والے
فہم و ادراک بدی ہیں تو بدی تیری ہے
چند لمحوں کی خدائی ہے روایات کے ساتھ
فن کے آدرش کی روحِ ابدی تیری ہے
موت یہ صرف سعادت کی ہے منٹو کی نہیں
یہ شب و روز ترے ہیں یہ صدی تیری ہے

ناصر کاظمی

زہرِ غم آ چلا ہے راس بہت | اب ہؤا جان کا ہراس بہت
غم بقدرِ طلب نہیں ملتا | پانی تھوڑا ہے اور پیاس بہت
صبح تک جانے ہم پہ کیا گزرے | دل ہے پھر شام سے اُداس بہت
کیوں نہ روؤں تری جدائی میں | دن گزارے ہیں تیرے پاس بہت
کون دیتا ہے دادِ زخمِ وفا! | یوں تو ملتے ہیں روشناس بہت
جب کوئی دھیان سے گزرتا ہے | شور اُٹھتا ہے دل کے پاس بہت
وادیٔ دل میں پاؤں دیکھ کے رکھ! | ہے یہاں درد کا نکاس بہت
چھاؤں مل جائے دامنِ گل کی | ہے غریبی میں یہ لباس بہت

سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصر
یاد آتی ہے گل کی باس بہت

شاعر لکھنوی

چاہا بھی تو لب کہاں ہلے ہیں
ملنے کو وہ بارہا ملے ہیں

دل میں ترے غم سے ہے اُجالا
ویرانے میں پھول سے کھلے ہیں

ہر سانس پہ ایک زخم تازہ
کیا حسنِ خلوص کے صلے ہیں

بدلے نہ کہیں نظامِ گلشن
پھولوں کو بہار سے گلے ہیں

میں بھول گیا ہوں زندگی کو
اب کے وہ کچھ اس طرح ملے ہیں

ہونٹوں کی خفیف جنبشوں میں
نغموں کے طویل سلسلے ہیں

کس کس کو بتائیں خضرِ منزل
ہر گام پہ راہبر ملے ہیں

دل میں ہے شگفتگی سی شاعر
یہ زخم ہیں یا چمن کھلے ہیں

زہرہ نگاہ

شورشِ قلب و نظر آخر زباں تک آ گئی
بات تو اتنی سی تھی، لیکن کہاں تک آ گئی

ماتمِ حسنِ چمن اہلِ چمن کرتے رہے
بڑھتے بڑھتے، آگ لیکن باغباں تک آ گئی

کہتے کہتے حالِ دل اک واقعہ سا بن گیا
سنتے سنتے بات آخر داستاں تک آ گئی

اب ہمیں خود غم نہیں ہے۔ پرسشِ احوال کا
بات اپنی ذکرِ رودادِ جہاں تک آ گئی

اور ہی طرزِ جفا ڈھونڈیں فلک کی گردشیں
اب وفا بھی منزلِ سود و زیاں تک آ گئی

رات ویراں، کہکشاں حیراں، مہ و انجم اداس
لو زمیں کی بات آخر آسماں تک آ گئی

احمد ریاض

زندگی غم کی آنچ سہہ سہہ کر
یوں جلی یوں بجھی کہ دھول ہوئی

ہم نے بھی جشنِ گل کو دیکھا تھا
آج تک سوچتے ہیں بھول ہوئی

کیا کریں اپنی اس طبیعت کو
آپ سے مل کے بھی ملول ہوئی

حسنِ شیریں رہا شکارِ ہوس
جہدِ فرہاد بے حصول ہوئی

ہم ہیں وہ کشتگانِ شوق جنھیں
صحبتِ دار بھی قبول ہوئی

لے سنبھل ظلمتوں کے رکھوالے
اپنا اب روشنی اصول ہوئی

کس کو ہنسنا ملا چمن میں ریاض
غنچگی کس کی کھل کے پھول ہوئی

نورؔ بجنوری

یوں بیٹھے ہیں صحنِ حرم میں اکتائے اکتائے ہم
عشقِ بتاں سے سچ مچ جیسے ہار گئے بھر پائے ہم

چاہت میں شاداب لبوں کی کیسا جی کا حال ہُوا
غنچہ چٹکا دل بھر آیا، پھول کھلے مرجھائے ہم

ایک نشیلی یاد ہمارے ہاتھ میں ڈالے ہاتھ چلی
بزمِ طرب سے جھومتے گذرے بالوں کو بکھرائے ہم

ہم تھے صبا کے چاہنے والے کھیلے تند بگولوں سے
ہم تھے مہکتی اوس کے عاشق طوفاں سے ٹکرائے ہم

آج ہمیں اک جانِ حیا نے چپکے سے بے مہر کہا
دل ہی دل میں اپنے یارو آج بہت شرمائے ہم

کیسے کیسے خواب سہانے روئے لپٹ کر آنکھوں سے
جاگنے کو تو جاگ اٹھے پر، آہ بہت پچھتائے ہم

ایک جہاں کے آنسو ہم نے لعل و گہر میں ڈھال دیئے
نورؔ کسے معلوم فلک کے، کب سے ہیں ہمسائے ہم

منٹو کا پیغام!

عظیم قریشی

مرے مطربو، ہمدمو، رازدارو
کہانی ہے چھایا
کہانی ہے سایا
کہانی نے مجھ کو کہانی بنایا
ستارے جو اُبھرے کہانی میں ڈوبے
شرارے جو دہکے کہانی میں ڈوبے
نظارے جو نکھرے کہانی میں ڈوبے
یہ تریا نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
یہ گڑیا نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
یہ مینا نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
کہانی اَنا ہے
کہانی بقا ہے
کہانی صدا ہے
مرے مطربو، ہمدمو، رازدارو
کہانی ہے چھایا
کہانی ہے سایا
کہانی نے مجھ کو کہانی بنایا

باقر مہدی

طوفانوں سے ٹکر لی تھی یہ تو کنارا جانے ہے
ساحل پر ہم ڈوب رہے ہیں کیا یہ دھارا جانے ہے؟

نام ہمارا جب آتا ہے تم چپ رہ کر خوش ہوتے ہو
کہنے کو یہ راز ہے لیکن عالم سارا جانے ہے

یہ دنیا ہے دیوانوں سے، بزم سجی ہے پروانوں سے
شمع ہو تم، یہ بات نہ مانو، دل تو تمھارا جانے ہے

شہروں شہروں، ملکوں ملکوں، آوارہ ہم پھرتے ہیں
راہِ وفا کا ذرّہ ذرّہ نام ہمارا جانے ہے

دل کی بیتیں، دل کی باتیں، جادوگر کی ساری باتیں
شام کا تارا، جانے نہ جانے، صبح کا تارا جانے ہے

کچے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں، کتنے ساتھی چھوٹ چکے ہیں
جانے کیوں دل اب تک تم کو اپنا سہارا جانے ہے

ہیرو ہوئے تھے کل دیوانے، آج ہوئے ہیں ہم دیوانے
فرزانوں کی یہ دنیا، انجام ہمارا جانے ہے

باقرؔ کب تک خوں تھوکو گے، مرنے کی تدبیریں سوچو
کس کی خاطر جیتے ہو، یہ دل ہی تمھارا جانے ہے

جمیل ملک

دل کی دل نے نہ کہی، یوں تو کئی بار ملے
ہم شناسا سے تھے مگر صورتِ اغیار ملے

اُس سے کہنا کہ نہ اب اور وہ اِترا کے چلے
دوستو تم کو اگر یارِ طرحدار ملے

بے وفا ہم ہیں تو اے جانِ وفا یوں ہی سہی
ڈھونڈھ لینا جو تمھیں کوئی وفادار ملے

ہم تو دل دے کے بھی دنیا میں اکیلے ہی رہے
جو ہوس کار تھے سب اُن کے طرفدار ملے

دل کی قیمت تو محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھی
جو ملے صورتِ زیبا کے خریدار ملے

ہم نے کانٹوں کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے
خار بھی ہم سے برنگِ گل و گلزار ملے

دُوریاں، فاصلے ہو جاتے ہیں طے آخر کار
سرِ گلزار جو بچھڑے تھے، سرِ دار ملے

بشیر منذر

درد پہلو میں پرفشاں سا ہے
ان کے آنے کا کچھ گماں سا ہے

حضرتِ دل مجھے کہاں لائے
ہر طرف ملگجا دھُواں سا ہے

گردشیں کس زمیں پہ لے آئیں
ذرہ ذرہ اک آسماں سا ہے

یاد میں ان کی یوں ہُوا محسوس
جیسے پہلو میں گلستاں سا ہے

تم یہ کہتے ہو، ہوگئی ہے سحر
میری نظروں میں اک دھُواں سا ہے

مجھ سے تم ہی نہیں فقط ناراض
سارا عالم ہی سرگراں سا ہے

کاٹ کر پر اُڑا دیئے منذرؔ
اب قفس بھی اک آشیاں سا ہے

اک پریزاد کے مہمان ہیں ہم
جانے کیوں پھر بھی پریشان ہیں ہم

ہائے گُھٹ گُھٹ کے مرے جاتے ہیں
دلِ عشّاق کا ارمان ہیں ہم

اب چلے آئے ہو کیوں بالیں پر
اب تو کچھ دیر کے مہمان ہیں ہم

کون اپنائے گا محفل میں ہمیں
وقت کی ٹوٹی ہوئی تان ہیں ہم

کس طرح قرب ترا حاصل ہو
کوئی دامن نہ گریبان ہیں ہم

ایک بھی اشک نہیں آنکھوں میں
کس قدر بے سروسامان ہیں ہم

زندگی کیسے کٹے گی منذر
بس اسی بات سے حیران ہیں ہم

(گیت)

کرن

ضمیر اظہر

مَیں رنگ روپ کی رانی
شفق کی بگیا سُپنا میرا، دھنک مری کہانی
میں رنگ روپ کی رانی

ڈار ڈار پر جھولا جھُولوں، پھُول پھُول پر ناچوں
کلی کلی کا چوم کے مکھڑا جھوم جھوم کر ناچوں
چمن دمن میں گھوم گھوم کر سنوں پَون کی بانی
میں رنگ روپ کی رانی

کومل تارے موتی میرے، چاند ہے میری نیّا
جگمگ جگمگ کرنے والا جگنو میرا بھیّا
مجھ من موہن، سندر کی نگری ہے کتنی سہانی
میں رنگ روپ کی رانی

کنول کنول پر منڈلاتی ہوں جب من کو بہلانے
دیکھ کے اپنے آئینے میں میرے پنکھ سہانے
چلتے چلتے، رُک رُک جائے ندی کا بہتا پانی
میں رنگ روپ کی رانی

جانتی ہوں مَیں جیون میرا ہے اک کچا موتی
پل دو پل میں مل جائے گی خاک میں جس کی جوتی
پھر بھی مسکا مسکا کر جیتی ہوں مَیں دیوانی!
میں رنگ روپ کی رانی

داغ

فراق گورکھپوری

اس سے قبل یہ مضمون 'نگار' میں چھپ چکا ہے۔ اب اس لئے پیش کیا جا رہا ہے، کہ نظرِ ثانی کے بعد فراق صاحب نے اسے پہلے سے تقریباً تین گنا بڑھا دیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون نیا بن جاتا ہے۔ (مدیر)

میرا لڑکپن ہی رہا ہوگا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت بھی داغؔ کا کلام پڑھ کر بلکہ داغؔ کا نام سُن کر مجھے غصہ آجاتا تھا اور شاعر کے متعلق غصہ، توہین اور نفرت کے جذبات میرے اندر اُبال کھانے لگتے تھے۔ اُردو کے کسی بھی اور شاعر کے کلام کا یہ ردِ عمل مجھ پر نہیں ہوتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو خوبیاں داغؔ کے کلام میں ہیں وہ دوسروں کو نظر آئیں اور مجھے نظر نہ آئیں۔ ان خوبیوں کا احساس مجھے اُس وقت بھی تھا اور رفتہ رفتہ یہ احساس بڑھتا گیا لیکن غصہ اور نفرت کا جذبہ اس بڑھتے ہوئے احساس سے نہ کم ہوا نہ کمزور پڑا۔۔ میں بیک وقت داغؔ کو صفِ اوّل کا شاعر مانتا رہا، ان کی فطنت (GENIUS) کا قائل رہا اور کلامِ داغؔ کے متعلق اپنے اندر انتہائی ناپسندیدگی کا جذبہ پاتا رہا۔

پینتالیس برس سے برابر میرا یہی حال رہا ہے۔ کلامِ داغؔ کے محاسن مجھ سے خراجِ تحسین بھی حاصل کرتے رہے اور مجھے غصہ بھی دلاتے رہے۔ جھلانے کا لفظ میری حالت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا بلکہ ہماری طرف کا ایک رائج لفظ زیادہ صحیح مصوری میری حالت کی کرتا ہے۔ یعنی میں کلامِ داغؔ پڑھ کر کچکیا اُٹھتا تھا۔ اب جبکہ "نگار" داغ نمبر نکال رہا ہے تو مجھے اپنے مرکزی ردِ عمل کو کچھ واضح کرنا پڑے گا۔ بات کیا ہے؟ غالبؔ کے مرجانے کے بعد اُردو شاعری باستثنائے ایک دو شاعروں کے معشوق کی عزت کرنا بھول گئی اور معشوق سے بیگانگی، نرمی، خلوص اور جذباتی قربت محسوس کرنا بھول گئی اور نصف صدی سے زیادہ بھولی رہی۔ تہذیبِ محبت مٹ چلی تھی۔ غالبؔ کے بعد تہذیبِ محبت کا چراغ حالیؔ، شیفتہؔ، شادؔ عظیم آبادی اور آسیؔ غازی پوری کے کلام میں ٹمٹماتا رہا۔ یوں تو پرستاری اور ہم آہنگی، نرمی اور انسانیت کا جو جذبہ میرؔ کے یہاں ملتا ہے وہ جذبہ اُس شکل

ہیں تو غالبؔ کے یہاں بھی نہیں ملتا ـــــ لیکن غالبؔ کے یہاں کچھ دوسری اتنی رچی ہوئی خوبیاں ملتی ہیں کہ یہ کمی پوری ہو جاتی ہے غالبؔ کے بعد جن شاعروں کا نام میں نے گنوایا ہے انھیں چھوڑ کر دوسرے شعرا کا کلام سچے اور پر خلوص جذبات محبت سے عموماً محروم ہے۔ پھر بھی ان شاعروں کے یہاں ایسے عشقیہ اشعار نہیں ہیں یا عموماً نہیں ہیں جنھیں سُن کر ایک شریف آدمی کے دل میں آگ سی لگ جائے۔ غالبؔ کے بعد اس طرح غصہ دلانے والا عشقیہ کلام صرف داغؔ کا ہے۔

دلّی کے اخلاقی انحطاط کی انتہا لال قلعہ کی زندگی اور ہزار ہا مسلمان جاگیرداروں کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ تہذیب کا ظاہری پہلو اس کے تمام ٹیم ٹام تو ان تمام جگہوں اور لوگوں میں ملتے ہیں۔ لیکن تہذیب کی روح اس زندگی میں مردہ ہو چکی ہے۔ ایک کٹّے پن اور خشونت نے تہذیب کی روحانی برکتوں پر غلبہ پالیا ہے۔ دل سینوں میں رچنا اور رنگین ہونا بھول چکے ہیں۔ اس انحطاطی دور میں دلّی کی تہذیب کا دل قصاب کا دل بن گیا ہے ـــــ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اب معشوق سے پریم اور محبت مخصوص کرنے اور برتنے کے بدلے اب اس کی چٹکیاں لی جاتی ہیں۔ بجائے اداس یا غمگین ہونے کے اب ایک بے حیا کھسیاہٹ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ دل کے معاملے اب کشتی معرکہ آرائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ محبت کا جذبہ ایک انتقامی جذبہ بن جاتا ہے۔ اب ذہنی طور پر بجائے معشوق کو گلے لگانے کے جذبہ کے اس پر چڑھ بیٹھنے کا جذبہ کار فرما ہے۔ نرم لبی یا شائستہ لہجہ اب چرب زبانی میں بدل جاتا ہے اور ٹھیٹھ کر کے اسے بیان کیجیے تو کہنا پڑے گا کہ محبت کے دل اور زبان پر چربی چڑھ جاتی ہے۔ دونوں کی لچک مٹ کر ایک خشک کرّے پن یا اکھڑ پن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دل اور زبان دونوں ہڈی کے بن گئے ہیں یا نہایت سخت و کرخت گوشت کے۔ اب شاعری اپنی گھلاوٹ سے بجائے نرم بول بولنے کے پتھر مارتی ہے۔ داغؔ کے کلام میں یہ تمام خرابیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ سپردگی کا جذبہ ڈاکہ زنی کا جذبہ بن گیا ہے۔ بازاری عشق نے حسن پر ہلّا بول دیا ہے۔ ہم آہنگی مغائرت میں بدل گئی ہے۔

لیکن اس تمام عمل میں ایک ہنگامہ آرائی کی شان ہے اور یہ شان اور آن بان، یہ ہماہمی جس نیور کے ساتھ داغؔ کے کلام میں نظر آتی ہے داغؔ کے پہلے یا داغؔ کے بعد اُردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔ داغؔ کی زبان میں غلیلے جڑے ہوئے ہیں۔ جو رہ رہ کر چھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ دلّی کی بھرپور زندگی اور لال قلعہ کی رنگ رلیاں داغؔ کے کلام میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہوتی ہیں کہ دیکھنے سننے والے دیکھتے سنتے رہ جاتے ہیں۔ گالی دینے کا بھی چیل چھٹے مارنے کا بھی ایسا سلیقہ سب کو کہاں آتا ہے۔ دلّی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موج زنی کے ساتھ داغؔ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے۔ داغؔ کے متعلق رائے عامہ بالکل سچائی پر مبنی کہ یہ شخص زبان کا لاثانی جادوگر ہے۔ اُردو شاعری نے داغؔ کے برابر کا نغزے باز نہ آج تک پیدا کیا ہے نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔ داغؔ کے جذبات پر نفرین بھیجتے ہوئے بھی بلے اختیار مُنہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔ داغؔ کا تغزل سراسر دل سوخت سہی لیکن اس کی بے پناہ قوتِ اظہار کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ مغلیہ خاندان کی تلوار کی فاتحانہ شان اور چکاچوند پیدا کر دینے والی چمک دمک جب زندگی اور جذبات کی تاریک پستیوں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے تو وہ داغؔ کی شاعری بن جاتی ہے۔

لیکن داغؔ کو محض غیر شریفانہ اور عامیانہ جذبات کا جادو بیان شاعر سمجھنا پوری سچائی نہیں ہے۔ الفاظ، محاوروں اچھوتے فقروں اور بالکل بے لاگ یا فطری بے ساختہ باتوں کا لاثانی شاعر ہونے کے علاوہ داغؔ کچھ اور بھی ہے۔ مومنؔ کے نفسیاتی تجزیوں کی پرچھائیاں بھی داغؔ کے بہت سے اشعار پر پڑتی ہیں۔ پھر دلّی کی زبان میں جو لطیف اشاریت آگئی تھی وہ بھی داغؔ کی غزلوں

میں وہ باتیں پیدا کر دیتی ہے۔ جنھیں دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ غالب بھی للچا اُٹھے تھے۔ دل کی چٹکیاں لینے والی بے ساختگی کی ایسی مثالیں اُردو کا کوئی دوسرا شاعر آج تک پیش نہیں کر سکا۔ داغ کے ایسے اشعار بیک وقت سامنے کی باتیں بھی معلوم ہوتے ہیں اور جادو بھی۔

بول چال کی زبان پر جیسی قدرت داغ کو تھی ویسی قدرت کسی اور شاعر کے یہاں ڈھونڈھنا سعیِ لاحاصل ہے۔ اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جو بولی ٹھولی کی شکل میں وجود میں آتا ہے سمٹ کر داغ کی زبان میں جذب ہو گیا تھا۔ اس امر میں داغ ہمیں شیکسپیئر، مولیئر وغیرہ مصنفین کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن افسوس داغ کی بولی کے پیچھے جو دنیائے خیال ہے وہ حسین نہیں ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی لیکن صرف کبھی کبھی وہ بہت حسین بھی ہے۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں کلامِ داغ سے متعلق اپنے اس جذبے یا اُس جذباتی ردِّ عمل کا ذکر کیا ہے جس میں بیک وقت شدید جھلاہٹ اور بے اختیارانہ تحسین کی کیفیتیں میں اپنے اندر پاتا تھا اور پاتا ہوں۔ نصف صدی کے اندر اندر گلزارِ داغ کی فضا کی سمّیت کا پورا پورا احساس دلدادگانِ ادب کو ہو چلا ہے۔ داغ کا عشق یا ان کا شاعرانہ شعورِ عشق غور کرنے سے پُرخلوص عشق معلوم ہی نہیں ہوتا بلکہ محض ایک جنسی خوش باشی اور خوش وقتی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں پُرخلوص داخلیت نہیں ہے، سوز و ساز نہیں ہے، تہذیب اور کلچر کے عناصر اس میں سموئے ہوئے نہیں ہیں۔ داغ کی شاعری بے پناہ سحر کارانہ فطانت کے ساتھ اس وقت کے اور خود شاعر کے بگڑے ہوئے مذاقِ عشق کو جادو کا آئینہ دکھاتی ہے۔ میرے کسی دوست نے اسے جیبل جھپٹ قسم کی شاعری بتایا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ داغ ایک بگڑے ہوئے زمانہ کا سب سے بڑا بگڑا ہوا یا بہت اچھی طرح رچا اور بنا ہوا بگڑا شاعر ہے۔ لیکن آخر اسی بگڑے ہوئے زمانہ میں حالی، تسلیم، شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری ایسی پاکیزہ عشقیہ شاعری ہمیں کیسے دے سکے؟ جلالؔ صدہا ایسے اشعار کیسے دے گئے جن میں سوز و ساز کی چاشنی اب تک رسمسا رہی ہے۔ خود امیر مینائی مرآۃ الغیب میں اور صنمخانۂ عشق میں درجہاں بسا اوقات وہ داغ کی ناکامیاب نقالی کے مرتکب ہو گئے ہیں ہزارہا پاکیزہ عشقیہ اشعار ہمیں کیسے دے گئے۔ داغ کی سب سے بڑی شاعرانہ خوش نصیبی ان کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ اُن کی کامیابی ایک مہلک خطرے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ان کی جادو بیانی واسوخت بن گئی۔ داغ غزل میں جلی کٹی سنانے کے ملک الشعرا بن گئے۔ اسی سے یہ چھینٹی ہوئی شاعری اپنی تڑک بھڑک سمیت، اپنے تمام تاؤ بھاؤ کے باوجود اپنے تمام تیور اور تیکھے پن کے باوصف اس بہار سے محروم ہے جو خود داغ کے ان ہم عصروں کے کلام کو تری اور تازگی، رنگ اور شگفتگی بخش رہی ہے جن کے نام ابھی ابھی میں نے گنوائے ہیں۔ آج داغ کا کلام ان کے معاصرین اور پیش روؤں کے کلام سے زیادہ پرانی چیز ہو گیا ہے۔ لیکن اگر ہم داغ کی غزلوں کو معیاری غزلیں نہ مانیں، اگر ہم داغ پرستی کے خطروں سے اپنے مذاق کو محفوظ رکھ سکیں تو ان غزلوں کی دلفریب بلکہ مسحور کن ادا پاشی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مجھے بھی اب سے چوتھائی یا تہائی صدی پہلے تک داغ کے کلام سے ایک جھلاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ ضرورت اب نہیں رہی۔ اب ہمیں اپنا غصہ تھوک دینا چاہیئے اور داغ کی قیامت خیز ناسنجیدگی کو کھلے دل سے خراجِ تحسین ادا کرنا چاہیئے۔ یہ شخص ہماری شاعری کی بدقسمتی ہو کر بھی ہماری شاعری کی ایک بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ ہمیں اپنی تہذیب میں مناسب موقعوں پہ شرارتوں کو بھی جگہ دینا چاہیئے۔ داغ شرارت کے انھی موقعوں کا شاعر ہے۔ اس شخص نے ہرزگی کو GENIUS کا مقام عطا کر دیا ہے۔ داغ کی شوخی، داغ کی چٹکیاں، داغ کی شرارتیں (جب ہم داغ پہ ایک بار رہ رہ کے غصہ اُتار لیتے ہیں) قابلِ رشک نظر آتی ہیں۔ ہم داغ کے تغزل پہ وجد نہ کریں

لیکن پھڑک ضرور اُٹھتے ہیں۔ اس کے کوچوں سے چوٹ بھی لگتی ہے اور گدگدی بھی لگتی ہے۔ اس طرح ہمارے دماغوں کو کونسا شاعر گدگدا سکا ہے ؟

داغ کے یہاں ہمیں زبان کے جیسے تیز چٹخارے ملتے ہیں جو چٹپٹی زبانِ کلامِ داغ میں چلتی ہوئی نظر آتی ہے اُردو شاعری میں ہمیں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی شاید کسی زبان کی شاعری میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ پھر بھی داغ کو زبان کا سب سے بڑا شاعر نہیں مانا جا سکتا ہے۔ داغ جو باتیں کہنا چاہتے تھے ان باتوں کے لئے جس زبان اور جس قسم کی زبان درکار تھی داغ البتہ ایسی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن جو باتیں میر، درد، مصحفی، آتش، انیس یا اقبال نے کہی ہیں وہ باتیں داغ کی باتوں سے بڑی اور زیادہ خوبصورت باتیں ہیں اور اُن باتوں کو داغ کی زبان ادا نہیں کر سکتی۔ تو پھر ان شاعروں کو زبان کا شاعر کیوں نہیں کہا گیا۔ صرف داغ کو بہت سے لوگوں کے قول کے مطابق زبان کا شاعر کیوں مانا گیا ؟ وجہ صاف ہے۔ جب بڑے خیالات، شریفانہ جذبات، بڑی باتیں کامیابی سے کہہ دی جاتی ہیں تو زبان اور محض زبان پر (خیالات کو الگ کر کے) ہماری توجہ نہیں جاتی۔ بلکہ شعر کی روح اور قالب معنی اور صورت کی پوری اکائی پر ہماری توجہ جاتی ہے۔ جب بات یا خیال یا جذبہ معمولی ہو اور طرزِ بیان سب کچھ یا قریب قریب سب کچھ ہو تو ہم ایسے شاعر کو زبان کا شاعر کہتے ہیں۔ زبان کا شاعر ہونا سب سے بڑا اور سب سے کامیاب شاعر ہونا نہیں ہے۔ ہماری زبان کا جادو اسی زبان تک محدود نہیں ہے جو داغ نے لکھی ہے۔ ہماری زبان کی رنگا رنگ سحرکاریاں، اس کے لطائف و ظرائف اس کے کثیر التعداد اسالیب سب داغ کے دواوین میں بند نہیں ہیں۔ میر، غالب، آتش، انیس، نظیر، اقبال، چکبست سبھی زبان کے بادشاہ ہیں، زبان محض زندہ دل مکالمہ، چھیڑ چھاڑ، چہل، بولی ٹھولی، حاضر جوابی یا بلیغ نوں تک محدود نہیں ہے۔ ادبی زبان سطحی بولی ٹھولی سے شروع ہو کر لسانِ غیب اور الہامات تک پہنچ جاتی ہے زبان محض علمِ مجلس نہیں ہے۔ کیا داغ پریم چند کی زبان لکھ سکتے تھے۔ کیا داغ کے خطوط کا مرتبہ زبان کے لحاظ سے بھی خطوطِ غالب کے برابر ہے۔ کیا داغ کی زبان داغ سے ایسے اشعار کہلا سکتی ہے :-

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے — میر

کھلی تھی آنکھ خوابِ عدم سے ترے لئے — آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے — درد

نبند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں — غالب

میرا پیام صبا کہیو میرے یوسف سے — نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری — آتش

گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلفِ یار کی بو — پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا — جلال

گورِ پر عبرت یہ کہتی ہے امیر — آئے تھے دنیا میں اس دن کیلئے — امیر

بزمِ ماتم کسی کی سونی ہے — دو قدم پر تو گھر ہے چل بیٹھو — امیر

کہا گیا ہے کہ ہنسی ایک سماجی چیز ہے آنسو تنہائی کی چیز ہے۔ لیکن سماجی چیزوں میں تنہائی کے شاید عناصر ہوتے ہیں اور تنہائی کی چیزوں میں تمام انسانیت کو گھیر لینے والی پہنائی ہوتی ہے۔ محض ہنسنے ہنسانے والا فن کار حقیقتاً بہت تنہا انسان ہوتا ہے۔ ہماری دنیائے ادب میں آج داغ رونقِ محفل ہونے کے بجائے تنہا رہ گئے ہیں۔ یہی حال ریاض کا بھی ہوا جس کے قہقہے گونج کر خاموش ہو گئے اور جن کی جگہ ہمارے دلوں میں جگر کی تحت الغنائی شاعری نے لے لی۔ ہنسی میں جب تک آنسوؤں کی نمی کی چاشنی نہ ہو وہ دیر پا نہیں ہوتی۔ ادب طربیہ اداکاری نہیں ہے۔ ایسے اداکار سے ایک زمانے تک لطف اندوز ہو کر دنیا

اُسے تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ یہ ہے ہنسی کا المیہ۔

زمانے کی ہوا بدلی نگاہِ آشنا بدلی
اُٹھے غفلت سے سب بیگانۂ شمعِ سحر ہو کر بیگانہ

یہی وجہ ہے کہ آج اور آئندہ بھی ہمارے شعرا زبان، بیان، طرزِ ادا، طرزِ احساس اور مذاقِ سخن میں سب سے کم استفادہ داغ سے کریں گے اور میر، آتش، غالب، انیس، اقبال اور داغ کے ان معاصرین سے زیادہ استفادہ کریں گے جن کے کلام میں جذبات کے شبنم کی تھرتھراہٹ اور سرسراہٹ ہے۔ لیکن جب تک اُردو زبان ہے سب کے سب داغ کی جادو بھری شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ عید پیچھے ٹر۔ لیکن سال بھر میں ایک دن عید یا ہولی ضرور منائیں گے۔ ہم داغ کو بھولنا بھی چاہیں تو بھول نہیں سکتے۔

سُنیئے نہ یہ اشعار ہیں یا آتش کے پرکالے؟

وہ مزے عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

آج تو داغ کو ہم لوگ تیرے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

لذتِ دیدِ دگر چشمِ تماشا لے گی
ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لے گی

اب وہ یہ کہہ رہے ہیں مری مان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے

خارِ حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

سمجھو پتھر کی تم لکیر اُسے
جو ہماری زبان سے نکلا

کیونکہ اب اس نگہ ناز سے جینا ہوگا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا
اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

دوسرے مصرع کی ترکیب میں قیامِ حیدر آباد کا اثر پڑ گیا ہے۔

کر دیا دل نے الگ صاف ہمیں اُلفت میں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں بگانے سے

کیا کہیئے کس طرح سے جوانی گزر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

جناب شیخ ہیں! آداب عرض کرتا ہوں
اندھیری رات میں چھپ کر کہاں چلے استاد

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

آنکھ میں آنکھ تو ڈالی نہیں جاتی ظالم
دل میں دل ڈال دے کس طرح سے انسان کوئی

اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا
میں جاؤں گا اگر مرا سایا نہ جائے گا

ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں
وہ نظریں نہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں

ضد ہر اک بات پر نہیں اچھی
دوست کی دوست مان لیتے ہیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

جلوہ دکھا تری رعنائی کا
کیا کلیجا ہے تماشائی کا

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
ہم سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

زندگی عشق میں دو بھر ہے تو مر جائیں گے
اب یہ وہ کام کریں گے کہ جو آساں ہوگا

مبارک خضر کو ہو عمرِ جاوید
یہ تھوڑی سی گزر جائے تو اچھا

تمہیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

لگ گئی چپ تجھے اے داغ کہاں کی ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

بھر دی ہیں کیا ادائیں اس شوخِ سیم تن میں
اک ڈیڑھ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصحِ مشفق
دیکھا ہے کہ اس ماہ لقا کو نہیں دیکھا

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا
دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں

رنجِ دشمن بھی گوارا لیکن
تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا

بگڑ بیٹھے عبث ذکرِ عدو پر
سنا کیا آپ نے میں نے کہا کیا

نہ دلاسا نہ تسلّی نہ تشفّی نہ وفا
دوستی اس بتِ بدخو سے نباہیں کیونکر

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ہم مر گئے تو پرسشِ نام و نشاں ہے اب
اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

عشق بازی کو ہے سلیقہ شرط
یہ گنہ بھی ہے یہ ثواب بھی ہے

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

داغ نے دیکھے ہیں ہزاروں حسیں
آپ نے کس شخص سے دعوے کیا

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے
تمہیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

تمام بزم جسے سن کے رہ گئی مشتاق
کہو وہ تذکرۂ ناتمام کس کا تھا

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی
ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مر گئے
چٹکی میں تھا جو تیر وہ لب پر سخن ہوا

بار کا پاسِ نزاکت دلِ ناشاد رہے
نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

گرتے ہوتے الجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

لے ہی لو آئیں گے اسے ہمدم
میرے ہی نام سے تو آئے گا

نام دل کیجیے نا سزا کیجیے
کہیے سمجھیے مجھے برا کیجیے

کہاں تھے رات کو ہم سے ذرا نگاہ ملے
تلاش میں ہے کہ جھوٹا کوئی گواہ ملے

اب کی کچھ منہ سے نکالا تو تمہیں جانو گے
داغ پیر مجھ کو نہ کہنا جو برابر نہ کہوں

اس کے ہاتھوں سے ہی ذلت و خواری ہوگی
غیر اپنی تو خبر لیں مجھے کیا کہتے ہیں

شرمیلی آنکھ نگہ بیباک ادا چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

ابرِ رحمت ہی برستا نظر آیا زاہد
خاک اڑتی کبھی دیکھی نہ خراباتوں میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

راہ پر آن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

وہی مؤذن نے اذاں وصل کی شب پچھلے پہر
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

چلے جو وہ تو قیامت بپا تھی چار طرف
ٹھہر گئے تو زمانہ کو انقلاب نہ تھا

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں

سنائی جاتی ہیں در پردہ گالیاں مجھ کو
کہوں جو میں تو کہیں "آپ سے کلام نہیں"

سب اہلِ حشر جب اپنے کئے کو پائیں گے
بڑا مزہ ہو جو مجھ کو مرے گناہ لگیں

میری فریاد دوسرا نہ سنے
تم سنو اے بُتو خدا نہ سنے

کوچۂ دشمن کو وہ جنت کہیں
مٹ نہ گیا باغِ ارم کی طرح

داغ کے بعد ہندوستان کی زندگی اور شاعری کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوتی ہے قومی شعور میں ایک نئی سنجیدگی اور شائستگی آنا شروع ہوتی ہیں۔ آج داغ کو مرے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں اردو شاعری کہاں سے کہاں پہنچ گئی یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ عربی، فارسی لغات کا جتنا اثر اس دور کی شاعری پر نظر آتا ہے اتنا اثر پہلے کی اُردو شاعری پر نظر نہیں آتا۔ پھر بھی شاعری کی زمین کو داغ کی خوش خرامیوں نے جس طرح ہموار کر دیا تھا، اس کی مٹی کو داغ نے جس طرح نرما دیا تھا، زبان کو داغ نے جس طرح ہندی کی چیدگی کر دیا تھا جو سلجھاؤ، صفائی، شستگی روی داغ نے اُردو شاعری کو عطا کی تھی وہ بھی فارسیت کے ساتھ ساتھ داغ کے بعد کی اُردو شاعری کا مستقل جزو بن گئی۔ میر، غالب اور داغ کی زبانیں آج کی اُردو شاعری کے اجزائے ترکیبی بن گئی ہیں۔ اُردو کی کامیاب شاعری میں جو آج ہمیں سلجھاؤ نظر آتا ہے وہ بہت کچھ داغ کا رہین منت ہے۔ داغ نے مستقل اثر اُردو زبان پر چھوڑا ہے۔ اس باب میں شاعری کی زبان پر داغ کا وہی احسان ہے جو انگریزی زبان پر خاص کر انگریزی نثر پر ڈرائیڈن کے کارناموں کا رہا۔ یوں تو ہر زبان کی شاعری کا آغاز سادہ اور بے تکلف زبان و بیان سے ہوتا ہے لیکن یہ زبان شروع میں توتلی اور ہکلی رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس میں پیچیدگیاں اور پیچیدگیوں کے ساتھ بھاری پن پیدا ہونے لگتا ہے۔ بعد کو، بہت بعد کو ایک ایسا شاعر یا

ادیب ہر زبان میں پیدا ہوتا ہے جو سادہ اور بے تکلف بیان کے ایسے سانچے زبان کو دے دے جو اس زبان کے خد و خال اور اس کی نوک پلک کو مستقل طور پر متعین کر دیں ـــــ اردو زبان کے حق میں یہ کام ناسخ نے کرنا چاہا تھا لیکن کامیابی داغ کے ہاتھ رہی ـــــ داغ نے اردو زبان کے خد و خال کو اس کے نکھار کو اور اس کے جسم کی لکیروں کو اس طرح ابھارا اور چمکایا کہ اب وہ آسانی سے جانی پہچانی جا سکتی ہے۔ ملک میں اردو اور ہندی کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے لیکن ہندی والے بھی رہ رہ کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اردو زبان میں جو بے ساختگی ہے جس طرح اردو سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے اگر یہ صفت ہندی میں نہ آئی تو ہندی کا مستقبل تاریک ہے ـــــ تو کیا یہ صفت جس حد تک جس خوبی سے جس کامیابی سے داغ نے اردو زبان کو دی اسی طرح کسی اور نے یہ صفت اور صلاحیت اردو زبان کو دی ؟

برج بھاشا کی پہلی گرامر

سید مسعود حسن رضوی ادیب

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں کوکلتاش خان یعنی بادشاہ کے کوکہ کی فرمائش سے ایک کتاب تحفۃ الہند کے نام سے لکھی گئی جس کا موضوع ہے اہلِ ہند کے علوم متداولہ۔ یہ کتاب چھپ کر کبھی شائع نہیں ہوئی، مگر اس کے چند نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ایک نسخہ میرے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ مصنف نے کتاب کا دیباچہ خود لکھا ہے، جو میرے نسخے میں مختصر اور دوسرے نسخوں میں طولانی ہے۔ مختصر دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اورنگ زیب کے مطالعے کے لئے لکھی گئی اور طولانی دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے کسی بیٹے کے لئے لکھی گئی۔ اس کا نام بعض نسخوں میں اعظم شاہ اور بعض میں معزالدین جہاندار بتایا گیا ہے۔ مصنف کے والد کا نام سب نسخوں میں فخرالدین محمد ہے، لیکن خود اس کا نام بعض نسخوں میں میرزا محمد اور بعض میں میرزا خان ہے۔

میرے کتب خانے میں قصائد عرفی کی ایک شرح مفتاح الشکات کے دو قلمی نسخے ہیں۔ شارح کا نام میرزا جان بن فخرالدین محمد ہے۔ یہ شرح سنہ ۱۰۷۳ھ میں یعنی اورنگ زیب کے عہدِ سلطنت میں لکھی گئی۔ کچھ عجب نہیں کہ مفتاح الشکات اور تحفۃ الہند کے مصنف بھائی بھائی ہوں۔ اگر تحفۃ الہند کے مصنف کا صحیح نام میرزا خان تھا تو میرزا جان بن فخرالدین محمد اور میرزا خان بن فخرالدین محمد کا حقیقی بھائی ہونا اور زیادہ قرین قیاس ہو جاتا ہے۔

تحفۃ الہند میں ایک مقدمہ، سات باب اور ایک خاتمہ ہے، جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:-

مقدمہ ۔ ناگری رسم خط اور بھاکا کے قواعد کلیہ ۔

پہلا باب ۔ پنگل یعنی اہلِ ہند کا علمِ عروض ۔

دوسرا باب ۔ تک یعنی اہلِ ہند کا علمِ قافیہ ۔

تیسرا باب ۔ النکار یعنی اہلِ ہند کا علمِ بیان و بدیع ۔

چوتھا باب ۔ سنگار رس یعنی اہلِ ہند کا علمِ عاشقی و معشوقی ۔

پانچواں باب ۔ سنگیت یعنی اہلِ ہند کا علم موسیقی۔
چھٹا باب ۔ کوک یعنی عورت مرد کے اقسام اور عورتوں کے ساتھ معاشرت۔
ساتواں باب ۔ سامدرک یعنی اہلِ ہند کا علمِ قیافہ۔
خاتمہ ۔ اہلِ ہند کے لغات و مصطلحات و کنایات۔

مقدمۂ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ناگری حروف اور رسمِ خط کا تفصیلی بیان ہے اور دوسرے میں بھاکھا کے "قواعدِ کلیہ" ہیں۔ مصنف خود کو ان قواعد کا "مخترع" کہتا ہے۔ یعنی اس کا دعویٰ یہ ہے کہ بھاکھا (برج بھاشا) کی گرامر اس نے پہلے پہل لکھی ہے۔ میں نے ہندی کے مستند عالموں سے دریافت کیا مگر وہ اس سے پہلے کی لکھی ہوئی برج بھاشا کی کسی گرامر کا نام نہ بتا سکے۔ بظاہر مصنف کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ یہ برج بھاشا کی پہلی گرامر ہے۔ اگرچہ یہ گرامر کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے، پھر بھی تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور اردو کے بارے میں لسانی تحقیق کرنے والوں کے لئے بہت کار آمد ہے۔ اس سے کھڑی بولی اور برج بھاشا کا باہمی تعلق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مقدمۂ کتاب کے اسی دوسرے حصے کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مصنف نے ہندی لفظوں کا وہ تلفظ اختیار کیا ہے جو بھاکھا والوں کی زبانوں پر جاری تھا اور ہر لفظ کا تلفظ تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا ہے کہ کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں نے اختصار کے خیال سے ان بیانات کو حذف کر کے ہر ہندی لفظ پر اعراب لگا دیئے ہیں۔

زبان کی کیفیت

اہلِ ہند کی زبانیں متعدد ہیں، لیکن وہ زبانیں جن میں نثر کی کتابیں اور نظم کے دیوان تصنیف کئے جا سکتے ہیں۔ اور جو طبعِ سلیم اور ذہنِ مستقیم کو پسند آتی ہیں تین ہیں۔

۱۔ **سَہَنْسکرت**۔ وہ ہر طرح کے علوم و فنون کی کتابیں زیادہ تر اس زبان میں تصنیف کرتے ہیں۔ ان کے اعتقاد میں وہ عالمِ علوی کی زبان ہے اور وہ اس کو "آکاس بانی" اور "دیو بانی" کہتے ہیں، یعنی آسمان والوں کی زبان اور دیوتاؤں کی زبان جو کہ آسمانی اور علوی ہیں۔

۲۔ **پراکرت** ۔ بادشاہوں، وزیروں اور بڑے بڑے لوگوں کی مدح زیادہ تر اس زبان میں لکھتے ہیں۔ وہ عالمِ سفلی کی یعنی اُس عالم کی زبان ہے جو زمین کے نیچے ہے اور اُس کو "پاتال بانی" اور "ناگ بانی" بھی کہتے ہیں، یعنی اسفل السافلین کے رہنے والوں اور سانپوں کی زبان جو کہ زمینی اور سفلی ہیں۔ یہ زبان مرکب ہے سہنسکرت سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا اور بھاکھا سے جس کا ذکر اس کے بعد ہوگا۔

۳۔ **بھاکھا**۔ رنگین اشعار اور عاشق و معشوق کا بیان زیادہ تر اس زبان میں کرتے ہیں۔ یہ اُس عالم کی زبان ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ بھاکھا کا اطلاق عموماً سہنسکرت اور پراکرت کے سوا اور کل زبانوں پر ہوتا ہے اور خصوصاً برج والوں کی زبان پر۔ "برج"، ہندوستان کی ایک سرزمین کا نام ہے۔ اصل اس کی متھرا ہے (جو ایک مشہور و معروف مقام کا نام ہے)۔ اور متھرا کے گرد چار کوس تک برج کی حد ہے۔ برج والوں کی زبان سب زبانوں سے زیادہ فصیح ہے۔ مشہور دریاؤں گنگا اور جمنا کے دوآب میں جو خطہ

ۓ مصنف دکنی نے اس لفظ کو اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے: "رکھا کم سہنسکرت گے اس میں بول۔" (مثنوی قصۂ بے نظیر)

واقع ہے جیسے چَندہ وَاڑ وغیرہ وہ فصاحت کے لئے مشہور ہے۔ چَندہ وار ایک مشہور و معروف مقام کا نام ہے۔ چونکہ یہ زبان رنگین شیریں عبارتوں اور عاشق و معشوق کے بیان پر مشتمل ہے اور شاعروں اور طبیعت داروں میں زیادہ تر رائج اور مستعمل ہے اس بنا پر اُس کے قواعد کلیہ بنائے گئے ہیں اور اس چیز کا اختراع کرنے والا یہ نحیف ہے۔

شَبَد کا بیان

شبد سنسکرت زبان میں کلمے کو کہتے ہیں۔ بھاکھا والے اِس لفظ کو سین مہملہ سے بولتے ہیں[1]۔ ہمارے نحویوں کی اصطلاح میں کلمہ وہ ہے جو کسی معنی کو ادا کرنے کے لئے بولا جائے۔ اہلِ ہند کی اصطلاح میں اُس کی تین قسمیں ہیں، سَنْیا وَن، کَرتَب اور کَرتا۔

سَنْیَا وَن اُس کلمے کو کہتے ہیں جو تینوں زمانوں یعنی ماضی، مستقبل اور حال میں سے کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اُس کی دو قسمیں ہیں:—

ایک وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی دوسرے لفظ کا محتاج نہ ہو۔ مثلاً رَام جو اُن کے مشہور دیوتاؤں میں سے ایک کا نام ہے۔ یا جَل جس کے معنی ہیں پانی۔ اِس قسم کے کلموں کو سَنْیاوَن کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں اُن کو اِسم کہتے ہیں۔

دوسرے وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی لفظ کا محتاج ہو۔ مثلاً پَر عربی کے علیٰ اور فارسی کے بَر کے معنی ہیں۔ اس قسم کے کلموں کو پَرَت کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں اُن کو حرف کہتے ہیں۔

کَرَتَب فعل کو کہتے ہیں، اور فعل کے معنی ہیں کچھ کرنا۔ کرتب وہ کلمہ ہے جو تینوں زمانوں یعنی ماضی، حال اور استقبال میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہے۔ اِن تینوں زمانوں کو ترِکال کہتے ہیں۔ کرتب کی پانچ قسمیں ہیں، بھوت، برتمان، بھوِکھ، کِرتیا، کِرت۔

بھوت کا بیان

بھوت فعل ماضی کو کہتے ہیں۔ اور فعل ماضی وہ ہے جو گزشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ فعل ماضی لازمی چار صیغوں میں آتا ہے، اور فعل لازمی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام ہو جائے اور آگے بڑھ کر مفعول تک نہ پہنچے۔ وہ چار صیغے یہ ہیں:۔

۱۔ آیو، یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مذکر متکلم میں مشترک ہے۔

۲۔ آئے، یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مذکر حاضر اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے۔

۳۔ آئی، یہ صیغہ واحد مؤنث غائب، واحد مؤنث حاضر اور واحد مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔

۴۔ آئیں، یہ صیغہ جمع مؤنث غائب، جمع مؤنث حاضر اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔

فعل متعدی بھی اسی طرح چار صیغوں میں آتا ہے۔ اور فعل متعدی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام نہ ہو بلکہ آگے بڑھ کر مفعول تک پہنچے۔ فعل متعدی کے صیغے مفعول کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی اگر مفعول مذکر ہوتا ہے تو فعل مذکر لاتے ہیں اور اگر مفعول مؤنث ہوتا ہے تو فعل مؤنث لاتے ہیں۔ مثلاً اگر مفعول واحد مذکر ہو تو کہیں گے ماریو اور اگر واحد مؤنث ہو تو کہیں گے ماری اور اسی قیاس پر باقی صیغوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔

---

[1] یعنی بھاکھا والے شَبَد کو سَبَد کہتے ہیں۔

بَرتمان کا بیان

بَرتمان فعل حالی کو کہتے ہیں۔ اور فعل حال وہ ہے جو گزشتہ اور آئندہ زمانوں کے درمیان میں ہو۔ فعل حال چار صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کَرَت ہے — یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مؤنث غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
۲۔ کَرَت ہیں — یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مؤنث غائب، جمع مذکر متکلم اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔
۳۔ کَرَت ہو — یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
۴۔ کَرَت ہوں — یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔

ان چاروں صیغوں میں لفظ کَرَت کی ت کو اگر مضموم پڑھیں تو مذکر کا صیغہ ہو جاتا ہے اور اگر مکسور پڑھیں تو مؤنث کا صیغہ ہو جاتا ہے۔

بھوکھ کا بیان

بھوکھ فعل مستقبل کو کہتے ہیں۔ اور فعل مستقبل وہ ہے جو آئندہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے فعل مستقبل آٹھ صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کَرَے گو۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب اور واحد مذکر حاضر میں مشترک ہے۔
۲۔ کَریں گے۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے۔
۳۔ کَروگے۔ یہ جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔
۴۔ کَروں گو۔ یہ واحد مذکر متکلم کا صیغہ ہے۔
۵۔ کَروں گی۔ یہ واحد مؤنث متکلم کا صیغہ ہے۔
۶۔ کَرَے گی۔ یہ صیغہ واحد مؤنث غائب اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
۷۔ کَریں گی۔ یہ صیغہ جمع مؤنث غائب اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔
۸۔ کَروگی۔ یہ جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔

کِرِیا کا بیان

کِرِیا چار طرح پر ہے:۔

۱۔ سَمَن بھاو — یہ اثبات فعل ماضی ہے۔ مثلاً آیو۔
۲۔ اَسَمَن بھاو — یہ نفی فعل ماضی ہے۔ مثلاً نا آیو۔
۳۔ بھاو — یہ اثبات فعل حالی و فعل مستقبل ہے۔ مثلاً کَرَت ہے، کَرَے گو۔
۴۔ اَن بھاو — یہ نفی فعل حالی و فعل مستقبل ہے۔

نفی اور نہی کے لئے نون مفتوح (نہ) یا لفظ نا کلمے کے شروع میں لگا دیتے ہیں۔

کرَم کا بیان

کرَم مفعول کو کہتے ہیں۔ اور مفعول وہ ہے کہ فعل اُس پر واقع ہو۔ مفعول کے آخر میں ہ لاتے ہیں۔ مثلاً ہَنیبو رام راونہ۔ یعنی رام نے راون کو مارا۔ اور کبھی مفعول کو فاعل سے پہلے لے آتے ہیں۔ مثلاً ہَنیبو راونہ رام۔ اور کبھی ہ کو جو ضمیر مفعول ہے لفظ کے آخر سے حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہَنیبو رام راون۔ اس محل پر فاعل کو مفعول سے پہلے لانا بہتر ہے۔ ورنہ قرینے اور قیاس پر نظر کر کے معنی نکال لیتے ہیں۔

کرتا کا بیان

کرتا فاعل کو کہتے ہیں۔ اور فاعل فعل کرنے والا ہے۔ اُس کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ سُواد میں۔ وہ فاعل جو خود کام کرے۔ مثلاً کاجی یعنی کام کرنے والا۔

۲۔ پَراد میں۔ وہ فاعل جو کسی دوسرے کو کوئی فعل کرنے کا حکم دے۔ خواہ امر کے ساتھ ہو خواہ نہی کے ساتھ۔ اور امر کسی کو کوئی کام کرنے کا حکم دینا ہے اور نہی کسی کو کسی کام سے روکنا ہے۔ امر حاضر تین صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کرُ —— یہ امر واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔

۲۔ کریہ —— یہ امر واحد مونث حاضر کا صیغہ ہے۔

۳۔ کرَہُ —— یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔

امر غائب بھی تین صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کرئے —— یہ صیغہ واحد غائب مذکر اور واحد غائب مؤنث میں مشترک ہے۔

۲۔ کریں —— یہ صیغہ جمع غائب، مذکر، جمع غائب مؤنث اور جمع متکلم میں مشترک ہے۔

۳۔ کرَوں —— یہ امر واحد متکلم کا صیغہ ہے۔

نہی حاضر و غائب کے بھی یہی امر حاضر و غائب کے چھ صیغے ہیں جن کے شروع میں نہ یا نا بڑھا دیتے ہیں۔

پُرلنگ کا بیان

پُرلنگ مذکر کو کہتے ہیں۔ اور مذکر کے معنی ہیں مرد یا نر۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ وہ جو عَلَم ہو اور اُس کے مقابل میں کوئی مونث ہو۔ مثلاً رام اور کانھ، جو مشہور دیوتاؤں کے نام ہیں۔ اور عَلَم وہ ہے جو کسی معین شخص کا نام ہو۔

۲۔ وہ کہ اسم مذکر غیر علم کے آخر میں الف لگا دیں۔ مثلاً مرگا کہ لفظ مرگ (ہرن) پہ الف بڑھا دیا گیا ہے۔

اَستری لِنگ کا بیان

اَستری لِنگ مونث کو کہتے ہیں۔ اور مونث کے معنی ہیں عورت یا مادہ۔ اُس کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ وہ جو عَلَم ہو یعنی کسی معین شخص کا نام ہو۔ مثلاً سیتا اور رادھا، جو دو مشہور عورتوں کے نام ہیں۔

۲ - وہ جو عَلَم نہ ہو - اُس کی بھی دو قسمیں ہیں :-

(۱) - وہ جس کا مقابل کوئی مذکر اور نہ ہو - مثلاً تُرنگنی یا تُرنگی (گھوڑی)[1] اور ہستنی (ہتھنی) -

(۲) - وہ جس کے مقابل مذکر اور نہ نہ ہو - مثلاً بیار (ہوا) اور آگن (آگ) -

یہ آخری قسم مونث سماعی ہے اور اس کا استعمال فقط محاورے کے سننے سے تعلق رکھتا ہے -

جب پُرِلنگ کو استری لنگ یعنی مذکر غیر علم کو مونث کر دینا چاہتے ہیں تو مذکر اسم کے آخر میں چند حرف بڑھا دیتے ہیں - وہ حرف یہ ہیں :-

۱ - الف - مثلاً بڈھو (بڈھا) سے بڈھا (بڑھیا) -

۲ - ی - مثلاً دیو سے دیوی -

۳ - آنی - مثلاً رُدر سے رُدرانی یعنی رُدر کی بیوی - رُدر عموماً دیوتا کے معنی میں آتا ہے اور خصوصاً مہادیو کو کہتے ہیں -

۴ - نی - مثلاً تُرنگ سے تُرنگنی - کبھی آخری ی کو گرا دیتے ہیں اور صرف نون باقی رہ جاتا ہے - مثلاً تُرنگن -

نپنسک لنگ کا بیان

نپنسک لنگ - خنثیٰ کو کہتے ہیں یعنی وہ جو حقیقت میں نہ مرد ہو نہ عورت - محاورے میں ایسے گنتی کے چند اسم ہیں - ان سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا - ان میں سے ایک لفظ کُنڈل ہے ، جس کے معنی ہیں حلقہ - اس جنس کا استعمال سنسکرت کے محاورے سے مخصوص ہے - بھاکھا میں مستعمل نہیں ہے -

بہُبچن کا بیان

بہُبچن جمع کو کہتے ہیں اور واحد سے زیادہ کو جمع خیال کرتے ہیں - جمع بنانے کے لیے واحد لفظ کے آخر میں حرف نون لگا دیتے ہیں - مثلاً کُلٹا (بدکار عورت) سے کُلٹان - اور نون سے پہلے کا حرف اگر ساکن یا موقوف ہوتا ہے تو اس پر زبر لگا دیتے ہیں جیسے کرَ (ہاتھ) سے کرَن اور پگ (پاؤں) سے پگن - اور جب لفظ کے آخر میں و ساکن یا ی ساکن ہو تو کبھی اُس واو یا یے کو اپنے حال پر ساکن رہنے دیتے ہیں اور کبھی اُس پر زبر کی حرکت لگا دیتے ہیں - مثلاً سکھی سے سکھین اور بھنوں سے بھنوَن اور کبھی الف نون سے جمع بناتے ہیں مثلاً سکھی سے سکھیاں -

اسم اشارہ کا بیان

اسم اشارہ وہ اسم ہے جس سے کسی کی طرف اشارہ کریں - اسمائے اشارہ سات ہیں :-

۱ - وا - یہ واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی وہ

۲ - تا - یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی وہ

۳ - یا - یہ واحد حاضر کے اشارے کے لیے ہے یعنی یہ

۴ - جا - یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی جو

۵ - اُن - یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے -

---

[1] ایک نسخے میں ہتھنی ہے -

۶۔ اِن ۔ یہ جمع حاضر کے اشارے کے لیے ہے۔
۷۔ جِن ۔ یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے۔
یہ ساتوں اسمائے اشارہ مذکر اور مونث میں مشترک ہیں۔

پَدبِرِتْ کا بیان

پَدبِرِتْ کلام کو کہتے ہیں اور کلام دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ مثلاً رام آیو۔

سَمبَنْدھ کا بیان

سَمبَنْدھ ترکیب اضافی کو کہتے ہیں۔ اور ترکیب اضافی وہ ترکیب ہے جس میں کلمۂ اوّل کو کلمۂ ثانی سے نسبت دیں۔ اصطلاح عرب میں کلمۂ اوّل کو مضاف اور کلمۂ ثانی کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ اہلِ ہند کی ترکیب اضافی تین کلموں سے مرکب ہوتی ہے مثلاً پوُت رام کو یعنی پسرِ رام۔ اس میں کلمۂ پوُت مضاف ہے اور کلمۂ رام مضاف الیہ ہے اور لفظ کو جو آخر میں ہے علامت نسبت ہے جو عربی کی مثال غلامٌ لِزَید میں لام مکسور کی جگہ اور فارسی کی مثال غلامِ زید میں مضاف کے آخری کسرے کی جگہ آیا ہے۔ ہندی میں جب مضاف الیہ کو مضاف پر مقدم کرتے ہیں تو لفظ کو جو علامتِ نسبت ہے درمیان میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں رام کو پوت۔ اس محل پر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علامتِ نسبت کو حذف کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں رام پوت۔

اُن حرفوں اور کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع اور درمیان میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) اَ (الف مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے اور اس کو اصطلاح میں ناس یعنی نفی کہتے ہیں۔ مثلاً اجان یعنی نہ جاننے والا، نادان۔

(۲) الف ۔ اسموں کے درمیان میں آکر تواتر اور توالی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً چلاچل یعنی رو دارو۔ یہ الف فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۳) بِ (بائے مکسور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بِکَل یعنی بے قرار اور بے آرام، کیونکہ کَل کے معنی ہیں قرار اور آرام۔

(۴) سَ (سین مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر معیت اور ہمراہی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سَجَل یعنی سیراب اور شاداب، کیونکہ جل کے معنی ہیں پانی۔ یہ سَ کبھی لیاقت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سَپوُت یعنی قابل اور رشید بیٹا۔ اور یہ حرف اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سُنا گیا۔

(۵) سُ (سین مضموم) اسم کے شروع میں آکر خوب اور اچھا کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سُباس یعنی اچھی بُو والا، خوشبودار۔

(۶) کَ (کاف مفتوح)۔ اسم کے اوّل میں آکر عدم لیاقت اور ناقابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کَپوُت یعنی ناقابل یا نالائق بیٹا۔ اور یہ حرف اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سُنا گیا۔

(۷) کُ (کاف مضموم)۔ اسم کے شروع میں آکر بد اور بُرا کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کُرنگ یعنی بد رنگ، بُرے رنگ والا۔

(۸) نِ (نون مکسور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً نِلَجّ یعنی بے شرم، بے حیا، کیونکہ لَجّ اور لاج کے معنی ہیں شرم و حیا۔

اُن حرفوں کا بیان جو لفظوں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) الف ۔ اسم کے آخر میں آکر وصفیت اور فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کَبِتا یعنی شاعر اور موصوف بہ صفت شاعری، کیونکہ کَبِت کے معنی ہیں شعر۔ دیوا یعنی دینے والا اور موصوف بہ صفت دہندگی۔ کبھی الف تانیث کے لیے آتا ہے مثلاً بِرَدھا یعنی بوڑھی عورت، کیونکہ بِرَدھ بوڑھے مرد کو کہتے ہیں، جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے۔ اور کبھی تانیث کے ساتھ وصفیت اور فاعلیت کے معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً گَرَبا یعنی غرور کرنے والی اور موصوف بہ صفت غرور، کیونکہ گَرَب کے معنی ہیں غرور۔ اور کبھی الف تذکیر اور نری کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ہَرنا یعنی نر ہرن۔ اسم علم کے آخر میں الف ندا کا فائدہ دیتا ہے۔ اور ندا کسی کو پکارنا ہے۔ مثلاً راما یعنی اے رام۔ الف ندائیہ فارسی اور عربی میں بھی مستعمل ہے۔

(۲) پ ۔ اسم کے آخر میں آکر صاحبی اور خداوندی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بھوپ یعنی صاحب و خداوند زمین، کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔

(۳) ت ۔ اسم کے آخر میں آکر مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً گَنَت یعنی گننا شمار کرنا۔

(۴) ٹ ۔ اسم کے آخر میں آکر فاعلیت کے معنی دیتا ہے مثلاً کھبوٹ یعنی ناؤ کھیلنے والا۔ اس ٹ کے آخر میں واو معروف بھی لگا دیتے ہیں مثلاً کھبوٹو۔

(۵) ج ۔ اسم کے آخر میں آکر پیدا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بارَج یعنی پانی سے پیدا ہونے والا۔ اِس لفظ کا اطلاق کنول کے پھول پر اور ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو پانی سے پیدا ہو، کیونکہ بار کے معنی ہیں پانی۔

(۶) دِ (دال مکسورہ)۔ اسم کے آخر میں آکر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بارَدِ یعنی بادل، کیونکہ بار کے معنی پانی ہیں جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے۔

(۷) دھ ۔ یہ بھی اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً اَنبُدھ یعنی سمندر، کیونکہ اَنب کے معنی ہیں پانی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں دِ بادل کے معنی کا اور دھ سمندر کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔

(۸) ک ۔ اسم کے آخر میں فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سیوک یعنی خادم، کیونکہ سیو اور سیوا کے معنی ہیں خدمت۔ یہ کاف کبھی مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بَیدَک یعنی طبابت۔

(۹) گ ۔ اسم کے آخر میں آکر راہ، روش اور رفتار کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً اُرَگ یعنی سینے سے راہ چلنے والا، کیونکہ اُر کے معنی ہیں سینہ۔ اس لفظ سے سانپ مراد لیتے ہیں۔

(۱۰) ن ۔ اسم کے آخر میں مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً چَلَن یعنی رفتن، رواج، کیونکہ چل اور چال کے معنی ہیں رفتار اور طریقہ۔ حرف نون کبھی فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً موہن یعنی موہنے والا، فریفتہ کرنے والا، کیونکہ موہ کے معنی ہیں فریفتگی۔ اور کبھی جمع کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کَرَن جو کر کی جمع ہے اور کر کے معنی ہیں ہاتھ۔ اور کبھی تانیث کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تُرنگن یعنی گھوڑی، کیونکہ تُرنگ کے معنی ہیں گھوڑا، جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے۔

(۱۱) وٗ (واو معروف)۔ اسم کے آخر میں آکر فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پاہَرُو یعنی پہرا دینے والا، پاسبان، کیونکہ پاہرہ اور پہرہ کے معنی ہیں پاس بانی اور نگہبانی۔

(۱۲) ہٖ (ہائے مکسورہ)۔ اسم کے آخر میں آکر مفعول بہٖ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً وا آہٖ یعنی اُس کو، کیونکہ وا کے معنی ہیں وہ۔

(۱۳) یٖ ۔ (یائے معروف)۔ اسم کے آخر میں آکر نسبت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً اجمیری یعنی منسوب بہ اجمیر۔ اجمیر ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ اور یہ یٖ فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ کبھی یٖ صفت اور فاعلیت کا فائدہ دیتی ہے۔ مثلاً گربی یعنی غرور کی صفت سے موصوف، غرور کرنے والا، کیونکہ گرَب کے معنی ہیں غرور۔ اور کبھی یٖ تانیث کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دیوری یعنی دیور کی عورت، جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

اَ ۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر ندا کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں:۔

(۱) ہے — مثلاً ہے رام۔

(۲) اَہے — مثلاً اَہے رام۔

(۳) ہو — مثلاً ہو رام۔

(۴) اَہو — مثلاً اَہو رام۔

(۵) اِے ۔ مثلاً اِے رام۔ یہ کلمہ فارسی میں بھی مستعمل ہے۔

(۶) اِے ہو، جو اِے اور ہو سے مرکب ہے۔ مثلاً اے ہو رام۔

(۷) اَرے ۔ مثلاً ارے رام۔ اِس کلمے کو مونث کی ندا میں یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اَری سکھی۔ اور سکھی کے معنی ہیں نزن مصاحبہ۔

(۸) رے ۔ بغیر الف اول کے۔ مثلاً رے رام۔ اِس کلمے کو بھی ندائے مونث میں یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً ری سکھی۔

(۹) اِے رے، جو اِے اور رے سے مرکب ہے۔ مثلاً اے رے رام۔ ندائے مونث کے لیے اس کے دوسرے جزو رے کو یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اِے ری سکھی۔

(۱۰) اَرے اے، جو ارے اور اے سے مرکب ہے۔ مثلاً ارے اے رام۔ ندائے مونث کے لیے اس کے پہلے جزو اَرے کو یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اَری اِے سکھی۔

بَ ۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ دو کلمے ہیں:۔

(۱) نِر ۔ مثلاً نِربھو یعنی بے خوف، بے ترس، کیونکہ بھو کے معنی ہیں خوف اور ترس۔

(۲) اَن ۔ مثلاً اَن رَس یعنی بے مزہ، بے ذوق، کیونکہ رَس کے معنی ہیں مزہ اور ذوق۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

اَ ۔ وہ کلمے جو اسم کے آخر میں آکر صاحبی اور خداوندی کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں:۔

(۱) وَنت ۔ مثلاً رُوپ ونت یعنی صاحبِ حسن وجمال، کیونکہ رُوپ کے معنی ہیں حسن وجمال۔ کبھی مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں الف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں رُوپ ونتا اور مونث کے لیے یائے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں رُوپ ونتی۔

(۲) کار ۔ مثلاً گُن کار یعنی صاحبِ علم وہنر، کیونکہ گُن کے معنی ہیں علم وہنر۔

(۳) پال ۔ مثلاً بھوپال یعنی صاحبِ زمین وملک۔ بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ ملک پر اس لفظ کا اطلاق کرتے ہیں کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔

(۴) پت ۔ مثلاً مہی پت یعنی صاحب وخداوند زمین اور صاحبِ مملکت۔ اس لفظ کا اطلاق بھی بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ مملکت پر کرتے ہیں، کیونکہ مہی اور مَہِ زمین کو کہتے ہیں۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب زمین، ملک، دُنیا اور مرد کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں پت کا لفظ آتا ہے تو وہ بادشاہ کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً مہی پت، دیس پت، جگت پت، نرپت۔ کلمۂ کنت بھی اِن اسموں کے آخر میں اِسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً مہی کنت۔ کلمۂ پت۔ جب تارہ اور رات کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں آتا ہے تو چاند کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تارہ پت نِگھشت پت اور نِس پت۔ اور کلمۂ پت جب ندی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آتا ہے تو دریا کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ندی پت۔

(۵) اِیس ۔ جب اس کلمے کو کسی دوسرے کلمے سے ملاتے ہیں تو لکھنے میں الف کو حذف کر دیتے ہیں، کیونکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس کلمے کے شروع میں الف ہوتا ہے جب اُس کو کسی دوسرے کلمے سے وصل کرتے ہیں تو الف کو حالت تحریر میں حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً مہیس یعنی صاحب وخداوندِ زمین، کیونکہ مہی اور مَہ کے معنی ہیں زمین جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس کلمے کو بھی بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ ملک پر اطلاق کرتے ہیں۔

(۶) اِیسر ۔ مثلاً کابی سر یعنی صاحب وخداوندِ شعر، کیونکہ کاب کے معنی ہیں شعر۔ سہنسکرت میں لفظ اِیسر کو شین کے ساتھ بولتے ہیں۔

(۷) اِند ۔ مثلاً نرِند۔ یعنی صاحب وخداوندِ مرداں، کیونکہ نر کے معنی ہیں مرد۔

(۸) راج ۔ مثلاً کَب راج یعنی مَلِکُ الشعرا، کیونکہ کَب کے معنی ہیں شاعر۔

(۹) اَیت ۔ مثلاً ڈھلَیت یعنی صاحبِ سپر، کیونکہ ڈھال سپر کو کہتے ہیں۔

(۱۰) اَوَت ۔ مثلاً لچھماوَت یعنی دولت والی عورت، کیونکہ لچھمی کے معنی ہیں دولت۔ اوت کے آخر میں یائے معروف بھی لاتے ہیں۔ مثلاً لچھماوتی۔ اور یہ کلمہ کنول کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پدمنی کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پدماوتی۔

ب ۔ وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر فاعلیت کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ پانچ کلمے ہیں:-

(۱) اَیّا (ی کی تشدید کے ساتھ)۔ مثلاً کھِلَیّا یعنی کھیلنے والا۔

(۲) وار ۔ مثلاً کھِلوار یعنی کھیلنے والا۔

(۳) آر ۔ مثلاً کھِلار یعنی کھیلنے والا۔ اِس کے آخر میں یائے معروف بھی لاتے ہیں مثلاً کھلاری۔

(۴) آک ۔ مثلاً پیراک یعنی پیرنے والا۔

(۵) او ۔ مثلاً بٹاؤ یعنی راستہ چلنے والا اور مسافر۔

ج - وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مصدری معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ آٹھ کلمے ہیں :-

(۱) بَو — مثلاً بڑبو یعنی بولنا۔

(۲) آئی — مثلاً تَرُنائی یعنی جوانی، کیونکہ تَرُن کے معنی ہیں جوان۔

(۳) آپو — مثلاً مُٹاپو یعنی فربہی، کیونکہ موٹا کے معنی ہیں فربہ۔ روزمرّہ کی بول چال میں اِس لفظ کے آخر والے واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں مُٹاپا۔

(۴) پَن - مثلاً بال پَن یعنی بچپن، طفولیت - پَن کے آخر میں واوِ مجہول اور نون غنّہ بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں بال پَنوں۔ روزمرّہ کی بات چیت میں واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں بال پَناں۔

(۵) نَوں - مثلاً آونوں یعنی آنا۔ روزمرّہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آوناں۔

(۶) پَت - مثلاً چِکَن پَت یعنی رعنائی، زیبائی اور خود نمائی۔

(۷) آپ - مثلاً مِلاپ یعنی مِلنا، ملاقات کرنا۔

(۸) آو - مثلاً بناو یعنی بنانا، آراستہ کرنا۔

د - وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر وصفیت کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں :-

(۱) تائی - مثلاً سِیامتائی یعنی سیاہی، کیونکہ سِیام کے معنی ہیں سیاہ۔ اس کلمے کو اس کے دوسرے جزو "ئی" کے بغیر بھی استعمال کرتے ہیں جیسے سِیامتا۔

(۲) آٹ - مثلاً چِکناٹ یعنی دُہنیت اور چکنے ہونے کی صفت۔

(۳) آوٹ - مثلاً مِہراوٹ یعنی زنانہ پن، کیونکہ مِہری کے معنی ہیں عورت۔

(۴) آس - مثلاً مِٹھاس یعنی میٹھے ہونے کی صفت۔

(۵) ایل - مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مجہول لگاتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلو یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف مرد۔ روزمرّہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلا۔ مونث کے لیے یاے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلی یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف عورت۔

(۶) سار - مثلاً مِلنسار یعنی ملاقات یا میل جول کی صفت سے موصوف۔

(۷) کا - یہ لفظ مونث کے لیے مخصوص ہے۔ مثلاً اُبھسارکا یعنی فسق و بدکاری کی صفت سے موصوف عورت، کیونکہ اُبھسار کے معنی ہیں فسق و بدکاری۔

(۸) آبوں - مثلاً ڈِھٹابوں یعنی بے حیائی اور بے شرمی کی صفت۔

(۹) اُول - مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مجہول لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں مَنجھولو یعنی منجھلا ہونے کی صفت سے موصوف مرد۔ روزمرہ کی بات چیت میں واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں منجھولا۔ مونث کے لئے یاے معروف لگاتے ہیں اور کہتے ہیں منجھولی۔

(۱۰) اُوہاں - مثلاً بھگوہاں یعنی نیم رنگ سُرخی کی صفت سے موصوف مرد، کیونکہ بھگوا نیم رنگ سرخ کو کہتے ہیں۔ مونث کے لیے اس لفظ میں الف کی جگہ یاے معروف لاتے ہیں مثلاً بھگوہیں یعنی مذکورہ صفت سے موصوف عورت۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر تصغیر کا فائدہ دیتے ہیں

عربی کی اصطلاح میں تصغیر کسی کو چھوٹا اور حقیر کرنا ہے ۔ یہ کلمے چار ہیں :-

۱۔ ڑا ۔ مثلاً لنگر سے لنگڑا اور لنگر کے معنی ہیں شوخ ۔ مونث کی تصغیر کے لیے ڑا کی جگہ یا لاتے ہیں۔ مثلاً گاگر سے گگریا اور گاگر کے معنی ہیں گھڑا ۔ کلمہ یا مذکر کے لیے نسبت کا فائدہ دیتا ہے ۔ مثلاً کنوجیا یعنی کنوج کی طرف منسوب مرد ۔ کنوج ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے ۔

۲۔ ڑا ۔ مثلاً مینہ سے مینھڑا اور مینہ کے معنی ہیں بارش ۔

۳۔ اَوٹا ۔ مثلاً ڈھوٹا سے ڈھٹوٹا ۔ اور ڈھوٹا کے معنی ہیں لڑکا ۔

۴۔ اوٹ ۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں واو مجہول لاتے ہیں اور کہتے ہیں کلوٹ اور کبھی اس کلمے میں واو معروف کی جگہ واو مجہول بھی لاتے ہیں مثلاً مجبرولو یعنی چھوٹی گٹھری ۔ ان دونوں صورتوں میں روزمرہ کی بول چال میں آخری واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً کلوٹا اور مجبروٹا ۔ اور مونث کے لیے الف کی جگہ یائے معروف لگاتے ۔ مثلاً کلوٹی اور مجبروٹی ۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر وارندگی کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

(۱) ۔ دھر ۔ مثلاً گردھر یعنی دارندۂ کوہ ۔ گردھر کانھ کا نام ہے ، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ کانھ نے ایک وقت پہاڑ کو ہاتھ پر لے لیا تھا ۔ اس وقت سے اُن کا نام گردھر ہو گیا ۔ یہ کلمہ زمین کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پہاڑ کے معنی دیتا ہے ۔ مثلاً دھرادھر یعنی دارندۂ کوہ ، کیونکہ دھرا کے معنی ہیں زمین ۔ اور امرت یعنی آب حیات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں چاند کے معنی دیتا ہے ۔ مثلاً سُدھادھر ۔ اور چاند کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں مہادیو کے معنی دیتا ہے مثلاً سسِ دھر ۔

(۲) دھاری ۔ مثلاً جٹا دھاری یعنی جٹا رکھنے والا ۔ اور جٹا کے معنی ہیں سر کے بال جو آپس میں چپک کر ایک ہو گئے ہوں ۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دہندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

(۱) ۔ دائی ۔ مثلاً دکھ دائی یعنی رنج دینے والا ۔

(۲) ۔ دائک ۔ مثلاً سکھ دائک یعنی آرام دینے والا ۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر کنندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

(۱) ۔ کر ۔ مثلاً دن کر یعنی دن کرنے والا ۔ اِس کا اطلاق آفتاب پر کرتے ہیں ۔

(۲) کرتا ۔ مثلاً گن کرتا یعنی فائدہ کرنے والا ۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر لوٹ لینا ، چھین لینا ، لے بھاگنا کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

(۱) ۔ ہر ۔ مثلاً من ہر یعنی دلربا دل لے لینے والا ۔ اس کلمے کے آخر میں نون بھی لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں من ہرن ۔ اور مونث کے لیے

نون کے بعد یائے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں مَن ہَرنی یعنی دلربا عورت۔

(۲) ۔ ہَرتا۔ مثلاً بائے ہَرتا یعنی ہوا کا دور کرنے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) ہار۔ ایک کلمہ ہے جو کسی اسم کے آخر میں آکر لیاقت اور سزاواری کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً ہَون ہار یعنی ہونے کے لائق، ہَنُدنی۔

(۲) آوٹ۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر آلے کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کَسَوٹ یعنی وہ چیز جس سے کسانی کی جائے۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں کبھی الف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کچھوٹا یعنی وہ چیز جس سے ستر عورت کیا جائے یعنی آگا پیچھا چھپایا جائے کیونکہ کاچھ کے معنی ہیں عورت یعنی جسم کا وہ حصّہ جس کو چھپا رہنا چاہیئے۔ اور مونث کے لیے اس کلمے کے آخر میں یائے معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً کسوٹی یعنی وہ چیز جس سے سونا چاندی پرکھتے ہیں، کیونکہ کس کے معنی ہیں پرکھنا۔ کبھی یہ کلمہ ظرفیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کجروٹی یعنی وہ چیز جس میں کاجل یا سُرمہ رکھتے ہیں۔

(۳) بن۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بے اور بغیر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً لال بن یعنی بے معشوق اور لال کے معنی ہیں معشوق۔ اِس کلمے کے آخر میں الف نون بھی بڑھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں لال بناں۔ اِس کلمے کو کبھی اسم کے پہلے بھی لاتے ہیں اور کہتے ہیں بن لال اور بناں لال۔

(۴) سالا۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دھرم سالا، یعنی عبادت، خیرات، دینداری، اور خدا پرستی کی جگہ۔ اِس کلمے کو کبھی بغیر آخری الف کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ٹکسال یعنی سکّے بنانے اور سونے چاندی کے پرکھنے کی جگہ۔

(۵) آہنتا۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بُو کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً مچھلاہند یعنی مچھلی کی سی تیز اور بُری بُو۔

(۶) چَر۔ ایک کلمہ ہے جو درخت کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر ہرن اور بندر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً رُکھ چر۔ اور جنگل، بیابان کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر یہی معنی اور جنگلی بیابانی آدمی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بن چر۔ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر ابر و باراں کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً جل چر اور رات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر بھوت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً نس چر۔

(۷) ۔ مَیّ۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر کثرت کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً جل مَیّ یعنی وہ جگہ جہاں کئی دریا بہتے ہوں یا ایسا دریا جس میں بہت پانی ہو، کیونکہ جل کے معنی ہیں پانی۔

(۸) ۔ انش۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر حصّہ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دسواں انش یعنی دسواں حصّہ۔

(۹) ۔ آوتی۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر مقدار اور اندازے کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً سمجھوتی یعنی سمجھنے کی مقدار اور اندازہ۔

آزاد کی سیاحت

(سیرِ ایران)

(آغا محمد اشرف)

غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے پورے ۲۸ سال بعد ۱۸۸۵ء میں، مولوی محمد حسین آزاد نے ایران کا سفر شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ادبی دنیا پہ آبِ حیات اور دوسری تصانیف کے ذریعے آزاد کا سکہ بیٹھ چکا تھا چنانچہ خود کہتے ہیں "مئی ۱۸۸۳ء میں پنشن کی مقدار پوری ہو گئی۔ دل برسوں سے آزردہ ہے۔ کہ رخصت لے کر جگہ سے حرکت اور خدا سے برکت لینی چاہیئے"۔

سیاحتِ ایران کا محرک دو جذبوں کو کہا جا سکتا ہے۔ نایاب علمی اور ادبی کتابوں کی تلاش اور بعض فارسی کی کتابیں جو عرصہ سے زیرِ تصنیف تھیں ان کی تکمیل۔ اُس عہد میں معیاری کتابوں کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:-

"ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی۔ کیونکہ نہ اُسے کسی سے مروت تھی نہ کسی قسم کی اُمید۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ بھی نہ ملتی تھی"۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"...... خدا سے التجا کی۔ کہ اگر مجھے وسعت دے تو ایک کتب خانہ نظرگاہِ خاص و عام میں آراستہ کروں۔ اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں۔ کہ کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے"۔

۱۸۸۲ء کی ایک تحریر کے مطابق اس وقت آزاد کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس قلیل رقم میں سے آزاد کتابوں کے لئے کس طرح روپیہ پس انداز کرتے تھے اس کا حال انہی کی زبان سے سنیئے:-

"اس عالم میں میں نے انتظام یہ رکھا کہ جو کچھ خدا دیتا۔ کم اس میں سے خرچ کرتا۔ باقی جمع کرتا۔ خانہ بربادوں کی طرح گذارہ کرتا تھا۔ اور اپنے مبارک ارادے سے خانۂ دل کو روشن کرتا تھا۔ اس اثنا میں کوئی ایسی کتاب جو کم ہاتھ آئے۔ مل جاتی تو لے لیتا۔ کہ ایک دن کام آئے گی"۔

آزاد کو اپنی کم مائگی کا پورا احساس تھا۔ دوسرے رخش عمر تیزرو سے منازلِ حیات طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ انہیں خیال آیا۔ جو کتابیں اس ملک میں نایاب ہیں۔ وہ عرب اور ایران میں ارزاں نہیں ملیں گی۔ اس لئے سفرِ ایران کا ارادہ کیا۔

اپنی تصانیف کی تکمیل کے سلسلے میں سخندانِ فارس اور فارسی کی ایک لغت کے مسودے ان کے سامنے تھے۔ سخندانِ فارس اور فارسی زبان کی لغت اصل میں ایک ہی پروگرام کی دو کڑیاں تھیں۔ سخندانِ فارس میں موضوعِ بحث فلالوجی تھی۔ اور لغت کی ترتیب سے مقصد فارسی روزمرہ کے الفاظ کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا تھا جو پرانی لغات میں نہیں ملتے تھے۔ سخندانِ فارس کا منصوبہ سیاحتِ ایران سے پورا ہو گیا۔ مگر افسوس کہ لغت کے خیال کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ان کے انتقال کے بعد جو کتاب لغتِ آزاد کے نام سے منسوب ہوئی ہے۔ وہ بظاہر اس لغت کا چربہ معلوم ہوتی ہے جس کا نقشہ آزاد کے ذہن نے قائم کیا تھا قندِ پارسی کا مسودہ بھی تیار تھا۔ مگر آزاد اس کی زبان کی صحت روزمرہ محاورے کے مطابق ایران جا کر کرنی چاہتے تھے۔ آموزگارِ پارسی جن مسودات سے بعد میں ترتیب دی گئی ہے۔ یادداشتیں بھی اسی سفر کا نتیجہ تھیں۔

سیاحتِ ایران کی ابتدائی منزلیں

روانگی سے قبل بہت سے ضروری امور تھے۔ کہ جن کا طے کرنا ضروری تھا۔ بقولِ آزاد رخصت کا مقدمہ سب سے زیادہ سنگین تھا۔ غالباً محکمۂ تعلیمات کے ڈائریکٹر ڈاکٹر لائیٹنر جن سے آزاد کی نوک جھونک کچھ عرصہ سے جاری تھی۔ ان کے راستے میں سنگِ گراں ثابت ہو رہے تھے۔ آخر یہ تمام مرحلے بھی طے پا گئے۔ اور ستمبر ۱۸۸۵ء میں خاص گورنمنٹ کی تحریر نے حصولِ رخصت سے آرام دلایا۔

سفر کے اخراجات اور کتابوں کی خرید کے لئے ایک مدت سے آزاد روپیہ پس انداز کر رہے تھے۔ چنانچہ بنک میں دس ہزار روپیہ الگ کیا۔ اور بنک کو ہدایت کی کہ یہ رقم قلم جنوری ۱۸۸۶ء کو لاہور کے مشہور رئیس اور آزاد کے دوست نواب نوازش علی خاں قزلباش کے حوالے کر دے۔ نواب موصوف نے اس کے عوض میں سوداگرانِ ایران کے نام خط تحریر کر دیئے۔

تیسری دقت ان کی اپنی صحت سے متعلق تھی۔ خود لکھتے ہیں:۔

"انہیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے۔ جن میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی۔ جو حقیقت میں بہت بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری تصنیفات میں میرا داہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اور تصنیفات کا قلم ہاتھ سے الٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوشمندوں کو جنون کا شبہ ہوا۔"

اس کے علاوہ چند اور بیماریاں بھی لاحق تھیں۔ چنانچہ خویش و احباب نے ضعیفی، سفر کی صعوبتوں اور دشواریوں کی بنا پر آزاد کا ارادہ ترک کرانا چاہا۔ آپس میں بحث مباحثے ہوئے۔ آزاد علمی ضرورتوں کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ احباب کہتے تھے آپ تنہا کیسے جائیں گے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ کہ انہوں نے اپنے لڑکے آغا محمد ابراہیم کو جو اس وقت سرحد میں ملازم تھے۔ نوکری چھڑا کر لاہور بلوا لیا۔ مگر رخصت ملنے میں دیر لگی۔ ادھر انہیں ایک اور ملازمت مل گئی۔ اس لئے چار و ناچار تنہا سفر پر کمر باندھی۔ دوستوں کو سمجھایا۔ کہ اس سے پہلے (۱۸۶۵ء) بھی تو وسط ایشیا کا تنہا سفر کیا تھا۔ اور وہ بھی کس بے سروسامانی میں کہ پانچ برس تک مفقود الخبر رہا تھا۔ اور سب سے بڑا سبب آزاد کا یہی علمی اور ادبی ضرورتوں کا احساس تھا۔ فرماتے ہیں:۔

"جن ضرورتوں کے لئے میں جاتا ہوں ملک اس کا محتاج ہے۔ اور قوم کو خیال نہیں لیکن ہوگا ایک مدت کے بعد اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کو کر جاؤں۔ خصوصاً فارسی کی جامع اللغات کہ بغیر فارس میں جانے کے اس کی تکمیل اور انجام ممکن نہیں۔"

ایک شخص نے تو ان کے منہ پر یہاں تک کہہ دیا۔ کہ لوگ کہتے ہیں آپ کو جنون ہے۔ بھلا خشکی میں یا جہاز پہ اس کا ظہور ہو۔ اس وقت کیا ہوگا لیکن آزاد کی جوان ہمت نے کسی بات کی پروا نہیں کی۔ اور خدا پر توکل کر کے ۲۴ جنوری ۱۸۸۶ء کو بذریعہ ریل لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ کراچی میں ایک پرانے شاگرد عزیز مولوی محمد الدین ہیڈ ماسٹر سندھ مدرسہ کے ہاں قیام کیا۔ چونکہ ایران جانے والا جہاز ایک دن پہلے روانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے مجبوراً ایک

ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔ اگرچہ طبیعت کے شوق کو یہ ایک ایک دن کئی کئی مہینے کے برابر تھا۔

سفر کا مقصد چونکہ ادبی تھا۔ اس لئے ہر قدم پر کان نئے الفاظ اور نئی آوازوں پہ لگے ہوئے تھے۔ کراچی کے راستے میں سکھر سے کچھ لوگ گاڑی میں سوار ہوئے۔ جب انہوں نے بات چیت کی۔ تو آزاد کے کانوں کو محسوس ہوا کہ ان کی بولی میں بہت سے لفظ فارسی کے ملے ہوئے ہیں۔ اشتیاق نے مجبور کیا۔ کہ اس کی اصل دریافت کی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا۔ کہ یہ مکرانی ہیں۔ وہی مکرانی جن کا ذکر کتابوں میں آزاد نے پڑھا تھا۔ اور جن کے راستے کئی مرتبہ لشکر اسلام ہند میں آیا تھا۔

کراچی سے بوشہر کو روانگی

۱۰ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو عربیہ ڈاک کے جہاز میں ۲۶ روپیہ کرایہ دے کر آزاد سوار ہوئے۔ سفر تیسرے درجے میں کر رہے تھے۔ کیونکہ دس ہزار روپے میں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ کتابوں پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ دوران سفر میں ایک رفیق نے جو دوسرے درجے کے مسافر تھے، اپنا آرام دہ کمرہ اور اس کی آسائشیں دکھائیں۔ مگر آزاد نے یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی۔

"اتنے روپے جمع کرکے کتابیں لو تو ایک خانہ الماری کا آباد ہوتا ہے۔ اس لئے تکلیف مجھے آرام معلوم ہوئی"

کراچی سے بوشہر تک دس روز کا سفر تھا۔ آجکل کے تیز رفتار سٹیمر اسے مشکل سے تین دن میں طے کرتے ہیں۔ جہاز میں دوران سر اور برہمی طبع کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا۔ کہ ان کا مزاج صفراوی تھا۔ مگر شوق سفر کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک دفعہ دوران سفر میں خیال بھی آیا۔ کہ خلل ہائے مذکور کا اثر طبیعت پر ہے یا نہیں۔ لیکن غور کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

جہاز گوادر اور جاسک کے سامنے سے گذرتا . . . پہاڑی سلسلہ کو داہنے ہاتھ پر چھوڑتا مسقط سے بچتا ہوا منزل مقصود کی طرف بڑھتا جا رہا تھا بندر عباس پر جہاز نے لنگر ڈالا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں چند نوجوان لڑکے خربوزے، ناشپاتیاں اور انڈے بیچنے کے لئے آئے۔ آزاد کی توجہ ان اشیاء کی نسبت بیچنے والوں کی زبان پر تھی۔ زبان کے محقق نے فوراً پرکھا۔ کہ سب کی زبان خالص فارسی تھی۔ اور اس سے پتہ لگایا۔ کہ یہاں سے خاک ایران شروع ہوتی ہے۔ ہم سفر مسافروں کے بھی لفظ لفظ پر ان کا دھیان تھا۔ آغا عبدالکریم ایک ایرانی رفیق سفر سے ملاقات ہوئی۔ جو سویز سے بمارہ کراچی کو جا رہے تھے۔ فارسی شاعری کا انہیں شوق تھا۔ عربی بھی بولتے مگر سواحل کی۔ انگریزی بھی بولتے مگر جہازی۔ بہتر دونوں کا بجا ہے۔ کہ دونوں ایک دوسرے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ آخر ۲۱ اکتوبر کو ان کا جہاز بوشہر کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔

بوشہر سے شیراز تک

بوشہر پہنچنے کے بعد آزاد کا پہلا تاثر یہ تھا:

"یہاں سب سے نئی بات یہ معلوم ہوئی۔ کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے تھے، فارسی بولتے تھے۔ جیسے ہزار داستان"

زبان کی تحقیق کرنے والے اور علم زبان کے ماہر خوب جانتے ہیں۔ کہ اس فن کا رسیا ہر ہر قدم پہ ایک نئی بات محسوس کرتا ہے۔ جب کبھی کوئی فقرہ سنتا ہے۔ اس کے کان اسی طرف لگ جاتے ہیں۔ کہ اہل زبان نے اس مطلب کو کیسے ادا کیا۔ محاورے میں یہ بات کیسے آئی۔ آزاد ذہن اور ان کے کان ان تمام کیفیتوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اور سفر کی منزلیں اس شوق میں آسان ہوتی چلی جاتی تھیں۔

آزاد کے مشن کے لحاظ سے بوشہر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں کی زبان سند ہو سکتی تھی۔ نہ اس شہر میں علمی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود کاروان کے انتظار میں آٹھ روز بوشہر ٹھہرنا پڑا۔ آخر ۲۹ اکتوبر کو ایک ایرانی راہوار کرایہ پہ لیا۔ اور شام کو شہر سے نکل کر کاروان میں شامل ہو گئے یہ

آج کل کا سا سفر نہیں تھا۔ کہ موٹریں دن رات سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ آج سے ۶۰۔ ۷۰ سال پہلے شہر پناہ سے نکلتے ہی قزاقوں اور ڈاکوؤں کا خطرہ دامنگیر ہو جاتا تھا۔ اس لئے بغیر قافلے کے ایک قدم نہیں بڑھ سکتے تھے۔

بوشہر سے شیراز تک تقریباً ۱۵۰ میل کی مسافت ہے۔ اس سفر کو آزاد نے ۹ دن میں طے کیا۔

راستے میں پُر ہیبت پہاڑوں اور تنگ گھاٹیوں کو عبور کرتا یہ قافلہ چیونٹی کی سی رفتار سے حرکت کر رہا تھا۔ کبھی کارواں میدان میں دھوپ کی شدت سہتا تھا۔ اور کبھی برف و باراں کا مقابلہ کرتا تھا۔ جہاں کہیں قافلے نے قیام کیا۔ آزاد خور و نوش کا سامان مہیا کرنے کے بعد علماء اور کتابوں کی دھن میں گھر گھر اور مسجد مسجد تلاش کرتے پھرتے تھے۔ کھانے پینے کی طرف سے لاپرواہی کا یہ عالم تھا۔ کہ رات کو ایک جگہ پلاؤ مل گیا اسے کھا لیا جو باقی بچا اسے ایک پڑیا میں باندھ کر جیب میں رکھ لیا۔ کہ خدا جانے اگلی منزل پر کچھ کھانے کو ملے یا نہ ملے۔

کازرانی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ آزاد نے یہاں ایک جوان عمر فاضل کو ڈھونڈ نکالا۔ ان کا نام شیخ محمد تھا نجف سے تحصیل علم کی تھی۔ تین شخص معتدل ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک شخص کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ شیخ نے یہ کتاب آزاد کو دی۔ اور کہا پڑھو۔ باقی حال آزاد سے سنئے۔

"میں نے کھول کر ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک لفظ پہ انہوں نے ٹوکا۔ میں نے پوچھا کہ میں غلطی پر تھا۔ پھر بھی میں سوچنے لگا۔ انہوں نے خود سوچ کر فرمایا۔ کہ شما درست خواندید۔ بخوانید۔"

اس طرح دیر تک امتحان لیتے رہے۔ آخر فرمایا "شما زبانِ عربی را خوب ورزیدہ اید۔" مگر اس قصبے میں کوئی کام کی کتاب ہاتھ نہیں آئی۔ شیراز سے ایک روز کی راہ پر دشتِ ارژن شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کی ٹھنڈی ہوا کا جس قدر شہرہ تھا۔ اس سے زیادہ سردی آزاد کو لگی گھبرا کر گھوڑے سے کود پڑے۔ کہ دوڑ کر گرمی پیدا کریں۔ ہزار تدبیر کی مگر ٹخنوں سے پاؤں تک کہیں حس نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ پاؤں میں بھی خون جم گیا تھا۔ آخر کوس بھر پیدل چل کر حواس درست ہوئے۔

۲۶ اکتوبر کی صبح کو شیراز میں وارد ہوئے اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ مگر سفر کی صعوبت کے بعد یہاں بھی آرام کی صورت نظر نہ آئی۔ دل شکستہ ہو کر بستر خاک پر بیٹھ گئے۔ آخر اپنے آپ کو سنبھالا۔ گٹھڑی کھولی۔ کپڑے نکالے۔ چونکہ واپسی میں کتابوں کے انبار ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا۔ اس لئے گھر سے بہت کم سامان لے کر نکلے تھے۔ حد یہ ہے کہ چغہ تک ساتھ نہیں لائے تھے۔ خفتان پہنا اور شیراز کی سیر کو نکلے۔ لیکن ابتدا اچھی نہیں ہوئی۔ پہلے ہی جن صاحب سے ملاقات ہوئی وہ غالباً محکمہ تلگراف میں ملازم تھے۔ اور ان کے ڈائرکٹر طہران سے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا۔ ہمیں فرصت نہیں ہے۔ جب کتب خانہ دیکھنے کی اجازت چاہی تو بے رخی سے کہا تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا۔

شیراز کے ایک رئیس نواب حیدر علی خاں کے پاس پہنچے۔ وہاں بھی دعا قبول نہیں ہوئی۔ اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ جب کام ہوگا۔ تو کہنا ہم مدد کریں گے۔ اصل میں آزاد کا مشن اس قدر نرالا اور سفر کا مقصد ایسا انوکھا تھا کہ ایرانی رئیس اور امیرزادے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن آزاد ان کی سرد مہری سے آزردہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ اب ان کی منزلِ مقصود ان کے سامنے تھی۔ نواب حیدر علی خاں ہی کے دروازے پر ایک دلال سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ انہیں ایک دوسرے شخص کے گھر لے گیا۔ اور کتابیں دکھائیں۔ کل ۲۲ جلدیں ۲۷ روپے کو خریدیں۔ شیراز کی سرائے سے تنگ آ چکے تھے۔ اس لئے کسی اور ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ آخر مرزا علی اکبر کے ہاں مہمان ہوئے۔ اس غریب نے اپنی نقاہت پر بھی رحم آیا ۲۵ روپے نذر کئے۔ اس کے ہاں قیام کیا۔ اور ان کے محلے میں اپنے حوصلے سے بہت زیادہ رقم اسے دی۔ مگر اس نے بوڑھے باپ سے بولنا چھوڑ دیا اور بد رقص بنا تھا۔ آزاد کا دم ناک میں آ گیا۔

ایک ایرانی امیر کی علم پروری

شیراز کے آخری دو روز نواب مرزا علی خاں صدر کے ہاں گذارے اور یہاں معلومات کا سامان آزاد کو کمال وفور کے ساتھ ملا۔ نواب جس طرح ملا۔

دولت، وجاہ و منصب سے امیر تھے۔ ایسے ہی علم و فضل اور کتب خانے کے اعتبار سے بھی امیر تھے۔ اس صاحب کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”باوجود دستگاہ، امارت اور پیرانہ سالی کے سب دیکھو گرد کتابیں جمع ہیں۔ ایک دو ملّا پاس بیٹھے ہیں بیچ میں آپ مطالعے میں مصروف ہیں۔ تصحیح کرتے ہیں۔ حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوش نویس کاتب ناقص کتابوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ مصور نقاشی کر رہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پہلو میں دسترخوان بچھا۔ اٹھے پہلے سجدۂ شکرانہ بجا لائے۔ ایک روٹی کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ گویا یہ بھی ایک فرض تھا۔ کہ ادا کر لیا۔ پھر کتابوں کے نکلنے میں جا بیٹھے۔“

علم و ادب کے ایک مربی کی اس سے بہتر تصویر کھینچنی مشکل ہے۔ نواب صدر کے ہاں ہی سفر نامے کے مصنف حاجی مرزا حسن سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو آزاد کا ذکر سن کر نواب کے ہاں ان سے ملنے آئے۔ ان کی شیراز سے روانگی میں ایک شب باقی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ بوندا باندی پڑ رہی تھی۔ باصرار اجازت لے کر اپنے گھر لے گئے۔ اور رات بھر اپنی کتاب سناتے رہے۔ آزاد نے بہت سے نکتے ان سے سن کر اپنی کتاب میں نوٹ کر لیے۔

ایرانی شرفا کی طرز رہائش کے ذکر میں آزاد لکھتے ہیں۔ کہ مکان کے ساتھ ایک مردانہ حصہ ہوتا ہے۔ جو حرم سرا سے زیادہ آراستہ ہوتا ہے۔ اکثر موافق طبع دوست صبح ملاقات کو آتے۔ اور ظہر کی نماز پڑھ کر رخصت ہوئے۔ یا رات کو وہیں رہے۔ اور صبح کو ناشتہ کر کے رخصت ہوئے۔ ان طویل علمی صحبتوں میں ادبی تاریخی اور علمی نکتے بیان کیے جاتے تھے۔ مگر زمانے کے ساتھ اب یہ صحبتیں بھی رخصت ہوئی ہیں۔

شیراز کے دوران قیام میں آزاد نے حافظیہ، سعدیہ اور شیراز کی مشہور مسجد شاہ چراغ کی زیارت کی۔ مگر اس زمانے میں شیراز کی رونق اور آبادی ختم ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی وسیع اور قدیم مسجدیں اور کہنہ مدرسے گرے پڑے تھے۔ ان میں لڑکے صرف نحو، بلاغت، فقہ، اصول کی کتابیں سامنے رکھے بے کتاب کے مسائل کتابی پر بحث کرتے رہتے تھے۔ اور علمائے کتب قدیمہ کی تدریس سے پرانی ہڈیوں پر آب حیات چھڑکتے تھے۔ ہمارے ملک کی طرح طلبا فقرہ بہ فقرہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ استاد کے سامنے کتاب کھلی، طلبا اپنی اپنی کتابیں کھولے خاموش بیٹھتے اور استاد کتاب کے مطالب کو نہایت توضیح اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا جاتا تھا۔

مرحوم رضا شاہ پہلوی کے عہد میں شیراز کو نئی زندگی ملی ہے۔ ورنہ آزاد لکھتے ہیں۔ کہ وہ عالی شان اور وسیع بازار اور بلند اور فراخ مسجد جو کریم خاں زند نے سو برس پہلے بنائی ہے۔ اگر وہاں سے اٹھا لیں تو اصل شیراز ایک معمولی قصبہ رہ جاتا ہے۔

خواجہ حافظ کے مزار اور اس کے قریب چہل تن اور ہفت تن کی آزاد نے بہت شوق سے زیارت کی مزار کی الواح کو نقل کیا تنگ اللہ اکبر خاک مصلے اور آب رکنا باد کی سیر کی۔ اور مدرسہ میں جا کر گلستان بوستان کے پرانے اسباق کی یاد تازہ کی۔ شیراز کی دلچسپ فضا نے بہت دامن پکڑا۔ لیکن جاڑے کا موسم کوہ برف سے سر پر چلا آتا تھا بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دبک کر کہا کہ شیراز تو دیکھ لیا۔ اب اصفہان کو دیکھو اور آگے بڑھو۔ کہ تماشے کی منزل ابھی دور ہے۔ شیراز کے دوست بہت روکتے رہے۔ مگر پندرہ روز کے بعد آزاد ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کر ۱۸ نومبر کو اصفہان روانہ ہو گئے۔

باقی سفر کا نقشہ

سفر نامے میں شیراز تک کا ذکر آزاد نے بہت وضاحت سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حصہ فی الحقیقت سفر نامے یا ڈائری کی تعریف میں آتا ہے۔ علمی صحبتوں کے علاوہ شیراز کے حماموں، ورزشخانوں اور ان عمارتوں کا ذکر جو اس شہر سے تعلق رکھتے تھے، خاصی تفصیل سے موجود ہے۔ اگر تمام سفر نامہ اسی تفصیل سے لکھا جاتا تو یہاں کے حالات اور اس دور کی ایک مکمل تصویر ہمارے ہاتھ آ جاتی۔ مگر افسوس کہ اس کے بعد سفر کی مصروفیات نے شاید اس تفصیل کی اجازت نہیں دی۔ اور تاریخ وار بیان کی جگہ مختصر نویسی نے لے لی۔ بعض جگہ خالی ہیں کچھ حال تحریر کیا ہے۔ کہیں صرف کسی کا نوٹ نقل کر دیا ہے۔ تاکہ یادداشت کے طور پر باقی رہے۔ آزاد کا ارادہ تھا کہ اس مختصر نویسی کو پھیلا کر مستقل سفر نامے کی شکل میں پیش کریں گے۔ مگر دوسرے

ادبی کاموں نے مہلت نہیں دی۔ کہ اس تصنیف کو مکمل کرسکے

بقایا سفرنامے کی تاریخوں اور مقامات کا موازنہ کرنے سے سفر کا یہ نقشہ تیار ہوتا ہے جس سے یہ دھندلے نقش کچھ اجاگر ہو جاتے ہیں

شیراز سے روانگی	۱۰ر نومبر ۱۸۸۵ء
اصفہان میں آمد	۲۵ر نومبر "
(اصفہان میں قیام	صرف پانچ روز
اصفہان سے روانگی	۳۰ر نومبر "
طہران میں آمد	۱۰ر دسمبر "
(طہران میں قیام	تقریباً ۳ مہینے)
طہران سے روانگی	یکم مارچ ۱۸۸۶ء
مشہد میں آمد	۲۹ر اپریل
(مشہد میں قیام	۱۲ روز)
مشہد سے روانگی	۹ر مئی

ہرات میں آمد کی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا۔ البتہ ہرات میں قیام ۲۸ روز رہا۔ ہرات سے قندہار کا سفر ۲۶ر دن میں طے ہوا۔ قندہار میں قیام ۵ دن تک رہا۔ قندہار سے ۱۱ر روز میں کوئٹے پہنچے۔ اگرچہ یہ سفر صرف ۵ روز کا تھا۔ اور وہاں سے بذریعہ ریل شروع ماہ جولائی ۱۸۸۶ء میں لاہور واپس ہوئے

اصفہان اور طہران

شیراز سے اصفہان تک معلوم ہوتا ہے۔ کہ اونٹ کے ذریعے سفر کیا تھا۔ عمر دی شباب پر تھی۔ مگر پھر بھی جس گاؤں میں جاتے تھے۔ علم و ادب کی جستجو ہمارا کام تھی۔ ہر جگہ جا کر پوچھتے۔ اور جو اہل علم ہوتا۔ اس سے ملاقات کرتے۔ آزاد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ چھوٹی سے چھوٹی آبادی میں بھی ایک دو عالم بلکہ کہیں کہیں صاحب اجتہاد مل جاتے تھے۔ ان کی حالت پر آزاد کو تعجب ہوتا تھا۔ مثلاً کھیت سے گٹھے کے لئے گھاس کندھے پر لئے آتے ہیں۔ باہر پہ کپڑے دھو رہے ہیں۔ لڑکا گھر کی دیوار چن رہا ہے۔ جب فارغ ہو گئے۔ تو اسے شرح لمعہ یا قوانین الاصول کا سبق پڑھانے لگے۔ یہ علمی فضا تمام ایران میں انہوں نے پائی جس کی وجہ شاہی سلف کی علم و ادب کی سرپرستی تھی۔ بار بار انہوں نے اسے علماء سے کہا۔ کہ تم اپنے لڑکوں کو طہران یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیوں نہیں بھیجتے۔ آزاد ہندوستان میں علوم قدیمہ کے زوال کے اسباب خود دیکھ چکے تھے۔ اور زمانے کی روش سے واقف تھے کہ آئندہ یہ مکتب اور درس و تدریس کے ٹھکانے زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر جب آزاد ایرانی علماء سے زمانے کی ہوا کا ذکر کرتے تو وہ ہنس دیتے۔

دوران سفر میں ان کے پاس کھانے پکانے کا سامان نہیں تھا۔ کسی گھر سے روٹی مول لیتے۔ کہیں سے انڈے کہیں سے گھی اور وہیں کسی کے گھر میں بیٹھ کر انڈوں کا قلیہ پکا لیتے۔ اس بہانے انہیں بہت سی باتوں کی تحقیق کا موقعہ بھی مل جاتا۔ چونکہ سفر کا یہ حصہ ماہ محرم میں طے ہو رہا تھا۔ اس لئے جگہ جگہ مجالس عزاداری میں شرکت کا موقعہ ملتا۔ ان مجالس سے فیض روحانی حاصل کرنے کے علاوہ آزاد ایرانی شرفاء کی تہذیب اور آداب مجلس کا بھی بہت قریب سے مطالعہ کر سکتے تھے۔

راستے میں ایک مسخرا حاجی ان کا ہم سفر ہو گیا۔ جب موچہ خاک گاؤں میں منزل ہوئی۔ تو اس بے برکت ایرانی گاؤں میں یہ ڈوئی گھر گھر

روٹی خریدنے کے لئے دستک دیتے پھرے۔ حاجی کو بھی ضد ہو گئی۔ کہ جب تک روٹی نہیں ملے گی کوئی گھر بغیر دروازہ کھٹکھٹائے خالی نہ چھوڑے گا۔ آگے وہ پیچھے آزاد۔ حاجی کہتا تھا۔ صاحب خانہ روٹی ہے۔ گھر میں سے کوئی بچہ نکل کر کہتا۔ نہیں۔ آزاد ہنس کر کہتے۔ الحمدللہ۔ حاجی کہتا۔ مگر نخ ہے آزاد آواز لگاتے "خدا نہ کرے۔" آخر ایک شخص کو پیسے دکھا کر روٹی بیچنے پر آمادہ کیا۔ اس نے سوائی قیمت سے کر چار خشک روٹیاں دیں۔ وہ لے کر خدا کا شکر کرتے سرائے واپس آئے۔

سفر میں اس قسم کے دلچسپ حادثوں سے طبیعت کی کوفت دُھل جاتی ہے۔

اصفہان کو اہلِ ایران نے نصف جہاں کا خطاب دیا ہے۔ آزاد بھی اس تاریخی شہر کے خوبصورت خیابان سجتے ہوئے بازاروں۔ شاندار مسجدوں اور شاہی محلّات کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ زندہ رود کے پل کی تعریف کی اور اس شہر کو سلاطین صفویہ کی مہموں کا عجائب خانہ قرار دیا۔ آزاد صبح سے شام تک شہر کی سیر کرتے رہتے۔ اور شام کو تھک کر بستر پہ آ پڑتے رہتے۔ ملا باقر مجلسی کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے گئے۔ مسجد جامع کی زیارت کی۔ یہ جگہ مہینوں رہنے کی تھی۔ مگر جاڑے کے ڈر نے پانچ دن سے زیادہ نہ رہنے دیا۔ اب طہران کی منزل ان کے سامنے تھی۔ اور ارادہ وہیں ڈیرے ڈالنے کا تھا۔

اصفہان سے طہران کے راستے میں کاشان کے مخمل بافوں کی صناعی اور چابکدستی کی داد دی ملا محسن کاشانی کے مزار پہ فاتحہ پڑھی۔ اور قم میں حضرت امام علی رضا کی بیٹی کے مزار کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔

طہران کی علمی فضا

سفرنامے کی عبارت اور تاریخوں سے طہران پہنچنے کی تاریخ کا تعین ۱۰ دسمبر ہوتا ہے۔ طہران کی یونیورسٹی۔ کتب خانوں۔ سرکاری دفاتر۔ اور علمی مجلسوں کا شوق آزاد کو راستے میں کہیں سانس لینے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے جن اغراض کے لئے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ وہ بھی اسی شہر میں پوری ہوتی تھیں افسوس کہ اس شہر میں تین مہینے کے قیام کا پورا حال دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ معلوم ہوتا کہ کہاں کہاں انہیں علم کی جستجو لے گئی البتہ اپنے لکچر میں اتنا حوالہ ضرور دیا ہے کہ کتابوں کی تلاش اور جامع لغات فارسی کے لئے سرمائے کی باقاعدہ جستجو شروع کی۔ اور سب سے پہلے شہزادہ فرہاد مرزا کے حضور میں پہنچے۔ جو شاہ ایران کے چچا تھے۔ سلطنت کے پیچیدہ معاملات انہی کی صلاح سے طے پاتے تھے۔ کئی عالم سرکار میں نوکر تھے جو ہر وقت علمی ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ تحقیق الفاظ کے سلسلے میں ان کے صاحبزادے احتشام الملک نے بھی آزاد کی مدد کی۔ یہ یورپ کے علوم جدیدہ کی تحقیق کے بعد طہران آئے تھے۔ اور فرنچ خوب بولتے تھے۔ ان کی وساطت سے آزاد کی رسائی دوسرے علماء اور امراء تک ہوئی۔ جن امراء کا آزاد نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب مغربی علوم کے ماہر تھے۔ اور ان میں سے اکثر شاہزادے پیرس اور برلن سے ڈگریاں لائے تھے اصل میں اس وقت ناصرالدین شاہ قاچار کی سیاحت یورپ کی وجہ سے امراء اور شرفا میں مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اور ایرانی تہذیب پر مغربی کلچر اثر کر چکا تھا۔ بہت سے امیرزادوں نے آزاد کی تحقیق الفاظ میں مدد کی۔ اور اپنی مروت، محبت اور ہمت سے آزاد کو خرید لیا اس زمانے میں فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کرنے کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس نے زور پہلوی عہد میں پکڑا۔ لیکن آزاد کی تحریر سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس خیال کے زبردست حامی، مرزا رضا خاں افشار گنجلو اس وقت بھی طہران میں موجود تھے۔ انہیں حکومت کی طرف سے دبیران دبیر کا خطاب ملا تھا۔ اس کے علاوہ ترکی اور فرنچ بھی خوب بولتے تھے۔ مرزا رضا خاں کا خیال تھا۔ کہ فارسی زبان سے فوراً عربی لفظوں کو خارج کر دینا چاہیئے۔ اور اس کی جگہ فارسی قدیم جاری کرنی چاہیئے۔ آزاد کو ان کے مقصد سے ہمدردی تھی۔ لیکن طریق کار سے اختلاف تھا۔ آزاد کہتے تھے۔ کہ علماء جن کا اثر تمام ایران پر اس وقت چھا ہوا تھا۔ اس خیال کی مخالفت کریں گے۔ اور عوام چونکہ اس مطلب کو سمجھتے نہیں۔ اس لئے ان کی تائید

بھی میسر نہیں ہو سکتی۔ اگر تمام تصانیف اور عام سرکاری کاروائی اس نئی زبان میں ہونے لگی تو پبلک گھبرا جائے گی۔ کیونکہ صدہا لفظ فارسی کے اب لوگ بھول چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ عربی الفاظ لے چکے ہیں۔ ہزاروں کے لئے لفظ فارسی موجود ہیں۔ مگر مستعمل نہیں۔ اور یہ ناممکن ہے۔ کہ ادنے اعلےٰ کام کے لئے ہر شخص ڈکشنری سے مدد لے

آزاد نے رائے دی۔ کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ عربی کی جگہ فارسی الفاظ رکھو۔ اور وہ رکھو جو خاص و عام کے کانوں کو اب بھی مانوس ہیں۔ جس عربی لفظ کی جگہ اصل لفظ فارسی کا نہ ملے۔ وہاں فی الحال عربی رہنے دو۔ یا مطلب کو کسی اور پہلو سے فارسی کے مانوس لفظوں میں ادا کرو۔ آزاد کی رائے تھی۔ کہ ہمیں اس بارے میں اخبارات سے بھی مدد لینی چاہیئے اور شاہ ایران تک اس بات کو پہنچانا چاہیئے۔ کیونکہ بغیر سرکاری امداد کے یہ کام ممکن نہیں تاکہ شاہی تصانیف میں اس بات کا خیال رہے۔

آزاد کو شکایت ہے کہ طہران میں کوئی شاعر بااستقلال نہیں۔ اصل میں فارسی شاعری قاآنی پر ختم ہو چکی تھی۔ آزاد نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جس قدر تہذیب بڑھتی ہے شاعری گھٹتی ہے۔ دوسرے شاہ اور اہلِ دربار پر یورپ کا تازہ غازہ چڑھا ہوا تھا۔ کہ یہ شاعری کی نسبت علوم و فنون کے زیادہ خواہاں تھے۔ پھر اہلِ دربار کس کی امید پر شاعری سے نکاح کرتے۔ آزاد دو چار شاعروں سے طہران میں ضرور ملے۔ لیکن نتیجہ یہ نکالا۔ کہ کچھ شاعروں کی سی خوشحالی بعض امراء کی قدردانی سے پہنچی جاتی ہیں۔ نہیں تو اللہ ہی اللہ ہے۔

طہران کی علمی صحبتوں میں ۳ مہینے تک آزاد کا خوب جی لگا رہا۔ مگر شوق کی پیاس کسی طرح نہ بجھتی تھی۔ اور دل اس سرچشمے سے سیر نہیں ہوتا تھا۔ ۳ مہینے غرض خوب محنت اور مصروفیت میں گذرے۔ طہران میں ٹھہرنے کا بہانہ سردی کا موسم بھی تھا۔ آخر جب مارچ کا مہینہ آیا۔ اور بہار نے ایران کی سرزمین پر لشکر اتارا۔ تو آزاد بادل نخواستہ طہران سے رخصت ہوئے۔ اب ان کی چھٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اور ہر روز تنخواہ میں سے ۲½ روپے کٹ رہے تھے چنانچہ جب آخری برف باری ختم ہوئی۔ تو یہ شوق کا زادِ راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشہد مقدس روانہ ہوئے۔

واپسی

سفرنامے کے مطابق طہران سے مراجعت کی تاریخ کا تعین تقریباً یکم مارچ کو ہوتا ہے۔ طہران میں ۳ ماہ تک رہنے اور علمی مجالس میں منہمک رہنے کے بعد آزاد پر فارسی زبان کا ایسا جادو چل گیا تھا۔ کہ ان تاریخوں میں سفر کی یادداشتیں انہوں نے فارسی زبان میں لکھی ہیں۔ لیکن یہ سفرنامہ مرتب نہیں رہا۔ بلکہ صرف ضروری یادداشتوں کے نوٹ ہیں۔

طہران سے مشہد جانے کے لئے آزاد نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ جو عام مسافر اور زائرین کے لئے مخصوص ہے۔ ایران کی سیاحت سے ایک غرض ان کی "خاک وطن" کو سفر کا پیوند دکھانا بھی تھی۔ اس لئے آپ ہمدان گئے۔ کہ جس کی خاک سے ان کے بزرگ پیدا ہوئے تھے۔ اور جہاں سے ان کے اسلاف ہندوستان آئے تھے۔ ہمدان تک پہنچنے کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ مختلف منزلوں کے نام اور ان کی مسافت کا ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یکم مارچ کو طہران سے روانہ ہونے کے بعد یہ مشہد تقریباً ۲ مہینے بعد اپریل کے آخر میں پہنچے ہیں۔ ہمدان کے راستے میں کن کن علماء سے ملاقات ہوئی۔ ہمدان کی قدیم عمارتوں کو کیسا پایا۔ اور خاک وطن کو دیکھ کر آزاد کے حساس جذبات پر کیا گذری ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

اس حصہ سفر کی یادداشتوں میں جا بجا مشہور مقامات کا ذکر ہے۔ ہر مقام پر جس جس بزرگ کا مزار ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ جگہ جگہ علم کی تلاش اور تاریخ کا تجسس آزاد کو تاریخی مقامات کا کھوج لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ بڑی بڑی سرائوں، مسجدوں اور مقبروں کے متعلق تاریخی حالات لوگوں سے دریافت کرتے ہیں۔ مگر انہیں تعجب ہوتا ہے کہ شہر کے رہنے والے تاریخی عمارتوں کے حالات سے قطعاً نابلد ہیں۔ حد یہ ہے کہ علماء اور طلباء بھی ان کی بات کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ سبزوار میں جامع مسجد کے متعلق کوئی کہتا ہے کہ چار سو سال پہلے بنائی گئی۔ ایک اور شخص کا بیان ہے کہ اس کا بڑا دروازہ پچاس سال

پہلے اپنے بچپن میں بنتے ہیں نے خود دیکھا تھا۔ جہاں جہاں انہیں کوئی تاریخی کتبہ کسی مدرسے یا عمارت پر ملتا ہے۔ فوراً کتاب میں لکھ لیتے ہیں۔ بزرگوں کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اور مشہور تاریخی شخصیتوں کا ذکر نہایت محبت سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں جابجا صفوی بادشاہوں کی سرائیں جواب دیران ہوگئیں ہیں۔ آزاد سے ان کے حق میں کلمہائے خیر لکھواتی ہیں۔ اگر کسی کی زبانی شاہان قدیم کا کوئی واقعہ اگرچہ وہ معمولی ہی ساکیوں نہ ہو مل جاتا ہے۔ تو آزاد فوراً اسے قلمبند کر لیتے ہیں۔ اگر کسی قصبے یا قریے میں کسی صاحب علم کا پتہ چلتا ہے۔ تو بے تکلف آزاد اس کے دروازے پر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور منزل پر آرام کرنے کی بجائے علم و ادب کے موتی جمع کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ جہاں کہیں کوئی محاورہ مل جاتا ہے۔ فوراً اسے لکھ لیتے ہیں۔ اہل زبان کے وہ فقرے جو کتابوں میں نظر نہیں آتے۔ اور صرف بولے جاتے ہیں۔ آزاد کے لئے خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ اگر کسی محاورے میں مقامی طور سے اختلاف پاتے ہیں۔ تو وہ نوٹ کر لیتے ہیں۔ اہل اصفہان کی اصطلاح طاق کردن ہے۔ خراسان کے فصحاء اس کی جگہ سر بودن بالا بودن بولتے ہیں۔ عوام پی اور کہتے ہیں۔ اسے بھی آزاد نے فوراً لکھ لیا۔ اہل صحرا کی اصطلاحیں بھی ان کی ژرف نگاہی سے نہیں چھپتیں۔ راستے میں جب کہیں کسی عالم سے ملاقات نہیں ہوتی تو صحرانشینوں سے ہی باتیں کر کے علم کے موتی رول لیتے ہیں۔

سبزوار کے بعد نشیاپور کی مردم خیز سرزمین کا ذکر آزاد نے بہت محبت سے کیا ہے۔ اس وقت جو شرفا اس شہر میں آباد تھے۔ ان سے مل کر ان کے نام اور خاندانی شجرے لکھے ہیں۔ شیخ فرید الدین عطار کے مزار پر فاتحہ پڑھی ہے۔ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں کے نام بھی دریافت کیے ہیں۔ مگر ان کی عظمت کے مقابلے میں ان کی اس درجہ بری حالت اور کھنڈر دیکھ کر آزاد رو پڑے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کے وطن بسطام کی محبت نے آزاد کو راستے سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچا۔ لیکن اب وہاں فقط ایک گاؤں باقی رہ گیا تھا آزاد نے اسے بھی دیکھا۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انہیں بالاخیابان کے ایک چبوترے کو دیکھ کر ہوئی۔ اس چبوترے پر ایک بڑا ترانہ ونصب تھا۔ وہیں نادر کشو پڑے رہتے تھے۔

اگرچہ بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مگر خراسان میں برف باری جاری تھی۔ ایک جگہ یہ تکلیف اٹھانی پڑی کہ برف آباد اسم بامسمیٰ نکلا۔ راستہ تمام سفید تھا۔ اور عالم گیر برف برس رہی تھی۔ آخر مشہد مقدس کا قصبہ دور سے نظر آیا۔ اور آزاد کی عقیدت مند آنکھیں امام رضا کے حضور میں نم ہوگئیں۔ فوراً گھوڑے سے اتر کر زمین چھو لی۔ آزاد کے والد کو امام ضامن سے جو عقیدت تھی۔ اس کا ذکر آزاد نے کیا ہے اور لکھا ہے۔ کہ مولوی محمد باقر امام الکثر ایک قصیدہ پڑھتے تھے۔ جس کے تیسرے شعر میں "طرق" کا ذکر ہے۔ جب آزاد طرق پہنچے۔ تو وہ شعر یاد آگیا۔ انہی کی زبانی آزاد نے سنا تھا۔ کہ یہ قصیدہ حضرت کے روضہ مبارک کے ایک دروازے پر آویزاں ہے۔

یارب ایں ارض مقدس چہ مقام است وچہ جاست

کز زمین تا بہ فلک مظہر انوار خدا است!

مشہد مقدس کی زیارت سے سرفراز ہونے کے علاوہ روضۂ مبارک سے ملحق کتب خانے کی فہرست بھی حاصل کی۔ آزاد کے بیان کے مطابق یہ لائبریری کتب عجیب و غریب سے علوم و فنون کا خزانہ ہے۔ کیونکہ سلاطین و امرائے سلف نے عمدہ عمدہ نایاب کتابیں بھیج کر ذخیرہ آخرت جمع کیا ہے۔ مشہد کی تجارتی حیثیت اس کے خوبصورت خیابانوں اور آب و ہوا کی لطافت سے بھی آزاد بے خبر نہیں۔ ایک جگہ بازار میں انگوروں کا خوشہ آویزاں دیکھا ابھی انگور کا موسم شروع نہیں ہوا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ گذشتہ سال کے انگور ہیں۔ اگرچہ بعض مرجھا گئے تھے۔ مگر بعض ان میں سے صاف اور درست تھے۔ یہ مشہد کی آب و ہوا کی تاثیر تھی۔

ہارون رشید کی قبر دیکھی۔ علماء میں شیخ بہاؤالدین آملی۔ شیخ حرِ عاملی۔ شیخ طبرسی کے مزار پر گئے۔ اور کتبے نقل کئے۔ شیخ بہائی کے مزار پر کئی مرتبہ حاضر ہوئے۔ شعراء میں فردوسی اور اسدی۔ طوسی کی قبروں پر گئے۔ اور اس مقدس مقام پر ۱۲ روز ٹھہر کر وطن کی طرف قدم اٹھایا۔

مشہد سے ہندوستان آنے کے دو رستے ہیں۔ ایک کرمان ہوتے ہوئے بندر عباس پہنچتا ہے۔ جہاں سے پھر جہاز میں بیٹھ کر کراچی آسکتے ہیں۔ دوسرا ہرات اور قندھار سے کوئٹے کی منزل پر ختم ہوتا ہے غالباً اس وقت تک وہ راستہ دریافت نہیں ہوا تھا جس پر آج کل کوئٹے سے مشہد تک لاریں سفر کرتی ہیں۔ آزاد نے بندر عباس کے راستے کو طولانی سمجھا۔ دوسرے اس راہ پر جانے والا کوئی کارواں نہیں تھا۔ اور انہیں اب رخصت ختم ہو جانے کی وجہ سے واپسی کی جلدی تھی۔ اس لئے مجبوراً ہرات اور قندھار کی راہ اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ راستے میں افغانوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ اس لئے سوداگر عموماً بندر عباس کے راستے آتے جاتے ہیں۔ مگر ایک گروہ نے رائے دی۔ کہ اب امیر عبد الرحمان نے افغانستان کا بندوبست ایسا چست اور درست کیا ہے۔ کہ آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ آزاد امیر عبدالرحمان کے عدل اور انتظام پر یقین کرکے توکل بخدا اس راستے سے مئی کے پہلے ہفتے میں روانہ ہو گئے۔

دوسری منزل خیر بمانی میں ایک فاضل مُلّا محمد علی کو دیکھا۔ کہ اپنے لڑکے کو شرح لمعہ کا درس دے رہے ہیں۔ لڑکے کی عمر ۱۴ برس کی تھی۔ آزاد کو یہ دیکھ کر بہت لطف آیا۔ کہ سبق پڑھ کر لڑکا اٹھا۔ اور تھوڑی دیر بعد کھیلنے کے لئے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ علماء کی سادہ زندگی اور علماء کی بے تکلف زندگی کا ان کے دل پر بہت اثر پڑا۔

تیسری منزل سے روانہ ہوئے۔ تو بقول ان کے نیند نے شبخون مارا۔ یہ اونٹ پہ اونگھنے لگے۔ اور لڑھک کر سر کے بل زمین پر آن گرے۔ خدا کی قدرت سر بال بال بچ گیا۔ زیادہ تر پشت اور سینے پر صدمہ پہنچا۔ اور پسلی ٹوٹ گئی۔ ساربان نے زمین پر سے اٹھا پھر لحاف میں لپیٹ کر اونٹ کی کمر پر رسی سے جکڑ دیا۔ سب کو خیال تھا۔ شاید مر گئے۔ صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر رسہ کھولا اور آواز دی تو انہیں ہوش آیا۔ تین دن عجیب حالت رہی۔ نہ کوئی جراح اور نہ حکیم قدرتِ الٰہی نے جراحی کی۔ اور پسلی آپ ہی جڑ کر اچھی ہو گئی۔ مگر اس کی گرہ باقی رہ گئی۔ جو باقی عمر ان کے ساتھ رہی۔

اب شہر ہرات کے ویرانے۔ سلاطین تیموری کے قدیم آثار اور مساجد کے کتبے دیکھے آزاد قافلے کے ساتھ قندھار کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ ہرات کی ایک مسجد کے اندر نہایت عمدہ خط ثلث میں کوئی فرمان لکھا دیکھا۔ کوشش کی کہ اس کو پڑھ کر نقل کر لیں۔ مسجد کے اندر چند خونخوار ملا حجروں میں بیٹھے تھے۔ ان کے ڈر کے مارے جی بھر کے نہیں دیکھ سکے۔ کہ کہیں کوئی چھرا نہ بھونک دیں۔ اور مفت میں جان جائے۔ کیونکہ ان کے نزدیک گائے اور آدمی کا کاٹنا برابر ہے۔ فقط اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "آدم پرنگی (فرنگی) بود کافر بود۔ کہ مسجد اندر گشت است"

اسی نواح میں مولانا جامی اور ان کے استاد مولانا سعد الدین۔ امام فخر الدین رازی۔ اور محمد حسین واعظ کاشفی کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ یہ وہی مُلّا حسین واعظ کاشفی ہیں جن کی انوار سہیلی آزاد بچپن میں پڑھ چکے تھے۔ یہاں بھی علماء کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اور جس بزرگ سے اس کی علمی قابلیت اور فضیلت کا حال نوٹ کر لیا۔ جو قابلِ ذکر نہیں تھے۔ ان کے متعلق صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

"باقی علما بسیار اند مگر قابل شمار نیستند"

قریب ہی مولانا جامی کے استاد شیخ جام کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھانے۔ اور سلطان سنجر کے نامکمل مزار کو شاہ عباس صفوی کے ہاتھوں مکمل ہوتے دیکھا

کاریز کے مقام پر ایک پیر مرد سے ملاقات ہوئی۔ اس کے پاس دو نایاب کتابیں تھیں۔ مگر وہ کسی قیمت پر کتابیں دینے کو تیار نہیں تھا۔ آزاد کے پاس ایک ہاتھی دانت کی سرمے دانی تھی۔ اس پہ پیر مرد کی رال ٹپک پڑی۔ آزاد سرمے دانی کے بدلے کتابیں لے خوش خوش روانہ ہو گئے۔

سفر میں جب کبھی بارش ہوتی تھی۔ سب سے پہلے انہیں اپنی کتابوں کا خیال آتا تھا۔ ایک مقام پہ اس زور کی بارش ہوئی۔ کہ اونٹ پھسلنے لگے قافلے والوں کو مجبوراً پڑاؤ کرنا پڑا۔ سردی کے مارے دم خشک ہوا جاتا تھا۔ دوسرے مسافر بارش سے بچنے کی تدبیر کر رہے تھے۔ مگر آزاد نے بوجھ آگے پیچھے اوپر تلے لگا کر کتابوں کو محفوظ کیا۔ اور پانی سے بچاؤ کے لئے ان پر موٹے گدّے ڈال دیئے۔ اور خود توکل بخدا بیٹھ گئے۔

آگے چل کر پھر بارش ہوئی۔ اگرچہ سردی اور ہوا کی طرف سے جسمانی تکلیف تھی۔ لیکن کتابوں کی طرف سے روحانی تکلیف کا احساس تھا۔ خدا خدا کر کے اگلی منزل پر پہنچے۔ اس موقع پر بھی آزاد کی انشا پردازی کا زور کم نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں:۔

"رفیقوں نے یہاں بھی کارسازی کے اونٹ بٹھائے۔ اور باج گیروں کی آنکھوں میں ایسی خاک ڈالی۔ کہ اونٹ لاد پھاند کر ادھر ادھر اوپر غائب کر دیا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی"

افغانستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی پروانہ راہداری کی شدت سے پڑتال ہونے لگی۔ ہرات میں نائب کوتوال انہیں سپہ سالار کے سامنے لے گیا آزاد نے وہ پروانہ دکھایا۔ جو مشہد میں افغانستان کی حکومت کے نمائندے سے انہوں نے حاصل کیا تھا۔ افغانی سپہ سالار غالباً ان پڑھ تھا۔ کسی اور سے پڑھوا کر سنا۔ اگرچہ اس پر مہر لگی ہوئی تھی۔ لیکن سپہ سالار نے پوچھا۔ کہ کیا یہ مہر اصلی ہے۔ آزاد نے برجستہ جواب دیا۔

"حضور کے سامنے سند اصلی کو پیش کرتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں۔ جعلی کاغذ کون پیش کر سکتا ہے۔"

اس جواب سے خوش ہو کر سپہ سالار نے کہا۔ بہت خوب تم روانہ ہو جاؤ

ارباب حکومت کی سختی کے علاوہ ہرات کے باشندوں کا سلوک بھی تکلیف دہ تھا۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک اور سپاہی سے لے کر بوڑھیا عورت تک ہر شخص سوال کرتا تھا۔ اور پھر آنکھیں بدلتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ کہاں سے آئے ہو۔ کیوں آئے ہو۔ کس راستے آئے ہو۔ کیا لائے ہو۔ کتابیں کیوں لائے ہو۔ اور اتنی کتابیں کیوں لائے ہو۔ انہیں کیا کرو گے۔ یہ کیا کیا کتابیں ہیں۔ کس کس علم کی کتابیں ہیں۔ تم اس راستے کیوں آئے ہو۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ کس رستے جاؤ گے۔ اس رستے کیوں جاتے ہو؟

ایسے سوالوں سے آزاد کا ناک میں دم آگیا تھا۔ غیر ملک۔ اجنبی ماحول۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے۔ کہ کہیں اور آفت میں نہ پھنس جائیں جاسوسی کا الزام نہ لگ جائے کفر کا فتوے لگا کر گردن زدنی نہ ٹھہرائیں۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔ یہاں ایک ایک گھڑی پہاڑ تھی مگر قافلہ نہ ملنے کی وجہ سے ۲۰ روز گذر گئے۔ ہرات کی سخت گیریوں سے تنگ آ کر آزاد کو ایرانیوں کی محبت اور ان کی مہمان نوازی یاد آگئی۔ کس خلوص سے لکھتے ہیں:۔

"ہزار رحمت ہے ملک ایران پر کہ مہینوں وہاں رہا۔ جا بجا پھرا۔ اور سب سے ملا جلا۔ ہر قسم کی بات پوچھتا تھا۔ اور لکھتا تھا وہ بتاتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ کسی بات کا شبہ دل میں نہ لاتے تھے۔"

ہرات سے قندھار اور کوئٹے کو روانگی

غالباً جون کے مہینے میں ہرات سے بہزار دقت آزاد روانہ ہوئے۔ ہرات سے قندھار ۱۲ یا ۱۴ منزل کی مسافت تھی۔ اور یہی کہ کر آزاد اس راستے سے آئے تھے۔ مگر یہ سفر پورے ۲۶ دن کا تھا

یہ علاقہ تمام ایرانی ہے۔ باشندے صحرانشیں ہیں۔ جہاں پانی دیکھتے ہیں کمبل تان کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایران کے سبزہ زاروں اور پر لطف باغات کے بعد اس صحرا کو دیکھ کر آزاد کا دل اور بھی اچاٹ ہوا ہوگا۔ آزاد کے قافلے میں ۱۰۲ تھے۔ اس لئے قافلے والے جدھر ہرا میدان اور آب رواں دیکھتے تھے۔ وہ اچھوٹ کر ادھر نکل جاتے تھے۔ اور خواہ تھوڑی سی مسافت طے کی ہو۔ ہری گھاس دیکھتے ہی منزل کر لیتے تھے۔ ہر مسافر نے اپنے ساتھ کھانے کا توشہ باندھ لیا تھا۔ جہاں صحرانشین تبیلے تھے۔ ان سے آٹا۔ گھی اور گھوڑوں کے لئے جو لے لیتے۔ اس علاقے میں روپے پیسے کا رواج نہیں۔ چیزوں کا آپس میں مبادلہ ہوتا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے ساتھ سوئیاں انگشتانے۔ کنگھیاں۔ سرمہ کالی مرچیں۔ سونٹھ وغیرہ خرید کر رکھ لی تھیں۔ انہی چیزوں کے بدلے میں روغن دودھ۔ چھاچھ اور گھی وغیرہ مول لے لیتے تھے۔ ان کے پاس پکانے کا سامان نہیں تھا۔ اس لئے بہت سی روٹیاں پکوا کر رکھ لی تھیں۔ یہ پانچویں دن ترش گئیں

انہیں سکھایا۔ ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا۔ وہ بیگ کین جب کچھ اور نہ ملتا تھا تو ۱۰۔ ۱۰۔ ۱۵۔ ۱۵ دن کی سوکھی روٹی پانی کے گھونٹ سے کھاتے تھے۔ لوگ اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ کہ ناپاک ہو جائے گی۔ کئی دفعہ لوگ پتھر لے کر مارنے کو کھڑے ہو گئے۔ کہ کافر ہے۔ لیکن جب یہ کسی کو دودھ، دہی وغیرہ کھانے کی چیزیں دیتے تو لے لیتے۔ اصل میں ان کی سختی کسی خاص سبب سے نہیں تھی۔ جانتے تھے۔ کہ ہندوستان کے لوگ روپے والے ہیں انہیں جس طرح ہو سکے دبا کر روپیہ لینا چاہیے۔ اور بہانہ ہاتھ آ جائے تو مارنے میں بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

قندھار پہنچ کر بھی یہ مصیبتیں ختم نہیں ہوئیں۔ یہاں پانچ روز گذارنے مشکل ہو گئے۔ ہرات کی طرح قندھار میں بھی راہ چلتے لوگ روک لیتے اور کہتے۔ بیا بیا

ایک دن چل کر آزاد کو بازار میں حسب معمول ۲ آدمیوں نے روکا۔ اور وہی سوال کیا۔ کہ کہاں سے آتے ہو۔ ان کا دل جلا ہوا تھا۔ انہوں نے جس طرح ان دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس کا دلچسپ حال آزاد سے ہی سنئے۔

انہوں نے کہا۔ "از ہند آمدہ ام، باز بہند میروم"

"چرا آمدی"

"تو بگو کہ چرا می پرسی؟"

ایک شخص نے بازو پکڑ کر کہا۔ "نمیدانی ما می توانیم ترا بگیریم پیش امیر صاحب بریم۔ تو جاسوس فرنگ ہستی"

آزاد بولے۔ "چلے خوب۔ ما گوئیم۔ امیر صاحب مسافر ہستیم، بملک شما آمدیم۔ نمک شما را نخوردیم۔ آرام نیافتیم، دعا می کنیم می رویم۔ ایں ہا ہستند کہ حالا بخیر خواہی شما دم می زنند۔ فوج فرنگ می آید۔ ہر دو دوی روند نوکری می کنند۔ یک تخم مرغ بہ ہر یک ماکیاں بہ عکار می فروشند۔ باز وقتیکہ ...... می آید۔ بہ کفر شما فتوی می نویسند۔"

آزاد کی ان سچی سچی باتوں کو سن کر دونوں افغان گھبرا گئے۔ اور ایک دوسرے سے کہا۔ گم کنید۔ اور آزاد سے کہا برو برو۔ آزاد اپنی فتح کو اس آسانی سے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک چابک اور لگایا۔ پوچھا۔

"حالا ایں ہم بفرمائید کہ اسم شریف شما چیست؟"

ایک تیسرے شخص نے ان سے پوچھا۔ "ایں چہ بلا است"

افغانوں نے تنگ آ کر کہا۔ ہماں خرس مست کہ من میگذارم او می گذارد۔

قندھار سے کوئٹے تک کا کرایہ دس روپیہ تھا۔ آزاد قندھار سے عاجز آ گئے تھے۔ اس لئے اس کی جگہ بارہ روپے دے کر سواری کرایہ پر لی۔ اور پانچ روز کا راستہ ۱۱ دن میں طے کیا۔ اور کوئٹے پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس زمانے میں کوئٹے تک ریل کی لائن نہیں بنی تھی۔ اس سبب کوئٹے سے رونی تک ابھی سفر باقی تھا۔ سفر کی یہ آخری منزل کس اہتمام سے طے کی اس کا ذکر بھی آزاد ہی کے لفظوں میں سنئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہفت خوان رستم طے کر کے الف لیلے کے سیاح کی طرح اپنے محبوب کو ساتھ لیے منزل پر پہنچ رہے ہیں۔

"دوسرے دن ایک چھکڑا کرایہ پر کیا۔ اس میں کتابیں لادیں۔ اور آپ بچھونا بچھا کر اوپر بیٹھا۔"

سفرنامے کے متعلق رائے

سیر ایران نام کی جو کتاب اس وقت بازار میں ملتی ہے۔ اسکے پہلے حصے میں آزاد کا ایک لکچر ہے۔ جو انہوں نے ۲۵ جولائی ۱۸۸۶ء

کو لاہور میں دیا تھا۔ غالباً یہ تقریر انہوں نے پہلے سے لکھ لی تھی۔ جسے اخبارِ رفیقِ ہند نے شائع کیا۔ لکچر کتاب کے ۳۴ صفحات پر حاوی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان کا سفرنامہ ہے جو ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ لکچر میں بار بار آزاد نے سفرنامے کا حوالہ دیا ہے۔ اور اکثر مباحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ ان کی تفصیل سفرنامے میں پیش کریں گے۔ موجودہ سفرنامہ جو سیرِ ایران میں چھپا ہے۔ آزاد کی یادداشتوں اور ان تحریروں کا مجموعہ ہے۔ جو دورانِ سفر میں یہ لکھتے رہے۔ سفر کے ابتدائی حصے میں بہت سی باتوں کی تفصیل ہے۔ مثلاً لاہور سے کراچی کا سفر۔ کراچی میں ایک ہفتہ قیام۔ کراچی سے بوشہر تک جہاز کا سفر اور بوشہر سے شیراز تک کی سیاحت یہ تمام حال سفرنامے میں خاصی تفصیل سے موجود ہے۔ لیکن جوں جوں سفر بڑھتا گیا۔ اور دوسری مصروفیات پیدا ہوتی گئیں سفرنامے کی طرف سے آزاد کی توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ طہران کے شہروں اور مشہور مقامات پر پہنچنے کی تاریخیں ابھی موجود ہیں۔ لیکن طہران میں ۴ مہینے کے قیام کے متعلق کوئی تفصیلی بیان نہیں ملتا۔ ہندوستان سے چلے تھے۔ تو شمسی اور قمری دونوں تاریخیں ڈالتے جاتے تھے مگر بعد میں صرف قمری تاریخیں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے۔ کہ ایران میں قمری تاریخوں کا رواج تھا۔ اور سفر کی مصروفیت میں قمری تاریخوں کے ساتھ شمسی تاریخوں کا لکھنا نا ممکن ہو گیا۔ طہران سے روانگی کے بعد مشہد پہنچنے تک کا حال بہت مختصر ہے۔ یہ سفر انہوں نے میرے حساب سے تقریباً دو مہینے میں طے کیا۔ حالانکہ طہران سے مشہد کی مسافت ؟ سے زیادہ نہیں۔ سفرنامے میں ۲۲ رجمادی الاول (یکم مارچ) طہران سے شاہ عبد العظیم جانے کی تاریخ لکھی ہے۔ ۲۴ر کو ایوانِ کیف قشلاق میں قیام کیا ہے۔ اور ۲۰ر جمادی الاول کو اہوان کا نام نظر آتا ہے۔ اس کے بعد کسی شہر کا حال نہیں ملتا۔ البتہ چند شہروں کی مسافتیں درج ہیں۔ اگر یہ مسافتیں سفر کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ افغان کے راستے قزوین گئے۔ اور وہاں سے ہمدان کا سفر کیا ہمدان سے سبزوار کس راستے گئے۔ اس کی کوئی خبر نہیں دی۔ لکچر میں بھی حیرت ہے کہ ہمدان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن طہران کی روانگی سے مشہد پہنچنے تک ۲ مہینے کا طویل عرصہ اس بات کی کافی شہادت ہے۔ کہ یہ ہمدان ضرور گئے تھے ورنہ یہ سفر اتنے دن میں طے نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

مشہد سے روانگی کی تاریخ کا تعین بھی ممکن ہے۔ لیکن اس کے بعد کہیں تاریخ کا حوالہ نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایران کی خوبصورت سرزمین سے افغانستان کی بے آب و گیاہ سرزمین پر داخل ہونے کے بعد ان کا مقصد صرف ہندوستان پہنچنا رہ گیا تھا۔ دوسرے قدم قدم پر تکالیف اور مشکلات کا سامنا تھا۔ اس لئے سفرنامے میں سوائے ان شکایتوں کے یا چند ضروری یادداشتوں کے بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔

لکچر کی زبان اور انداز وہی ہے۔ جو آزاد کی دوسری تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگرچہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایران کا ذکر ایسی لطف اور بلاغت سے کیا جاتا جو ہمیں سخندانِ فارس کے دوسرے حصے میں ملتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ سفر کی کسل اور تکان ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ اور احباب کا تقاضا تھا۔ اس لئے جلدی میں یہ لکچر لکھ لیا۔ دوسرا قیاس یہ ہے۔ کہ یہ تقریر آزاد نے بغیر کسی تحریری مدد کے کی تھی۔ اخبار نویسوں نے نوٹ لے کر اسے اخبار میں چھاپ دیا۔

سفرنامے کا ابتدائی حصہ جیسا کہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ تفصیلی ہے اور اس کی زبان میں بھی بے تکلفی کے ساتھ انشا پردازی کا رنگ موجود ہے لیکن بعد میں جہاں مختصر نویسی نے صفحوں کا بیان چند فقروں میں ادا کیا ہے۔ وہاں انشا کی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ لیکن اتنا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جو مطالب اس اختصار سے لکھے گئے ہیں۔ انہیں لکھنے والے نے اس خوبی سے لکھا ہے۔ کہ بعد میں ان سے وفتر تیار ہوں گے۔

سفرنامے کی تاریخی اہمیت

سیرِ ایران کئی لحاظ سے ہماری زبان میں ایک دلچسپ اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اوّل تو یہ پہلی اور آخری کتاب ہے کہ جس کی مدد سے ہمیں آزاد کی اپنی تحریر سے ان کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ مشکل سے ۹ مہینے کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن آزاد کی زندگی کے

متعلق داخلی شہادتیں اس قدر کم یاب ہیں کہ اس بیش بہا مواد سے ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ان کا علمی ذوق، تجسس، تحقیق کا شوق طالب علمانہ زندگی۔ علماء اور فضلاء کی صحبتوں سے فیضان حاصل کرنے کا شوق یہ سب باتیں سیر ایران سے ہمیں پہلی مرتبہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ آزاد کے مذہبی اعتقادات۔ آلِ عبا سے والہانہ عقیدت اور بزرگانِ سلف سے محبت۔ ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے۔

آزاد نے سیاحت ایران جن مقاصد کے پیش نظر کی تھی۔ یہ اپنی جگہ ایسے بلند اور اعلیٰ مقاصد ہیں کہ انہیں ادبی سیاحوں کی فہرست میں بہت اونچے درجے کا استحقاق دیتے ہیں۔ ۵۵ برس کی عمر میں جب کہ سب عزیز اور احباب انہیں آرام کی صلاح دے رہے تھے۔ آزاد ایک مشکل اور زبردست مہم پر کمر باندھ کر جوانوں جیسی ہمت کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ وطن کی محبت اور اہلِ وطن کی بہبودی کا انہیں ہر وقت دھیان ہے۔ جب احباب ان کی دلیلوں سے قائل نہیں ہوتے تو یہ کہہ کر انہیں خاموش کرنا چاہتے ہیں۔

"جن ضرورتوں کے لئے میں جاتا ہوں۔ ملک ان کا محتاج ہے۔ اور قوم کو خیال نہیں۔ لیکن ہوگا۔ ایک عرصے کے بعد۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کام کو کر جاؤں۔"

یہ فقرے صرف ایک انشا پرداز یا ادیب کے نہیں۔ بلکہ ایک غم خوار مصلح اور ماہر تعلیم کے ہیں۔ جو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ایک مدت سے جو کچھ خدا دیتا۔ اس میں سے کم خرچ کرتا۔ خانہ بربادوں کی طرح گذران کرتا اور صرف اپنے مبارک ارادے سے خانۂ دل روشن کرتا تھا۔

آزاد کی اصلاحی کوششیں جدید نظم اردو کی بنیاد ڈالنے کے بعد سے تمام ملک پر روشن ہو چکی تھیں تعلیم نسواں اور دوسری اصلاحی تحریکوں میں بھی آزاد پیش پیش تھے۔ مگر ان کی اصلاح صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہی۔ ایران کے دیہات میں جب عالموں اور فاضلوں کو گمنامی کی زندگی بسر کرتے دیکھتے۔ تو انہیں اپنی اولاد کو طہران یونیورسٹی میں تعلیم دلانے کا مشورہ دیتے۔ آزاد ہندوستان میں مغربی اثر کا بڑھنا ہوا اتنداد اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے۔ ان کے سامنے دہلی کی قدیم علمی اور ادبی صحبتیں برباد ہو چکی تھیں۔ اور ان کی جگہ پنجاب میں یونیورسٹی اور کالجوں کو قائم ہوتے انہوں نے خود دیکھا تھا۔ یہ زمانے کے نبض شناس تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ ایران میں بھی یہ فضا چند روز کی مہمان ہے۔ ان کی نکتہ رس نگاہوں نے طہران کی بدلتی ہوئی فضا دیکھ کر فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ آئندہ ایران میں بھی وہی ہونے والا ہے۔ جس کا تجربہ یہ خود ہندوستان میں ۵۷ء کے انقلابات کے بعد کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے سیر ایران انیسویں صدی کے آخری ربع کے ایران کی دلچسپ داستان ہے۔

اس سفر میں ایک کمی ہمیں نمایاں نظر آتی ہے کہ تمام سفر نامے میں عوام سے ملنے جلنے اور ان کے رہنے سہنے کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ لیکن آزاد صرف ایک مقصد کے لئے گئے تھے۔ اور یہ مقصد انہیں ایک خاص طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس بات کا کبھی دھیان نہیں کیا تھا۔ کہ یہ ایران کی معاشی اور سیاسی تاریخ لکھنے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس کمی کو ہم نظر انداز کر سکتے ہیں۔

تنقید میں نقطۂ نگاہ کی اہمیت

شوکت سبزواری

تنقید ایک صنفِ فن ہے جس سے اچھا اور مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب صحیح تنقیدی شعور سے کام لے کر تنقید میں باقاعدگی پیدا کی جائے۔ اور ایک فن کی طرح اس کی عمارت ٹھوس علمی بنیادوں پر استوار ہو۔ تنقید کو باقاعدہ بنانے کے معنی یہ نہیں۔ کہ تنقید کے اصول نہیں، شعر فہمی کے بندھے ٹکے قاعدے ہیں۔ کچھ پیمانے ہیں۔ جن کی مدد سے شعر یا نثر پارے کو ناپ کر اس کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ سونے اور چاندی کے پرکھیا کے پاس ایک کسوٹی ہوتی ہے جس پر رگڑ کر وہ کھوٹے کھرے کی جانچ کر لیتا ہے۔ تنقید کے اصول بھی کسوٹی کی طرح ہیں۔ جن پر شعر کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ یہ اصول اگر طے ہو جائیں تو تنقید میں باقاعدگی آ جائے۔ اور وہ ایک مفید اور علمی بنیادوں پر استوار فن کی حیثیت اختیار کرے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ تھا جب تنقید کے اصول مقرر تھے۔ جن پر شعر کو پرکھا جاتا تھا۔ اور جو ان اصولوں کو جانتے تھے۔ وہ نقّاد کہلاتے تھے۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے تھے لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب تنقید لفظوں کی جانچ پرکھ اور ترکیب کی ناپ تول سے آگے نہ بڑھی تھی نقاد کلمے کی فصاحت اور کلام کی بلاغت کے فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ اب تنقید بہت آگے بڑھ گئی ہے اب اس میں زندگی کی سی وسعت آگئی ہے۔ آج چند اصول مقرر کر کے انہیں معیارِ نقد قرار دینا ایسا ہے جیسے چھتیس انچی گز کی مدد سے اس وسیع اور پہناور کائنات کی وسعتوں کو ناپنا۔ آج کسی طرح بھی تنقید کے بندھے ٹکے اصول نہیں ہو سکتے۔ پھر تنقید میں باقاعدگی اور ایک فن کی سی استواری کس طرح پیدا ہو؟

اس سوال کا جواب مختلف نقادوں نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ یہ نقاد مختلف نقطہ ہائے نگاہ کے مالک تھے۔ وہ زندگی کو جن زاویوں سے دیکھتے تھے شعر و ادب کے کارناموں کے پرکھنے میں انہی زاویوں سے انہوں نے کام لیا۔ اس لئے ہر ایک نے اپنی تنقید کا معیار الگ بنایا۔ میرے خیال میں اس سے تنقید کی حیثیت واضح نہیں ہوتی۔ اور نہ اس میں باقاعدگی آتی ہے۔ تنقید میں باقاعدگی اسی وقت آسکتی ہے۔ جب زندگی کی بابت ان نقادوں کے زاویۂ نگاہ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اور معیارِ نقد مقرر کرنے سے پہلے اس نقطۂ نگاہ کی حقیقت دریافت کر لی جائے جو اس معیار کے لئے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح تنقید کے بندھے ٹکے اصول نہیں۔ اس کا کوئی قطعی معیار

بھی نہیں۔ معیار یا تو چند اصولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں اصول نہ ہوں۔ وہاں مجموعہ کہاں ہو سکتا ہے۔ یا معیار ایک جامع اور کسی قدر مبہم اصول کا نام ہے جو اپنی جامعیت اور ابہام کی وجہ سے نہ تو واضح ہی ہے۔ اور نہ قطعی۔ نہ منطق کے اصولوں کی سی روشنی اس میں پائی جاتی ہے۔ اور نہ کپڑے کے گز کی سی قطعیت۔ مثلاً حسن کاری، یا افادیت، یا زندگی کی تنقید۔ یا سماجی شعور وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کو معیار نقد قرار دیا گیا ہے۔ کسی کے نزدیک حسن کاری ادب ہے۔ کسی کے نزدیک افادیت، کوئی زندگی کی تنقید کو ادب بتاتا ہے۔ اور کوئی سماجی شعور کو۔ حسن کاری کی حدود کیا ہیں؟ افادیت کسے کہتے ہیں؟ زندگی کی تنقید کا معیار کیا ہونا چاہیئے؟ سماجی شعور کی اساس کیا ہے؟ ان میں سے کوئی چیز بھی واضح نہیں تنقید کے اصولوں کی طرح ان میں سے کسی معیار کے بھی بندھے ٹکے اصول نہیں بتائے گئے۔

ادب کے متعلق دو بڑے نقطہ نگاہ ہیں جن پر تنقیدی نظریوں کی بنیاد قائم ہے۔ ایک نقطہ نگاہ تو یہ ہے۔ کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے جسے زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ادب خود ایک مستقل اور آزاد نظام ہے۔ اسکا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ سارے زندگی کا ناتا جوڑنے والے آجکل اکثریت میں ہیں اور انکے نقطہ نگاہ کو آہستہ آہستہ سبھی مانتے جا رہے ہیں یہ ادیب کو زندگی کا پرتو سمجھتے ہیں اسلئے انکا خیال ہے کہ آج زندگی میں جو تنوع ہے جو رنگا رنگی ہے۔ ادب میں بھی وہی تنوع اور رنگا رنگی پائی جانی چاہیئے۔ ان کے نزدیک ادب کی کسوٹی خود زندگی ہے۔ زندگی کے تمام گوشے ادب کا موضوع ہیں۔ اس کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کو ادب میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ زندگی میں سادگی بھی ہے۔ اور پرکاری بھی چہل پہل بھی ہے۔ اور رس جس بھی۔ یہ سادگی، پرکاری، چہل پہل، رس جس ادب میں بھی سمویا جا سکتا ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان ہی نہیں نقاد بھی ہے۔ اس میں زندگی کی تصویر کشی ہی نہیں کی جاتی، زندگی کی تنقید اور اصلاح کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے

لیکن اتنا کافی نہیں۔ زندگی کی بابت ان کا نقطہ نگاہ کیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے۔ اور ان کی تنقید کی حیثیت متعین کرنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ان کا یہ نقطہ نگاہ کہاں تک حقیقت کے مطابق ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے۔ جب اسے پرکھ کر دیکھا جائے اس کا براہِ راست ادبی تنقید سے تعلق نہ سہی۔ لیکن پھر بھی اس کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ اس مکتبِ خیال کے تنقیدی فیصلوں کا دارومدار جس نقطہ نگاہ پر ہے۔ اگر اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔ تو اس کا اثر تنقیدی فیصلوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ کہ زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک مادی، دوسرے غیر مادی۔ زندگی کی تعمیر جن دو کائناتی عناصر سے ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک مادہ ہے۔ دوسرے قوت۔ جسم مادہ کا مظہر ہے۔ اور ذہن قوت کا۔ جسم کثافت ہے۔ اور ذہن لطافت۔ یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد ایک مکتبِ خیال کے نقاد زندگی کے مادی عنصر یعنی کثافت کو اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ مادہ قوت سے پہلے ہے۔ اول اول مادہ تھا۔ قوت بعد میں رونما ہوئی۔ بلکہ قوت مادہ سے الگ اور اس سے مختلف کوئی حقیقت نہیں۔ وہ مادے کی کسی قدر لطیف صورت کا نام ہے اس میں تو شاید ہی کسی کو شبہ ہو کہ مادے کے تقدم و تاخر کا سوال براہِ راست تنقید سے متعلق نہیں۔ وہ طبیعات کا مسئلہ ہے جسے نقاد کی بجائے ماہر طبیعات ہی حل کر سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادبی نقاد محض ادب و شعر کے نقاد نہ تھے۔ فلسفہ، نفسیات، اور طبیعات کے ماہر بھی تھے۔ اس لئے انہوں نے اگر مادے کے تقدم کا دعوےٰ کیا۔ اور اسے اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد ٹھہرایا۔ تو کچھ سوچ سمجھ کر اور جانچ پرکھ کر ہی کیا۔ جس طرح ادبی تنقید ان کے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح ان کے تنقیدی نظریئے اور ان کی اساس بھی ان کی ذاتی کنج کاوی کی پیداوار ہے۔ لیکن اردو کے شاعروں نے اس بنیادی نظریہ کو کیسے اپنایا؟ وہ ان کے ذاتی فکر اور کاوش کا نتیجہ نہ تھا۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ فلسفہ اور سائنس کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد آج بھی اس نقطہ نگاہ کو صحیح نہیں سمجھتی۔

مادہ اور قوت اگر، توام ساتھ ہیں۔ تو یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ کہ ان میں سے مقدم کون ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا۔ جیسے کوئی یہ طے کرنے بیٹھ جائے کہ دن پہلے ہے یا رات۔ اصل سوال حقیقت کا ہے۔ زندگی کی حقیقت مادی ہے یا غیر مادی۔ فیصلہ جدید طبیعات کی رو سے کیا جا سکتا ہے

اور اس کا ایک افادی پہلو بھی ہے۔ اگر یہ طے ہو جائے۔ کہ زندگی کی حقیقت غیر مادی ہے۔ تو ادب میں مادی مطالبوں کو جو غیر معمولی اور اپنی حیثیت سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ قدرتی طور پر ان کی وہ اہمیت نہ رہے گی۔ اور اس کا ادب کے دوسرے مادی نظریوں پر بھی اثر پڑے گا۔ نیوٹن کے زمانہ تک مادے اور زندگی کے مادی عنصر کی بڑی اہمیت تھی۔ اس وقت تک مادے کو ایک ٹھوس چیز سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال عام تھا۔ کہ مادہ مقدار رکھنے والے چھوٹے چھوٹے ذرات کا نام ہے۔ جو اتنے سخت اور دبیز ہیں۔ کہ نہ وہ کٹ سکتے ہیں۔ اور نہ بٹ سکتے ہیں۔ مادی دنیا کی بنیاد یہ ذرات ہیں جو مادہ کی تین ابتدائی صفات یعنی وزن، صلابت اور حجم (ابعاد) کے حامل ہیں۔ لیکن جدید طبعیات کے نظریہ اضافیت و کمیت نے نیوٹن اور ڈالٹن کے قدیم طبعیاتی نظریہ کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ اور جدید تجربات نے یہ ثابت کر دکھایا۔ کہ ذرات کی کوئی اصلیت نہیں۔ جسم کی ترکیب برقی لہروں سے ہوئی ہے۔ جنہیں آئنسٹائن کے لفظوں میں "باہم پیوستہ واقعات کا نظام" اور پروفیسر وائٹ ہیڈ کے لفظوں میں "عضویہ" کہہ سکتے ہیں۔ برقی لہروں کی تعمیر میں منفی اور مثبت دو قسم کی لہریں شامل ہیں۔ جدید طبعیات کی رُو سے زندگی کی حقیقت برقی لہر یا قوت کا بہاؤ ہے۔ اس نظام میں مادے کا درجہ بہت بعد میں آیا۔ اور یہ ترکیب کا نتیجہ تھا۔ برقی لہر سے برقی پارے بنے اور برقی پاروں کی ترکیب سے ذرے وجود میں آگئے۔ اور آخر میں ان ذرات کے اجتماع سے اجسام کی دنیا خلق ہوئی۔ نئی طبعیات میں زندگی کی اصل لطافت ہے۔ کثافت کو لطافت نے اپنی رُو نمائی کا سہارا بنایا۔ غالب اُردو کا غزل گو شاعر ہے۔ اس نے جدید طبعیات کے اس نظریہ کو اپنی تخیل کا رنگ دے کر اس طرح پیش کیا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۔ چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

مولانا رومیؒ یہی بات اس سے پہلے اپنے سیدھے انداز میں کہہ چکے تھے۔

پیکر از ماست شد نے ما ازو ! باده از ماست شد نے ما ازو !

اردو کے سب سے بڑے مفکر شاعر اقبالؒ کا خیال بھی یہی ہے۔

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ! ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

اردو کے نقاد یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کہ زندگی کی اصل حقیقت مادہ ہے یہ ان کی اپنی دریافت ہے۔ یہ بات وہ ایک خاص خیال کے مادہ پرست مفکروں کی تقلید میں کہتے ہیں۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ ہمارے بزرگ زندگی کی بابت جو نظریہ رکھتے تھے۔ جدید طبعیات نے اس کی توثیق کر دی اردو کے مادہ پرست نقادوں کو ایک خاص خیال کے مفکروں کی تائید محض جذباتی طور پر کرنا زیب نہیں دیتا۔ علمی مسائل میں ہمارے بزرگ بھی جذبات سے کام لیا کرتے تھے۔ اگر بزرگوں سے اختلاف کرنا ہی "صاحب نظری" ہے۔ تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ زندگی کی بابت وہ اپنے اس مادی نظریہ کے اظہار میں جذبات سے کام نہ لیں۔ بلکہ دلائل کی روشنی میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

یہاں ایک اور بحث سامنے آتی ہے۔ جس کا تعلق تنقید کے بعض اہم نظریوں سے ہے۔ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اکثر نقاد یہ کہتے سنے جاتے ہیں۔ کہ ارتقا رجعت پسند انہ نظریہ ہے۔ ہم انقلاب کے ماننے والے ہیں۔ لیکن یہ نقاد کبھی ارتقا کی وضاحت نہیں کرتے۔ اور انقلاب و ارتقا میں جو نازک فرق ہے۔ اس کا ذکر بھی وہ نور اکم کرتے ہیں۔ عام طور سے ارتقا اور انقلاب میں فرق مدت کی کمی بیشی سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے۔ کہ جس تبدیلی میں وقت کم لگے وہ انقلاب ہے۔ اور جس میں زیادہ وقت لگے وہ ارتقا ہے۔ یہ غلط ہے۔ مدت کی کمی بیشی کوئی معیار نہیں۔ خود ارتقا کی صورت میں کہیں زیادہ وقت لگتا ہے۔ اور کہیں کم۔ ایک تخم جو زمین میں ڈالا جاتا ہے۔ اکثر چھ ماہ کی مدت میں ایک سرسبز اور لہلہاتے ہوئے کھیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن بعض تخم ایسے بھی ہیں جن کے برگ و بار لانے میں سال دو سال سے کم مدت نہیں لگتی۔ ارتقا اور انقلاب، دونوں

کی حقیقت تبدیلی ہے۔ تغیر ایک ایسا عنصر ہے۔ جو دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن ارتقا میں تغیر آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتا ہے۔ اور انقلاب میں یک بیک اور دفعتاً۔ ارتقا کی صورت میں بدلنے والی چیز کے درمیانی مدارج بھی ہوتے ہیں۔ انقلاب میں ان درمیانی مدارج کی گنجائش نہیں۔ ایک بچے کی پیدائش کی مثال لیجئے۔ اوّل اوّل وہ ایک پانی کا قطرہ تھا۔ جس نے پہلے ایک پھٹک کی شکل اختیار کی۔ پھر گوشت کے لوتھڑے کی۔ اس کے بعد پٹھے اور ہڈی کی تہیں چڑھیں۔ اس کے بعد کھال کا پردہ آیا۔ اور آخر میں جان پڑ گئی۔ بالکل یہی کیفیت تخم کی ہے۔ زندگی میں ارتقا ہے۔ آج تک انقلاب نہیں دیکھا گیا۔ ڈارون نے انسان کی پیدائش کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اور جسے دنیا کے سبھی ماہرین حیاتیات نے صحیح مانا ہے، وہ بھی ارتقا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندو فلسفی نظریۂ انقلاب یا کون و فساد کے قائل ہیں۔ اور بعض سامی مذاہب کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ یہ کہتے ہیں۔ کہ سب سے پہلا انسان یک بیک وجود میں آیا۔ اور درمیان کی تمام ارتقائی منزلوں کو پھلانگ کر وہ شعور کی آخری سرحد پہ پہنچ گیا۔

الجھنیں بہت ہیں۔ کوئی کہاں تک سلجھائے۔ یہ طبیعاتی ارتقا کا ذکر تھا۔ معاشرے کا ارتقا بھی انہی خطوط کے برابر برابر ہوا ہے۔ زندگی میں پیچیدگیوں کے باوجود ایک طرح کی ہمواری ہے۔ جنہیں قوموں کے عروج و زوال اور انسانی معاشرے کے مدوجزر کی داستانیں یاد ہیں۔ وہ فطرت اور تاریخ دونوں میں ارتقا کے قائل ہیں۔ آج تاریخ کی رفتار ترقی پہلے کے مقابلے میں تیز بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک کوئی قوم معاشری ارتقا کی تمام درمیانی منزلوں سے نہیں گزر لیتی۔ وہ جمہوریت اور مساوات کی آخری منزل پر نہیں پہنچتی (اور یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آخری منزل ہے) اس میں شبہ نہیں کہ انسانی مساوات کی منزل ابھی دور ہے۔ آج دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں۔ جو جمہوریت کے احساس سے محروم ہیں۔ اور ایسی قومیں بھی ہیں۔ جو اس سے آگے بڑھ کر معاشی مساوات کے قریب پہنچ چکی ہیں۔ اس سے آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ جب تک کسی معاشرہ میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ صرف چند افراد کی کوششیں اسے آگے بڑھانے یا انقلاب لانے میں مستقل طور سے نہ کبھی کامیاب ہوئی ہیں۔ اور نہ آج اس کی امید ہے۔

ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرے کی تاریخی رفتار میں ارتقا کا امکان نہیں۔ دوسری طرف پرانے اور نئے نظام حیات کے درمیان ایک عبوری دور بتایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ عبوری دور کا امکان صرف ارتقا کی صورت میں ہے۔ اگر معاشرے کی تاریخ ارتقا کے لئے ناسازگار ہے۔ اس میں صرف انقلابی طوفان اٹھتے ہیں، اور انقلاب کے ہنگامہ خیز زلزلے آتے ہیں۔ تو اس میں کسی طرح بھی عبوری دور کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اور اگر نکل سکتی ہے تو صرف اس وقت جب زندگی کے رواں دواں کارواں کو کسی ایک مقام پر ٹھہرا دیا جائے۔ جو زندگی کی تغیر پذیر اور سفر پسند فطرت کے خلاف ہے۔ ماتبال کو لوگ رجعت پسند بتاتے ہیں۔ لیکن اس نے ذیل کے شعر میں زندگی کی جو فطرت بتائی ہے۔ اس پہ اس زمانہ کی ترقی پسندی کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

ارتقا کی حالت میں زندگی درجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔ اس لیے جب تک وہ آخری منزل پہ نہ پہنچ جائے یہی کہا جائے گا۔ کہ وہ عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ بیچ کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اگر زندگی ایک منزل سے دوسری منزل تک جست لگا کر پہنچتی ہے اور زندگی کی رفتار تیز ہو جانے کی وجہ سے آگے بڑھنے کی اب صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔ (اور یہی انقلاب ہے۔) تو عبوری دور کا امکان اس صورت میں ہوگا۔ کہ زندگی کسی منزل پہ اتنی مدت تک ٹھہر جائے۔ کہ اس کی تازگی جاتی رہے یہ سکون ہے۔ اور یہ زندگی کے مزاج کو سازگار نہیں پھر عبوری دور کی جو علامت بتائی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نقادوں کے ذہن میں زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں وہ زندگی کی رٹ لگاتے ہیں لیکن اس کی فطرت اور مزاج سے ناواقف ہیں۔ زندگی کی فطرت میں تضاد کا وہی ہے جو اس کی روز افزوں ترقی پیچھل

ین کی ذمہ دار ہے۔ اگر زندگی میں باہم آویزش رکھنے والی کیفیات کا اجتماع نہ ہوتا، تو ہم اس کی فطرت کو جدلیاتی کبھی نہ کہتے۔ زندگی کے عناصر کی آویزش ہی اس کی جدلیت ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقت بے نقاب کرتے ہوئے عرض کیا تھا۔ کہ وہ ایک برقی رَو ہے۔ جس میں مثبت اور منفی دو طرح کی لہریں گھتی ہوئی ہیں۔ زندگی اصلیت کے اعتبار سے اگرچہ لطافت ہے۔ لیکن جلوہ نمائی کے لئے اسے کثافت کا سہارا لینا پڑا۔ ان دو متضاد کیفیتوں میں توازن برقرار رکھنا بڑا دشوار کام ہے۔ جب توازن بگڑتا ہے۔ تو زندگی سہارا ڈھونڈتی ہے یہی جدلیاتی عمل ہے۔

ادب کا زندگی سے جو ناتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ زندگی کی تضاد کاری کی جھلک ادب میں بھی نظر آئے۔ آج ادب میں جو متضاد نظریے زور پکڑتے جا رہے ہیں ہمارے نقاد اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ زندگی اس وقت عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ ابھی ہم کسی منزل پر نہیں پہنچے اس لئے ہمارے ادبی نظریوں میں تضاد ہے۔ ہم میں مختلف میلانات پائے جاتے ہیں۔ جن میں بظاہر سمجھوتہ ناممکن رہے۔ انفرادیت و اجتماعیت روایت و بغاوت۔ واقعیت و تخیلیت، مقصدیت و رومانیت، داخلیت و خارجیت۔ جدّت و قدامت، مادیت و روحانیت۔ یہ متضاد نظریے اگر ہماری موجودہ زندگی کی الجھنیں اور آزمائشیں ہیں۔ تو ہمارے ادیب مطمئن رہیں۔ وہ ان آزمائشوں سے کبھی نجات نہ پا سکیں گے۔ وہ انہیں عبوری دور کے مذبذب کی پیداوار کہہ کر ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے یہ متضاد نظریے ضرور ہیں ان میں اختلاف اور آویزش مسلّم ہے۔ لیکن یہ عبوری دور کی پیداوار نہیں۔ ان میں زندگی کی تضاد کاری ہے۔ زندگی کے متضاد پہلوؤں کی جھلک ہے۔ ان متضاد میلانات میں توازن قائم رکھنا ادب ہے ان الجھنوں سے سلجھن پیدا کرنا ادب ہے۔ ان کے بیچ و خم کو قائم رکھتے ہوئے ان میں سے سیدھی راہ نکال لینا ادب ہے۔ یہ بھول بھلیاں ضرور ہے لیکن کامیاب وہ ہے۔ جو اس بھول بھلیاں سے بچ کر نکل آئے۔ اور اس میں کھو نہ جائے۔ اس میں کھو جانے والے یہ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ اس کو توڑ پھوڑ کر نئی راہ نکال سکیں گے۔ یہ زندگی سے منہ موڑنا ہے۔ دریا کی موجوں سے ٹکرانا زندگی ہے۔ موجوں کی تاب نہ لا کر ساحل پر جنگل آرائی کرنے والے زندہ نہیں۔ "زندگی طرب گاہ خسرو نہیں کوہ بے ستوں" ہے۔ زندگی کا ادب طرب گاہ خسرو کا مزدور نہیں ہوتا۔ کوہ کن ہوتا ہے۔ آج کے بے بصر ادیبوں سے تیز نظر تو وہ شاعر تھا جو زندگی کی تضاد کاری کی وضاحت کرتے ہوئے کہہ گیا تھا۔

زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است

اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ شو!!

یہاں نئی نسل کی ایک ذہنی الجھن سلجھاتے چلیں۔ جوش کے لفظوں میں یہ بخشکان خامئی ہی در اصل آج کے اردو ادب کی ساری ابتری اور اردو تنقید کی افراتفری کے ذمہ دار ہیں۔ زندگی کے مزاج کو پہچان کر ہی ہم ادبی نظریوں کی چھان پھٹک کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے تین سلسلے ہیں فطرت معاشرہ اور ادب۔ فطرت ان میں مقدم ہے۔ معاشرے کی بنیاد فطرت پر ہے۔ اور ادب کی بنیاد معاشرے اور فطرت دونوں پر۔ فطرت نے جب ارتقا کی طرف قدم بڑھایا۔ تو بالکل ابتدائی فطری تقاضوں نے ابتدائی معاشرے کو جنم دیا۔ اور جیسے جیسے انسان حیوانی افق سے انسانی افق کی طرف بڑھتا گیا۔ معاشرے میں ترقی کے آثار رونما ہوتے گئے۔ ایک زمانہ تھا جب انسان برہنہ تن گپھاؤں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اور کچا گوشت کھا کر اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ اس وقت اس کی زندگی کی ضرورتیں جیسی سادہ اور ابتدائی قسم کی تھیں۔ اس کا معاشرہ بھی اتنا ہی سادہ اور ابتدائی تھا اس کی ابتدائی ضرورتیں اس کے جبلی تقاضوں تک محدود تھیں۔ لیکن مل جل کر زندگی گزارنے کی وجہ سے کچھ نئی اجتماعی ضرورتیں وجود میں آئیں جنہوں نے نئے تقاضوں کو ایجاد کیا۔ یہ نئے تقاضے سماج کی پیداوار تھے۔ خاص سماجی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ اس لئے ان کی اساس سماج قرار پایا لیکن خود سماج کی اساس فطرت تھی۔ فطری اور جبلی تقاضوں نے انسان کو مل جل کر مشترکہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس لئے کہ بالواسطہ ہی فطرت کو بھی سماجی تقاضوں کی تمدنی پیداوار کی اساس قرار دینا ہوگا۔ ادب سماج کی اعلیٰ تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس لئے صحت مند ادبی نظریہ وہ ہے کہ ادب کے جدید رجحانات فطرت کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ اور معاشرے کے ارتقائی رُخ متعین کرنے میں ہماری مدد کریں

فطرت کا مزاج کیا ہے؟ اس سوال کے جواب پر ہمارے تمام تنقیدی نظریوں کی بنیاد ہے۔ اس لئے اس کی تعیین تنقید سے پہلے ہو جانی چاہیئے۔ اردو کی جدید تنقید میں آج کل دو نظریے زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک معاشی جو کارل مارکس کی طرف منسوب ہے۔ دوسرے جنسی جو فرائڈ کے ذہن کی تخلیق ہے۔ ان نظریوں کی بنیاد انسان کی دو ابتدائی اور فطری خواہشیں ہیں۔ ایک تلاش معاش دوسرے جنسی تجسس۔ میں نے ان خواہشوں کو فطری اس لئے کہا۔ کہ ان کی پیدائش میں سماجی تقاضوں کو دخل نہیں۔ انسان یہ خواہشیں حیوانی زندگی کے دور سے اپنے ساتھ لایا۔ جو انسانی دُنیا میں قدم رکھنے کے بعد بھی اگرچہ برقرار ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت یہاں آکر ذرا بدل گئی۔ اول اول انسان کی زندگی کا مقصد اپنی ان خواہشوں کی تکمیل تھا۔ اس کے بعد غذا کو اس نے بقائے شخص کا وسیلہ سمجھا۔ اور جنس کو بقائے نوع کا۔ اول اول یہ خواہشیں مقصد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بعد میں یہ ایک اور اچھے مقصد کا ذریعہ بنیں۔ انسان نے حیوانی درجے سے ابھر کر انسانی درجے میں قدم رکھا۔ اس لئے شروع میں حیوان اور انسان میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ حیوان کی طرح وہ جبلّت کا غلام تھا۔ اس کے سارے تقاضے پیدائشی قسم کے تھے۔ بھوک، گرمی، سردی، جسمانی تکلیف کا وہ صرف احساس کر سکتا تھا۔ جب وہ اس دور سے آگے بڑھا۔ تو احساس نے نکھر کر جذبے کی شکل اختیار کی۔ اور اس میں محبت، نفرت، غم و غصّہ، ایثار و قربانی وغیرہ اعلیٰ پاکیزہ جذبات نے پرورش پائی۔ اس کے بعد عقل کے نشوونما پاتے ہی اس کی دُنیا بدل گئی۔ اور دل پر عقل کا پہرہ بیٹھ گیا۔

آئی اے رچرڈس نے مذہب کو پرانی نسل کی الجھن بتایا ہے۔ اور جنس کو نئی نسل کی۔ اس لئے میں نئی نسل کی الجھن کو لے کر اس مسئلے کو سلجھانا چاہتا ہوں۔ انسان اول اول عورت کو۔ غذا کی طرح۔ جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اور ہر حسین اور ہر بھدی صورت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس وقت تک اس جنس لطیف نے اس کے دل میں محبت کی جوت نہ جگائی تھی۔ محبت نے اسے اپنا مالک بنایا۔ پہلے وہ ہر شمع کا پروانہ تھا۔ اب ایک دیوی کا پجاری بنا۔ جس کی قربان گاہ پہ اس نے اپنا سب کچھ چڑھایا۔ اسی زمانے سے عورت اور مرد میں نباہ کے عہد و پیمان استوار ہوئے۔ لیکن جب تک انسان پر صنفی محبت کا بھوت سوار رہا وہ ہر عورت کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ جب ترقی نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ تو اس نے ماں، بہن، بیوی میں فرق کیا۔ اس سے پہلے فراعنۂ مصر بہنوں سے شادیاں کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ شادیاں ممنوع قرار پائیں۔ یہ جذبۂ محبت کی تہذیب تھی۔ صنفی محبت کے جذبے کی تہذیب بھی ہوئی۔ اور اس کی مثالیں بھی ہمیں پرانی تہذیبوں میں ملتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں عورت کو دیوی (معبودہ) کہا جاتا تھا۔ اور کہیں کہیں ناکتخدا لڑکیوں کی پرستش کا رواج بھی تھا۔ ہست و پدیش۔ اور پنچ تنتر کی بعض کہانیاں ہندوؤں کے اس عقیدے اور عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یورپ کے رومانی عہد میں ہمیں بڑے بڑے سورما عورت کے نام پر جھتیں سر کرتے نظر آتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے اشعار میں عرب کے سرباندوں کو عورت کی نظر میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاتے دکھایا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت کا مزاج ابتدائی فطری تقاضوں کی تحسین و تہذیب ہے جو معاشری ارتقاء کے قدم بہ قدم ہوئی۔ اور ادب، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، سماج کے تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس لئے تہذیب (یا تطہیر) فطرت کا مزاج ہی نہیں۔ سماج کا ارتقائی رُخ اور ادب کا منہاج بھی ہے۔ جو لوگ ادب کی بنیاد ابتدائی جنسی جذبے یا غذا کو قرار دیتے ہیں۔ وہ الٹے پاؤں پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ اور حیات و کائنات ساتھ لے چلنے کی جگہ اسے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ یہ اگر ترقی ہے تو معکوس قسم کی۔ شاعر انقلاب جوش نے ذیل کے شعروں میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

جیف دل کو شکست زنداں نے
کر دیا نسل تازہ سے مایوس

وائے بر وضعِ شاعرانِ جدید
واگ لکھنؤ زبانہ گھٹی چوس
ان کے اسلوب میں یہ سعی بلیغ
اہتمامِ ترقی معکوس

جنسی نظریۂ حیات کے اثر سے عورت اردو کے نئے ادب میں اپنی پرانی جسمانی گرمیوں اور صنفی دعوتوں کے ساتھ آرہی ہے۔ اور ڈی۔ ایچ لارنس وغیرہ جنس زدہ ادیبوں کی تقلید میں ہمارے یہاں بیگر اور کلونت کور جیسے کردار تخلیق کئے جا رہے ہیں۔ انسان کی دبی ہوئی خواہشیں کریدی جا رہی ہیں۔ سویا ہوا حیوان جاگ رہا ہے۔ اقبالؔ نے اردو ادب کے اسی رجحان کو دیکھ کر کہا تھا:۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس!
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

غذائی نظریۂ حیات کی برکت سے آج روٹی انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی جگہ لے چکی ہے۔ ہر خیال کی اچھائی اور برائی کا معیار اب صرف روٹی بن گئی ہے۔ مارکس نے جب یہ کہا تھا۔ کہ اپنے ماحول کے ساتھ میرا تعلق ہی میرا شعور ہے" تو اس کا مقصد یہ نہ تھا۔ کہ شعور ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ شعور اور ماحول کے تعلق پر زور دینا چاہتا تھا۔ ماحول سے وابستگی اس کے پیش نظر تھی۔ اور اس زمانہ کی تخیل پرستی کو دیکھتے ہوئے ماحول پر زور دینا کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ لیکن اس کا مطلب آج یہ لیا جا رہا ہے کہ ادیب اپنے ماحول سے چمٹا رہے اور اس سے بلند ہو کر نہ دیکھے۔ یہ ادب کی غایت، فطرت کے مزاج، معاشرے کے ارتقائی رُخ، سے ناواقفیت ہی نہیں، مایوس کن ذہنی نارسائی بھی ہے۔

زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں!

زندگی پر جھپٹنا نہ ماحول سے چمٹنا ہے۔ اور نہ جسم سے لپٹنا۔ یہ اعلیٰ اخلاقی اور روحانی قدروں کے مطابق اس کو ڈھالنا ہے۔ اس کے لئے فکر کی پرواز اور بقول گورکی واقعات کی سطح سے بلند ہو کر واقعات پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے ہماری نئی نسل محروم ہے۔ مارکس اور اس کے ہم خیال مفکروں نے فکر کی پرواز کو لامرکزیت سے بچانے کے لئے ماحول اور حقیقت پر زور دیا تھا۔ بقول اقبالؔ ع

آنکھ طائر کی نشیمن پہ رہی پرواز میں

یہ نیبرے پر وبال رقص دکھانے والے طاؤس" طائر فکر کو پر نیخ کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ادب اور سیاست کا فرق واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سیاست میں براہ راست تبلیغ ہوتی ہے۔ اور ادب میں بواسطہ ادب عوام کے ذہن کی تربیت کرتا ہے۔ اور انھیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ آنے والی تبدیلی کو قبول کر سکیں۔ سیاست شورش بپا کرکے انقلاب لاتی ہے۔ اور انقلاب جیسا کہ پریم چند نے لکھا ہے، صحت مند طریقوں کی ناکامی ہے۔ ادب زندگی اور معاشرے کا خادم ہے۔ ہمارے ادیب اسے سیاست کا پرستار بنانا چاہتے ہیں۔ یہ خود ادب کسی نظریۂ ادب کے منافی ہے۔ ٹراٹسکی نے اپنی مشہور کتاب ادب اور انقلاب میں ادیب کا اپنے ماحول سے تعلق بتاتے ہوئے کہا تھا۔ فنی تخلیق فن سے باہر وجود میں آنے والے جدید محرکات کے زیر اثر قدیم ہیئتوں کو پیچیدہ انداز سے الٹ کر کام لینے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے فن کی حیثیت ایک خادم کی سی ہے۔ یہ کوئی ایسا منقطع عضو نہیں جو خود اپنے کو کاٹ کاٹ کر کھائے۔ یہ ایک متمدن انسان کا کل ہے جو اپنی زندگی اور ماحول سے غیر منقطع طور پر وابستہ ہے"۔

ایک متمدن انسان کی ماحول سے وابستگی اس قسم کی نہیں ہوتی — یا نہیں ہو سکتی۔ جس قسم کی وابستگی ایک غیر متمدن انسان کی اپنے ماحول سے

ہوتی ہے۔ انسان کبھی ماحول کی پیداوار تھا۔ آج وہ اس کا خالق ہے۔ اپنے ماحول پر پیہم سخت جنگ و پیکار کے بعد اسے حاصل ہوا ہے۔ تسخیر فطرت اس طویل جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ ادب نے اس جنگ و پیکار میں انسان کا قدم قدم پر ساتھ دیا۔ آج بھی اسے انسان کا معاون ہونا چاہیئے۔ آج بھی اسے انسان کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ کرنا چاہیئے۔ انسان کی ضرورت قدر نہیں۔ اس کی تہذیب قدر ہے پانی پینا قدر نہیں۔ خشک زمین سے پانی کے چشمے نکالنا قدر ہے۔ ماحول سے چمٹے رہنا قدر نہیں۔ اس کو ڈھالنا، بنانا اور سنوارنا قدر ہے۔ ادیب کو قدروں کا خالق اور ان کا محافظ ہونا چاہیئے۔ یہ زندگی کی خدمت ہے ـــــ زندگی کو آگے بڑھانا ہے۔ روٹی کو زندگی کی قدر قرار دینے والے زندگی کو آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ روٹی سیاست کی قدر ہو سکتی ہے۔ زندگی کا سہارا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ نہ زندگی کی قدر ہے نہ ادب کی۔ جنسی خواہش انسان کی فطرت ہے جس طرح غذا اس کی فطرت ہے۔ لیکن یہ دونوں جسم کے مطالبے ہیں۔ اور انسان جسم ہی نہیں شعور بھی ہے۔ بلکہ جسم سے زیادہ شعور ہے۔ شعور نے انسان کو جنسی خواہش سے احساس جمال تک پہنچایا۔ اور غذا کی طلب سے اخلاقی توانائی تک۔ ادب کو جمال، قوت، اور حق و صداقت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ اقبال نے ذیل کے اشعار میں انسان کی انھیں قدر آفریں تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اگر زندگی سے فرار ادب نہیں تو زندگی کی دلدل میں پھنس کر رہ جانا۔ اور اس میں لوٹ لگانا بھی ادب نہیں ہو سکتا۔ آج کے سماج میں معاشیات کی جو اہمیت ہے۔ وہ مناسب ہے۔ لیکن ادب میں اس کو جو جگہ دے دی گئی ہے وہ نامناسب ہے۔ اس سے اخلاقی اور روحانی قدریں پس منظر میں جا پڑی ہیں۔ ادب میں سیاست آگھسی ہے۔ پھول کی پتی سے پتھر کا جگر کاٹا جا رہا ہے۔ سوئی سے پھاوڑے کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ ادب نہیں۔ ایک مشہور نقاد کے لفظوں میں یہ ایسا ہے۔ جیسے کسی پل کی تعمیر سے اصلاح اخلاق کا کام لینا یا گھٹنا مار کے آنکھ پھوڑنا۔ موجودہ نظام حیات اس قابل نہیں کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔ لیکن اس کی شکست و ریخت میں ادب کو اپنا مزاج، اپنا مقام اور اپنی روش فراموش نہ کرنی چاہیئے۔ ادب قدروں کا خالق ہے۔ سیاست کے میدان میں اترنا اور معاشی برکتیں ایک طبقے سے چھین کر دوسرے طبقے کے حوالہ کرنا۔ اس کو زیب نہیں دیتا۔ یہ اس کے مزاج و منہاج کے لئے ناساز گار ہے۔ اور بقول ہربرٹ ریڈ ننھی سی تتلی کو نرم و نازک پھول کی پتیوں سے اٹھا کر گھڑ گھڑانے والی مشین کے آہنی پہیئے پر بٹھانا ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ مارکس کے نزدیک تاریخ کا رُخ متعین کرنے والا تنہا عنصر معاشیات ہے۔ اس کے رفیق انگلز نے اپنے ایک خط میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ سیاست، قانون، فلسفیانہ نظریات، مذہبی خیالات بھی تاریخی مسابقات پر اثر ڈالتے ہیں۔ اور اکثر ان مسابقتوں کی شکل متعین کرنے میں غالب اور نمایاں حصہ لیتے ہیں؟ ادب بھی ان موثر عناصر میں سے ہے۔ ادب نے آج سے پہلے فلسفہ اور مذہب کا ساتھ دے کر ایک صالح انسانی تہذیب کی تعمیر کی تھی۔ آج بھی وہ یہ خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اگر ادب نے سیاست کی جگہ لی۔ اور اپنی ساری کوششیں غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لئے وقف کر دیں تو اس کی موت زیادہ دور نہیں۔ طبقاتی کشاکش ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی دفن ہو جائے گا۔

ادب کا براہِ راست معاشی مسائل میں دخل دینا اور طبقاتی اونچ نیچ مٹانے کا بیڑا اٹھانا ایسا ہے۔ جیسے مذہبی خیالات کی تبلیغ اور اخلاقیات کی نشر و اشاعت کا کام ادب سے لینا، دونوں ادب کے حلِ دخل سے باہر ہیں۔ ادب ابلاغ ہے تبلیغ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ معاشی تفاوت کو ادب کی حمایت حاصل نہ ہونی چاہیئے۔ ادب اپنی حدود میں رہ کر بھی ترقی پسند رجحانات کی رہبری میں حصہ لے سکتا ہے ادب کا کوئی خاص موضوع نہیں۔ ادب زندگی کا رفیق ہے۔ اس میں زندگی کی سی وسعت ہے۔ کسی ایک طبقے کے لحاظ سے، وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ کسی ایک موضوع کے ساتھ ادب کو مخصوص کر لینا ادب کی بلند فطرت کے خلاف ہے۔ ادب سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، آسان اور عام فہم زبان میں کہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی سطح سے اتر کر وہ بات کہے جو عوام چاہتے ہیں عوام کو اٹھانے کی بجائے خود گر جائے۔ ان کی ذہنی تربیت کو نظر انداز کر کے ان کے جسم پر تیل کی مالش کرنے لگے۔

مولانا اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے نظمیں لکھیں تو ان کی ذہنی سطح کے مطابق انہوں نے "کوا"، "ریل گاڑی"، اور "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال" جیسے سامنے کے موضوعات منتخب کئے۔ آج زندگی کے گوناگوں موضوعات میں سے کسان، مزدور، اور انتی اھتکوٹ، چین وغیرہ کو ادب کے لئے مخصوص کیا جا رہا ہے جس معنی میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری بچوں کی شاعری تھی۔ اس معنی میں آج کا اردو ادب عوام کا ادب ہے۔ وہ بھی محدود تھی یہ بھی محدود ہے۔ جوش کہتے ہیں۔

وہ دورِ عالم کا شاعر کیا!!
شعر بیں گونجتے ہوں جہاں دردِ دل
اسکے ذوقِ سخن کی دنیا ہیں!
صرف اک نفس ہے، نہ ماہ نہ پروین
ایک ہی میکدے میں سب بے ہوش
ایک ہی دائرے میں سب محبوس

رومن حروف کی آوازیں

شفیع منصور

رومن حروف کی جو شکل آج کل انگریزی زبان کے لئے مروج ہے، اس کا ہمارے علمی اور تعلیمی مسائل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ہمارا پورا انظامِ تعلیم انگریزی کے محور پر گھومتا ہے۔ ہمارے مدارس کی اعلیٰ جماعتوں میں بیشتر مضامین کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ پانچویں جماعت سے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے۔ پبلک اسکولوں میں تو بچے کو انگریزی زبان مادری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ چونکہ انگریزی زبان رومن حروف میں لکھی جاتی ہے، اس لئے ان حروف کی آوازوں کو جانچنا اور پرکھنا اور ان کے سیکھنے اور برتنے کی آسانیوں اور دشواریوں کا جائزہ لینا ہمارا ایک تعلیمی فرض ہے، اس فرض سے ہم کس حد تک عہدہ برآ ہوئے ہیں، یہ آپ خود سوچئے:

رومن حروف پر کئی حیثیتوں سے غور کیا جا سکتا ہے، مثلاً ان کا تدریجی ارتقاء، ان کی مختلف شکلیں جو اس وقت تک دنیا میں رائج رہی ہیں، ان کا تاریخی، تمدنی اور تہذیبی پس منظر، ان کا سیاسی تسلط اور اس کا اثر دوسری زبانوں پر، رومن حروف کی آوازیں اور ان کی جانچ پرکھ، یہ سب مسائل ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر رومن حروف کی آوازیں ہیں، کیونکہ تعلیمی نقطۂ نظر سے اس سوال کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ سوال اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ آیا رومن حروف کی آوازیں جو تحریر میں مطلوب ہوتی ہیں وہ ان کی داخلی اور فطری آوازیں ہیں یا خارجی اور من مانی۔ اگر یہ ان کی داخلی اور فطری آوازیں ہیں تو رومن حروف اپنی آوازوں کے قدرتی یا سائنٹیفک اشارے ہیں۔ اور اگر یہ صورت نہیں تو یہ حروف مطلوبہ آوازوں کے فرضی یا غیر سائنٹیفک اشارے سمجھے جائیں گے۔

اس نکتے کی توضیح کے لئے پہلے اردو حروف کی مثال پیش کی جاتی ہے، اردو کے حروف تعداد میں ۳۶ ہیں، ان میں ہمزہ کو ایک علیحدہ حرف کے طور پر شمار نہیں کیا گیا، کیونکہ ہمزہ اصل میں وہ الف ہے جو حروف کے درمیان یا آخر میں آتا ہے۔ یہ

گویا الف ہی کی ایک تحریری شکل ہے؛ باقی تمام حروف کی آوازوں کو اگر لفظی شکل میں لکھا جائے مثلاً ا کو 'الف' کی شکل میں اور ب کو 'بے' کی شکل میں، ج کو 'جیم' کی شکل میں اور د کو 'دال' کی شکل میں، اسی طرح باقی حرفوں کو، تو پتہ چلے گا کہ ایسے ہر لفظ کی ابتدا اسی حرف سے ہوتی ہے جس حرف کی آواز کو وہ لفظ ظاہر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُردو کا ہر ایک حرف اپنی آواز کا ایک ضروری و لازمی بلکہ ابتدائی و امتیازی جزو ہے، یوں کہیئے کہ اُردو حروف کی تحریری اقدار وہی ہیں جو ان کی صوتی اقدار ہیں۔ اس سے ثابت ہُوا کہ اُردو حروف سو فی صدی سائنٹیفک یعنی حکمت اور فطرت پر مبنی ہیں۔

اگر کسی حرف کی وہ آواز جو تحریر میں ظاہر کرنی مقصود ہے، اس حرف کے بولنے ہی میں زبان سے ادا ہوتی ہے تو وہ حرف اپنی آواز کا ایک منہ بولتا اشارہ ہے۔ یہ ایک سائنٹیفک حرف ہے۔ جب یہ حرف دوسرے حرفوں سے مل کر کسی لفظ کا جزو بنتا ہے تو وہ اپنی جگہ پر مطلوبہ آواز کا ایک واضح اشارہ ہوتا ہے، اور مبتدی یہ اشارہ پاکر فوراً وہ آواز زبان سے ادا کر دیتا ہے۔

اس معیار پر اگر انگریزی زبان کے حروف تہجی کو پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا حرفی نظام بڑا ہی غیر صوتی، غیر منطقی اور غیر فطری ہے۔ انگریزی زبان کے ۲۶ حرفوں میں سے صرف دس حروف اپنی صوتی قدر کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور باقی ۱۶ حروف میں سے کچھ تو اپنی فطری آواز کے لئے سرے سے استعمال ہی نہیں ہوتے اور کچھ ایسے ہیں جو کبھی اپنی صوتی قدر کیلئے استعمال ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ اور ان میں سے متعدد حروف ایسے ہیں جو ایک سے زیادہ آوازوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اور بعض حرفی جوڑ، ایک ایسی آواز کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جس کا خود، جوڑ کے حرفوں میں کوئی ادنےٰ سا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے:۔

(الف) پہلے ان حروف کو لیجیے جو اپنی داخلی آواز کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے حرف ہیں E، D، J، K، O، P، Q، T، V اور Z ۔ ان میں سے ہر حرف کی آواز کو بتانے کے لئے لغت میں جو لفظ لکھا گیا ہے اس کی ابتدا خود اُسی حرف سے ہوتی ہے، مثلاً B کو Be اور D کو De وغیرہ وغیرہ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمرے کے ہر حرف کی تحریری آواز وہی ہے جو اس کی داخلی آواز ہے۔ یہ حرف گویا اپنی آواز کا ایک فطری اشارہ ہے۔

(ب) اب وہ حروف لیجیئے جو سرے سے اپنی داخلی آواز کے لئے استعمال نہیں ہوتے ایسے حرف ہیں F، H، L، M، N، R، S، W، X اور Y ۔ ان میں سے کسی حرف کو آپ انگریزی لغت میں دیکھیئے، اس کی آواز کی ابتدا کسی دوسرے حرف سے ہوتی ہے۔ مثلاً F کے لئے ef دیا ہے، اور X کے لئے AKS دیا ہے اور Y کے لئے Wi دیا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان حرفوں کی آوازوں کا ابتدائی اور امتیازی جزو کسی اور حرف سے ادا ہوتا ہے، خود اس حرف سے نہیں۔ اس طرح کے حرفوں میں سب سے دلچسپ مثال W کی ہے۔ اس حرف کی آواز کو انگریزی لغت میں Dublyoo سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان ہجوں میں W ابتدا میں تو کیا بیچ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ صوتی اعتبار سے W اگر کسی آواز کا قائم مقام ہوسکتا ہے تو وہ D کی آواز ہے، یعنی D اور W ایک ہی آواز کے دو متبادل اشارے ہیں، لیکن اسے تحریری نشان ایک ایسی آواز کا مانا جاتا ہے جو V کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔ W کی اس فرضی آواز کا اسکی داخلی آواز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(ج) اس کے بعد وہ حرف لیجئے جو کبھی تو اپنی فطری آواز کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ یہ حرف

ہیں A، C، E، G، I اور U ۔ مثال کے طور پر G پر غور کیجئے۔ اسکی آواز لغت میں je سے دکھائی گئی ہے
گویا G میں یہ صلاحیت نہیں کہ اپنی مطلوبہ آواز کو ظاہر کر سکے۔ اصل میں G اور J ایک ہی آواز کے دو فطری اشارے
ہیں۔ عربی حروف میں اس آواز کا نمائندہ حرف ج ہے۔ لیکن انگریزی زبان میں بالعموم حرف G ایک ایسی آواز کے لئے
استعمال کیا جاتا ہے جس کا اُردو میں تحریری نشان کاف فارسی ہے مثلاً Gun، اور Get میں۔ یہ استعمال بڑا نامعقول ہے۔
اگر آپ بچے کو اُردو قاعدہ پڑھاتے وقت یہ مطالبہ کریں کہ وہ 'جن' کو گن کہے تو بڑی زیادتی سمجھی جائے گی، لیکن انگریزی
حرفی نظام میں یہ زیادتی جائز ہے۔

حرف G بعض الفاظ میں J کی آواز کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ اس کا فطری اور صحیح استعمال ہے۔

(د) اب ایسے حرفی جوڑ لیجیے جو بعض من مانی آوازوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً Ch کا جوڑ اس آواز کے لئے
جو اُردو میں جیم فارسی سے ظاہر کی جاتی ہے جیسے CHAIR اور CHALK میں یا Ph کا استعمال F کی آواز کے لئے مثلاً
PHOTO اور PHRASE میں، اُردو زبان میں بھی بعض مفرد آوازیں دو حرفی جوڑ سے ظاہر کی جاتی ہیں جیسے تھ، ٹھ،
پھ وغیرہ، لیکن ان میں سے ہر دو حرفی جوڑ کی ایک مخصوص آواز ہے اور وہی آواز تحریر میں مقصود ہوتی ہے، مثلاً تھ،
تھالی میں اور پھ، پھول میں، یہ دو حرفی جوڑ اُردو میں دراصل مفرد حروف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انگریزی زبان کے دو حرفی
جوڑ جو مفرد آوازوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں کچھ عجیب سے ہیں۔ ان کی کوئی منفرد آواز نہیں، اور جو آواز تحریر میں مقصود ہوتی
ہے اس کا کوئی اشارہ جوڑ کے حرفوں میں نہیں پایا جاتا۔ مثلاً CH کا کوئی الگ نام نہیں اس کو C اور h الگ الگ کہا
جاتا ہے اور پھر مبتدی کے ذہن میں یہ بٹھانا ہوتا ہے کہ C اور h ایک ساتھ آئیں تو یہ فلاں آواز کا اشارہ ہوگا۔

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ انگریزی زبان میں حروف کی صوتی اقدار کا کیا حشر ہوتا ہے، بھگت کبیر داس
محض رنگی کو نارنگی سن کر رو دیئے تھے، اگر اُن کو انگریزی حروف کی اس دو رنگی کا علم ہو جاتا تو نہ جانے اُن پر کیا گزرتی۔

انگریزی زبان کے حرفی نظام کی ایک اور بڑی خرابی ہے اور وہ یہ کہ اس کے ہر حرف کی (ماسوا O کے) تین مختلف شکلیں
ہیں اور بعض حرفوں کی چار۔ یہ چار شکلیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ چھاپے کا بڑا حرف مثلاً F اور G
۲۔ دستی تحریر کا بڑا حرف مثلاً 𝓕 اور 𝓖
۳۔ چھاپے کا چھوٹا حرف مثلاً f اور g
۴۔ دستی تحریر کا چھوٹا حرف مثلاً 𝒻 اور 𝑔

انگریزی حروف میں صرف O ایک ایسا حرف ہے جو چاروں شکلوں میں گول رہتا ہے، باقی تمام حرفوں کے کم سے کم تین روپ
ایسے ہیں جن میں ان کی صورت شکل یا نوک پلک بدل جاتی ہے۔ اس بے جا طوالت کا نتیجہ یہ ہے کہ بچے کو اسکول میں ابتدا ہی سے
ہر حرف کی تین (اور بعض کی چار) شکلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

ان دونوں خرابیوں پر مستزاد انگریزی لفظوں کا املا یعنی سپیلنگ سسٹم ہے۔ اس کو سسٹم کہنا ہی اصل میں زیادتی ہے۔
کیونکہ سسٹم تو کسی قاعدے اور اصول کا پابند ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں "صوتیت" کی تحریک ایک بڑی پرانی تحریک ہے۔
اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ انگریزی الفاظ کے املا کو غیر ضروری اور بے ڈھنگے حرفوں سے پاک کر کے کسی قاعدے اور اصول کا

پابند بنایا جائے۔ اس تحریک کے بڑے بڑے حامی ہوگزرے ہیں، جن میں سب سے منفرد نام غالباً جارج برنرڈشا کا ہے۔ ان کو تو اس تحریک کی اتنی لگن تھی کہ وہ اپنی جائداد کا ایک معقول حصّہ اس اصلاحی منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ جارج برنرڈشا کا قول ہے کہ انگریز قوم اگر اپنے الفاظ کا املا درست کرلے تو سالانہ لاکھوں پونڈ کی بچت ہوسکتی ہے۔

انگلستان میں تو یہ تحریک اب تک ماہرین تعلیم کی تحریر و تقریر تک ہی محدود ہے، البتہ امریکی انگلش میں املا کی کچھ اصلاحات کی گئی ہیں۔ ان اصلاحات کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بہت بے دلی سے اور اصل بیماری کی تشخیص کے بغیر کی گئی ہیں۔ حرفی نظام کی اصلاح، املا کے نظام کو درست کرنے کی پہلی کڑی ہے۔ اس بنیادی اصلاح کے بغیر "صوتیت" کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی، چاہے اس کے حامی جارج برنرڈشا جیسے منفرد لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ ہر حرف تحریر میں اُسی آواز کے لئے استعمال ہونا چاہیئے جو اس حرف کو بولتے وقت زبان سے ادا ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے اور ماننے کے لئے نہ صوتیات کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور نہ لسانیات پر عبور حاصل کرنے کی۔ یہ ایک سادہ سا فطری اصول ہے اور اس کی خلاف ورزی دُنیا کے جس نظام حروف میں بھی روا رکھی جاتی ہے، وہ ایک غیر فطری اور غیر ترقی یافتہ نظام ہے۔ اور تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کے جو نقصانات ہیں، ان کو اس محفل میں گنوانا تحصیل حاصل بلکہ طول لاطائل ہوگا۔
